تفہیمات

حصہ اوّل

بعض معرکۃ الآرا مسائل اسلامی کی تشریح و توضیح

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)
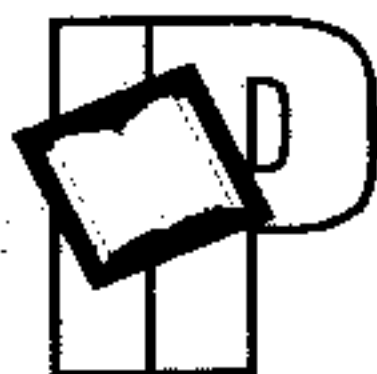
نام کتاب: تفہیمات (حصہ اول)

مصنف: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعت:	ایڈیشن	تعداد
	۱۔ تا ۲۲۔ مئی ۲۰۰۰ء	۲۲۵۰۰
	۲۳۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء	۱۱۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)
فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674

شوروم: منصورہ ملتان روڈ، لاہور۔ فون نمبر: 448022
10- چیمبر جی روڈ، اردو بازار، لاہور فون نمبر: 7248676
10۔ بی شہزاد پلازہ، کالج روڈ بالمقابل نیو اردو بازار، راولپنڈی
www.Islamicpak.com

مطبع: میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت: ۱۵۰/- روپے اعلیٰ ایڈیشن
۱۱۸/- روپے پیپر بیک

عرضِ ناشر

اس سے پہلے اس کتاب کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اب اس کا نیا ایڈیشن حاضرِ خدمت ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس ایڈیشن کو سابقہ ایڈیشنوں سے زیادہ حسین و جمیل اور جاذبِ نظر بنائیں، اس لیے اس مرتبہ ہم اس کو آفسٹ کی خوبصورت اور نفیس کتابت و طباعت پر پیش کر رہے ہیں۔

یُوں تو مولانا سید ابُو الاعلیٰ مودودی صاحب کی جملہ تصانیف و تالیفات اپنا ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں لیکن کچھ کتب توبقین آفرینی اور اثر انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، انہی چند کتب میں سے ایک کتاب یہ بھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام کے چند مہماتِ مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جس سلجھے ہوتے انداز اور پُر زور استدلال کے ساتھ اصل مسئلہ کو واضح کیا ہے اس نے بےشمار اُلجھے ہوتے ذہنوں کو صاف کیا ہے۔ کتنے ہی شک و ریب کے مارے ہوؤں کو دولتِ ایمان و یقین سے مالا مال کیا ہے، اور ان پر اسلام کی حقانیت کا گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ ہر اُس شخص کے لیے جو راہِ حق کا متلاشی ہو اور اس پر پُورے اطمینان و سکون کے ساتھ چلنا چاہتا ہو اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اس سلسلہ مضامین کو اب تک دو جلدوں تفہیمات حصّہ اول اور حصّہ دوم میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اور اب تیسری جلد حصّہ سوم بھی شائع کر دی گئی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین اس مجموعہ کو ہر حیثیت سے پسند فرمائیں گے۔

لاہور — شوال ۱۳۸۶ھ
مطابق = جنوری ۱۹۶۷ء

مینجنگ ڈائریکٹر
اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبع اوّل

اس سے قبل میرے مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیحات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ وہ ان مباحث پر مشتمل تھا جن میں موجودہ مغربی نظریات و عملیات کی الجھنوں سے دماغوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب یہ دوسرا مجموعہ ایک دوسری نوعیت کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے ان مہمّاتِ مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے اس مجموعہ کا نام "تفہیمات" رکھا گیا ہے۔ ان مضامین کی مقدار توقع سے بہت زیادہ نکلی اس لیے مجبوراً انہیں تین حصوں پر تقسیم کر دینا پڑا، ورنہ ابتداءً یہی خیال تھا کہ یہ ایک ہی مجلد میں سما جائیں گے۔

ابوالاعلیٰ

۳۰ محرم ۱۳۵۹ھ - مارچ ۱۹۴۰ء

دیباچۂ طبع ششم

یہ کتاب اس سے پہلے پانچ مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔ اب یہ چھٹی مرتبہ پریس میں جا رہی ہے۔ اس موقع پر میں نے نظر ثانی کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ بعض جزوی ترمیمات اور کچھ ضروری اضافے کیے ہیں، بلکہ ایک نیا مضمون بھی اس میں بڑھا دیا ہے جس کا عنوان ہے ـــــــــ "رسول کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی"۔

ابوالاعلیٰ

لاہور۔ ۶ نومبر ۱۹۶۱ء (۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ)

عقل کا فیصلہ

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں۔ ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں۔ شام کے وقت دفعتہً ہزاروں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے زمانہ میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت واستعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کے روشن یا متحرک ہونے کی علت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قمقموں کا تعلق جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان تاروں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجینئر نگرانی کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجینئر بجلی بنانے کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

فرض کیجیے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچتی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا

کوئی انجینئر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے، کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے ؟ کیا اس وقت بھی ہم اسی طرح ان مظاہر کی علتوں میں اختلاف نہ کرتے ؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغوں کا اس رازِ سربستہ کی جستجو میں لگ جانا، اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب ذرا اسی مفروضہ پر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیے۔ مان لیجیے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے درحقیقت عالمِ واقعہ میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں، لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کونسی قوت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ ان مظاہر و آثار کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں۔ ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن یا متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس عالمِ مادہ سے ماوراء چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا محرک ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی، ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آتے اس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں، مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعہ

علم نہیں ہے۔

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو، میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بلشمار اشخاص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجینئر کے تابع ہیں، اور وہی انجینئر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ سب کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں، مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مصیبتوں کے باوجود اپنے دعویٰ پر قائم رہتا ہے۔ کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کرتا۔ کسی مصیبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی۔ اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہٖ یہی قول اسی دعویٰ کے ساتھ پیش کرتا ہے، پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشرووں نے کہی تھی۔ اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعویٰ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ہر طریقہ سے ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول

سے باز آجائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔ اس عزم و استقلامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم اور حرام خور نہیں ہے، ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں، اور حسن خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں۔ پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس، اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار بڑے بڑے علماء و عقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

ایک طرف وہ مختلف الخیال مکذبین ہیں، اور دوسری طرف یہ متحد الخیال مدعی۔ دونوں کا معاملہ عقلِ سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے، پھر فریقین کی پوزیشن کو سمجھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابلِ ترجیح ہے۔

جج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امرِ واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں۔ انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے۔ مگر اغلبیت سے بڑھ کر بھی وہ کوئی حکم نہیں لگا سکتا، کیونکہ مسل پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امرِ واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے، لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریے مختلف ہیں۔ اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲- وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے

۳- اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں تبدیلی رائے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریہ کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا ہے، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریہ کی تردید کر دی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔

۴- مدعیوں کی تکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا، انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معاینہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی نہ کبھی انجنیئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

مدعیوں کی پوزیشن یہ ہے۔

۱- وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعوی کے جتنے بنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲- ان سب کا متفقہ دعوی یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

۳- ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجنیئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں۔ اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں۔ ظن و تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

۴- ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کیا ہو۔ ایک ہی بات ہے جو ان میں کا ہر شخص دعویٰ کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

۵- ان کی سیرتیں انتہا درجہ کی پاکیزہ ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں، وہ خاص اسی معاملہ میں بالاتفاق کیوں جھوٹ بولیں۔

۶- اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہائی درجہ کے مصائب برداشت کیے ہیں، جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کیے گئے، مارے اور پیٹے گئے، جلاوطن کیے گئے۔ بعض قتل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا، اور چند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی۔ لہٰذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ ان کا ایسے حالات میں اپنے دعویٰ پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہا درجہ کا یقین تھا، ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

۷- ان کے متعلق مجنون یا فاتر العقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو اسی خاص معاملہ میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو ان کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو۔ جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو۔ جس کی خاطر وہ سالہا سال دنیا سے لڑتے رہے ہوں۔ جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا (جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے مکذبین کو بھی اعتراف ہے) اصل الاصول ہو۔

۸- انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات

کرا سکتے ہیں یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ خود ان تمام امور کو "غیب" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ چند مظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اوّلاً ان میں سے کسی میں استحالۂ عقلی نہیں ہے یعنی قوانینِ عقلی کے لحاظ سے کسی نظریہ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ نہ فریقِ اوّل میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے۔ اور نہ فریقِ ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فریقِ ثانی کا نظریہ قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے۔

اوّلاً کسی دوسرے نظریہ کی تائید اتنے کثیر التعداد عاقل، پاک سیرت، صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر اتنی قوت اور اتنے یقین و ایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

ثانیاً، ایسے پاکیزہ کیرکٹر اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعویٰ پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعۂ علم ہے اور ان سب نے اس ذریعہ سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کر لیا ہے، ہم کو اس دعویٰ کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالۂ عقلی بھی نہیں ہے اور نہ یہ بات قوانینِ عقلی کی بنا پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے

انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثانیاً، خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے بھی اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی کا نظریہ صحیح ہو۔ اس لیے کہ قمقمے، پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ ان کی روشنی وحرکت ان کے مادۂ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے، کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے۔ نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیر اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بھی بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہٰذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فریق اول کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل وقیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سر رشتہ کسی ایسے حکیم و توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا مشککین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حاکم عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا کیونکہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کی سمجھ میں بھی آجائے۔ اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے اگر ہم سے چند معتبر آدمی آکر کہیں کہ ہم نے زمین مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اڑتے دیکھا ہے، اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آتے ہیں، تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر ثابت ہو گیا کہ وہ نہ جھوٹے ہیں نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اس روایت سے وابستہ ہے، اور اگر ہم نے دیکھا کہ اس کو بلا اختلاف بہت سے

سمجھے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اڑنا اور کسی مادی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے۔ مگر تصدیق و یقین کی کیفیت جس کا نام "ایمان" ہے اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے وجدان کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو تکذیب، شک اور تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کر دے اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی رُو سے بیان کیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۲ھ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء)

کوتہ نظری

"ایک دو سال کا خوبصورت بچہ بخار اور دردِ قولنج میں مبتلا تھا۔ اس کی تکلیف اور اضطراب کو سخت سے سخت دل انسان بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رفعِ تکلیف کے لیے کبھی وہ اپنے ماں باپ کی طرف دیکھتا اور کبھی ڈاکٹر کے سامنے کڑوی کسیلی دوا کے لیے منہ کھولتا۔ اسی تکلیف میں ایک دن رات ڈکر ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ سے رخصت ہوگیا۔ اس کو کرب اور نزع کی حالت میں دیکھ کر دل میں سوال پیدا ہوا کہ رب رحیم و کریم جو رأفت اور شفقت کا منبع ہے، چھوٹے اور معصوم بچوں پر مصائب اور تکالیف کیوں وارد کرتا ہے؟ حالانکہ وہ خود کہتا ہے کہ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ"

یہ ایک کرم فرما کے خط کا اقتباس ہے، جو سوال ان کے دل میں پیدا ہوا ہے، قریب قریب وہی سوال مختلف صورتوں میں ہر ایسے موقعہ پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے جب وہ موت اور بیماری اور نزولِ آفات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وبا میں ہزاروں آدمیوں کا انتہائی بے کسی کی موت مرنا، زلزلہ میں ہزارہا گھروں کا تباہ ہونا، سیلاب میں لوگوں کا بے اندازہ مصائب و شدائد سے دوچار ہونا، مختلف قسم کی موذی بیماریوں میں لوگوں کا سخت کرب و اذیت کے ساتھ تڑپنا، غرض مصیبت اور درد و الم کا ہر نظارہ انسان کے دل میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خدا جو رؤف و رحیم ہے، اور وہ خدا جو اپنی ربوبیت اور اپنے فضل و کرم پر ناز رکھتا ہے، اور وہ خدا جو خود کہتا ہے کہ میں ظالم نہیں ہوں، آخر وہ اپنے بندوں پر یہ سختیاں کیوں نازل کرتا ہے؟ خود اپنی ہی بنائی ہوئی مخلوق کو، جسے خود اسی نے درد و الم کا احساس

دیا ہے، اس طرح مصائب و آلام میں کس لیے مبتلا کرتا ہے؟ بعض لوگ تو اس مسئلہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ قہرِ خداوندی کے ان آثار کو حق تعالیٰ کی صفتِ رأفت و رحمت کے منافی سمجھنے لگتے ہیں اور انہیں گمان ہونے لگتا ہے کہ معاذ اللہ خدا ایک اندھی طاقت (Blind Force) ہے جس کو کسی کی راحت و اذیت کا کچھ علم نہیں۔ وہ یونہی بلا کسی علم کے بنانے اور توڑنے پھوڑنے میں مشغول ہے۔

جن لوگوں نے کائنات کے نظم اور ملکوتِ ارض و سما پر غور کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے۔ گویا پوری کائنات ایک جسدِ واحد ہے اور اس کے اجزاء میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزاء میں ہوتا ہے پھر جس طرح کائنات کے اجزاء میں ربط اور تسلسل ہے اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط و تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے اور کلی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوندِ عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ جس شخص کی نظر پوری کائنات پر نہیں بلکہ اس کے ایک نہایت ہی حقیر حصے پر ہے جس کو کل کے ساتھ اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک ذرہ کو آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے، اور جس شخص کے سامنے واقعاتِ عالم کا پورا سلسلہ نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ کی بے حد و حساب کڑیوں میں سے محض ایک یا دو یا چند کڑیاں ہیں اور جو شخص کائنات کے اس حقیر حصے اور واقعات کی ان چند کڑیوں میں بھی صرف ظاہری سطح کو دیکھ رہا ہے، باطنی حقائق تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں ہے، کیا ایسا شخص کسی جزئی واقعے کو دیکھ کر اس کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا اہل ہو سکتا ہے؟ اور اگر وہ کوئی رائے قائم کرنے کی جرأت کرے تو کیا اس کی رائے صحیح ہو سکتی ہے؟

کائنات کا نظام اور خدا کی خدائی تو خیر اس قدر وسیع ہے کہ اس کے تصور ہی سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے۔ آپ ایک چھوٹے پیمانہ پر کسی انسانی سلطنت ہی کو لے لیجئے۔ جو شخص کرسی وزارت یا تختِ شاہی پر بیٹھا ہوا ایک بڑی سلطنت کا انتظام کر رہا ہے وہ بھی اگرچہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے، اور فطری استعداد کے لحاظ سے ہمارے اور اس کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، نیز اس کے جتنے معاملات ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو سمجھنے اور انجام دینے کی قوت و استعداد ہم میں نہ ہو، لیکن محض یہ فرق کہ وہ کرسی حکومت پر سے تمام سلطنت کے نظم و نسق کو دیکھ رہا ہے اور ہم ایک گوشے میں اس نظم سے یک گونہ بے تعلق بیٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اور اس کے درمیان اتنا عظیم تفاوت پیدا کر دیتا ہے کہ ہم بالفعل اس کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے اور اگر کوئی جزئی واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی غایت و مصلحت کیا ہے۔ پھر جب انسان اور انسان کے درمیان محض پوزیشن کے فرق سے اتنا تفاوت واقع ہو جاتا ہے، تو غور کیجیے کہ انسان اور خدا کے درمیان کتنا تفاوت ہوگا، دراں حالیکہ یہاں پوزیشن کا نہیں حقیقت کا فرق عظیم ہے۔ وہ تمام عالم پر سلطنت کر رہا ہے اور ہم اس کی سلطنت کے ایک نہایت ہی حقیر گوشے میں بیٹھے ہیں۔ اس کی دانش و بینش سارے عالم پر حاوی ہے، اور ہماری دانش و بینش کی رسائی خود اپنے جسم کی باطنی حقیقتوں تک بھی نہیں۔ اس کی طاقتیں بے پایاں ہیں اور ہمارے پاس ان میں سے کوئی طاقت بھی نہیں۔ اگر اس تفاوتِ عظیم کے باوجود اس کے کاموں پر ہم تنقید کریں اور ان کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کریں تو کیا یہ تنقید اس تنقید سے کروڑ درجہ زیادہ جاہلانہ نہ ہوگی جو ایک گنوار اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر سلطنت کے معاملات پر کرتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح ایک اور مثال لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک باغبان ہیں۔ جو باغ آپ نے بڑی محنت سے لگایا ہے اور جس کی ترتیب و تزئین میں آپ نے اپنی پوری مہارت صرف کر دی ہے، اس کے درختوں اور پودوں اور بیلوں سے یقیناً آپ کو محبت ہوگی۔

آپ ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان کو بے ضرورت کاٹنا، چھانٹنا یا اکھاڑ پھینکنا آپ کبھی پسند نہ کریں گے اور اگر کوئی غیر آکر ان پر تیشہ چلاتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوگا پھر آپ کو علمی طریق سے یہ بھی معلوم ہے کہ نباتات میں راحت اور اذیت، رنج اور خوشی کا احساس ہوتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اگر درختوں اور پودوں پر قینچی یا کلہاڑی چلائی جائے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اپنے اعضاء کے کٹنے اور اپنے بچوں (پھلوں) سے جُدا ہو جانے کا انہیں بھی رنج ہوتا ہے۔ لیکن اس محبت اور علم کے باوجود آپ ضرورت اور باغ کی کلی مصلحت کا لحاظ کرکے اپنے باغ میں تراش خراش کرتے ہیں، پتیوں اور شاخوں کو کاٹتے چھانٹتے ہیں۔ پودوں کو تراش کر قلمیں لگاتے ہیں، سبزی کو کاٹ کر ہموار کرتے ہیں، کچے اور پکے پھل حسب ضرورت اتار لیتے ہیں، کھلے اور بن کھلے پھول توڑ لیتے ہیں، غیر ضروری پودوں کو اکھاڑتے ہیں، سوکھے ہوئے درختوں کو کاٹ پھینکتے ہیں۔

اگر درختوں اور پودوں اور بیل بوٹوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ سراسر ظلم ہے۔ اگر ان میں گویائی ہوتی تو وہ کہتے کہ یہ باغبان کیسا بے درد اور ظالم ہے۔ ہمارے اعضاء کی قطع و برید کرتا ہے۔ ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کو جنہوں نے ابھی زندگی کی ایک بہار بھی نہیں دیکھی تھی، اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ننھی ننھی کلیوں کو توڑے جاتا ہے۔ بوڑھوں کو دیکھتا ہے نہ بچوں اور جوانوں کو۔ بس کاٹنے سے کام ہے۔ اور کبھی تو ظالم ایک مشین لے کر اس طرح پھراتا ہے کہ ہماری برادری کے ہزاروں افراد کا بیک وقت صفایا کر ڈالتا ہے۔ کیا ایسا شخص شفیق و مہربان ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے دل میں محبت اور رحمت و رأفت کے پاکیزہ جذبات ہو سکتے ہیں؟ ہم تو اس کاٹ چھانٹ اور اکھیڑ پچھاڑ میں کوئی مصلحت بھی نہیں دیکھتے۔ ہمیں تو یہ ایک اندھا، بے حس، سنگدل وجود معلوم ہوتا ہے جو بغیر کسی علم و حکمت اور غرض و غایت کے کبھی ہم کو پانی دیتا ہے اور کبھی ہم پر قینچی چلاتا ہے، کبھی ہم کو کھاد ہم پہنچاتا ہے اور کبھی ہمیں کلہاڑی سے کاٹ پھینکتا ہے، کبھی دوسروں سے ہماری حفاظت کرتا ہے اور کبھی

ہمیں خود اپنے ہاتھوں اکھاڑ ڈالتا ہے، کبھی بیماریوں میں ہمارا مداوا کرتا ہے اور کبھی خود ایک مشین سے کر ہمارا قتلِ عام کر دیتا ہے۔

اگر درخت آپ کے انتظام پر نکتہ چینی کریں تو آپ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ ان کی نظر محدود ہے، وہ صرف اپنے وجود اور اپنے قریبی متعلقات کو دیکھتے ہیں، مگر میری نظر وسیع ہے، میں باغ کی کلی مصلحت کو دیکھتا ہوں۔ وہ صرف اپنے پھل پھول، پتوں اور شاخوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہت بڑھے تو آس پاس کے پودوں اور درختوں سے محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کر لیے۔ مگر میرے پیشِ نظر پورے باغ کی بہتری ہے اور میں مجموعی طور پر سب کی اصلاحِ حال کے لیے عمل کر رہا ہوں۔ ہر نادان درخت اور بیوقوف پودا یہ سمجھ رہا ہے کہ سارا باغ اسی کی ذات اور اس کے دوستوں اور عزیزوں کے لیے لگایا گیا ہے اور اس باغ میں اسی کا مفاد قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن میں نے دراصل ان کو باغ کے لیے لگایا ہے۔ ان کی ذات سے مجھ کو جو کچھ دلچسپی ہے اپنے باغ کی خاطر ہے۔ جس حد تک باغ کی بہتری کے لیے مناسب اور ضروری ہے میں ہر درخت اور ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کی حفاظت اور پرورش کرتا ہوں۔ مگر جب باغ کی مصلحت متقاضی ہوتی ہے تو میں اس میں کاٹ چھانٹ، تراش خراش، اور اکھاڑ پچھاڑ سب کچھ کرتا ہوں، کیونکہ باغ کا مجموعی مفاد میرے نزدیک ایک ایک پودے اور ایک ایک درخت اور بیل بوٹے کے شخصی مفاد سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں دشمنی کی راہ سے ان پر ہاتھ صاف کرتا ہوں، لیکن یہ محض ان کی نادانی اور تنگ خیالی ہے۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ باغ کے معاملات اور اس کے مصالح کو سمجھ سکیں۔ ان کے پاس صرف اپنی تکلیف کا احساس اور اپنی راحت اور زندگی کی خواہش ہے۔ جب ان کی خواہشات اور احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو یہ بے صبر ہو جاتے ہیں اور مجھ پر ظالم ہونے کا شبہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت ان کے گمان کے تابع نہیں ہے۔ ان کے سمجھنے سے میں درحقیقت ظالم نہیں ہو سکتا اور ان کی خاطر میں اپنے باغ کے انتظام کو بھی نہیں بدل سکتا۔

اس چھوٹی سی مثال کو جب آپ پھیلا کر دیکھیں گے تو آپ کو اپنے بہت سے

گلوں شکووں کا جواب مل جائے گا۔

کائنات کے نظم پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس زبردست کارخانے کو بنانے اور چلانے والا یقیناً ایک ایسا وجود ہونا چاہیے جو کمال درجہ حکیم و دانا اور علیم و خبیر ہو۔ جس نے ہم میں خواہشات پیدا کی ہیں ممکن نہیں کہ وہ خواہشات سے بے خبر ہو۔ جس نے ہم میں احساسات پیدا کیے ہیں، ممکن نہیں کہ وہ ہمارے احساسات سے ناواقف ہو۔ جس نے بچے کو پیدا کیا ہے اور بچے کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کی ہے، وہ ضرور جانتا ہے کہ بیماری اور موت سے بچے کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اور ماں باپ کے دل کو کیسا صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن جب یہ سب کچھ جاننے اور ہم سے زیادہ جاننے کے باوجود اس نے بچے اور ماں باپ کو یہ اذیت دینا گوارا کیا، جب ہمارے احساسات سے باخبر ہونے کے باوجود اس نے ان کو پامال کرنا پسند کیا، جب ہماری خواہشات کا علم رکھنے کے باوجود اس نے ان کو پورا کرنے سے انکار کیا، تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ایسا کرنا یقیناً ناگزیر ہی ہوگا، اور اس علیم و خبیر کے علم میں اس سے بہتر کوئی صورت نہ ہوگی، ورنہ وہ اس بہتر صورت ہی کو اختیار کرتا، کیونکہ وہ حکیم ہے، اور حکیم کے حق میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بہتر تدبیر ممکن ہو تو وہ اسے چھوڑ کر بدتر تدبیر اختیار کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کی حکمتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور نہیں آسکتیں، اس لیے کہ ہماری نظر پورے نظامِ عالم پر نہیں ہے، اور ہم نہیں جان سکتے کہ نظامِ عالم کے مصالح کیا ہیں، اور ان کے لیے کس وقت کونسی تدبیر ضروری ہے۔ لیکن اگر اجمالی طور پر ہم اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور اس کے علمِ کامل پر صحیح اعتقاد رکھتے ہوں تو ہر آفت کے نزول پر ہم سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی کی متقاضی ہوگی اور اس کے علم میں ایسا ہی مناسب ہوگا اور ہمارے لیے بجز تسلیم و رضا کے اور کوئی چارہ نہیں۔

پھر ایک دوسری بات جو غور و فکر سے ہم کو معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ جو ہستی کائنات کے اس نظام کو چلا رہی ہے، اس کے پیشِ نظر خیرِ کلی ہے۔ اس کے کاموں میں جو امور ہم کو شر اور فساد نظر آتے ہیں وہ دراصل اعتباری شرور ہیں، یعنی افراد و اشخاص

کی طرف قیاس کرتے ہوئے ان کو شرور کہا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ سب خیر کلی ہی کے لیے ہیں، اور ان کا وقوع دراصل خیر کلی کے حصول کا ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔ اگر یہ شرور ناگزیر نہ ہوتے اور ان کے بغیر خیر کلی کا حصول ممکن ہوتا تو خدائے حکیم و علیم ان کو اختیار نہ کرتا اور کوئی دوسرا انتظام تجویز کرتا۔ خود ہم اپنی کمزوریوں اور نارسائیوں کے باوجود جب گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو ہماری عقل حکم لگاتی ہے کہ اس کائنات کے لیے اس سے بہتر نظام ممکن نہیں ہے۔ کوئی دوسرا انتظام ایسا تجویز نہیں کیا جا سکتا جو ان جزوی و اعتباری شرور سے یکسر خالی ہو۔ بلکہ اگر یہ شرور واقع نہ ہوں تو حقیقت میں ان کا عدم ایک بڑا شر ہوگا کیونکہ وہ ایک خیر جزئی کی خاطر بہت سے خیرات کے حصول کو روک دیگا۔ مثال کے طور پر موت ہی کو لے لیجیے جس پر انسان سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ ایک شخص کی موت کتنے اشخاص کے لیے زندگی کا راستہ صاف کرتی ہے۔ اگر ایک شخص کو زندگی کا پروانہ دے دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت سے اشخاص پر زندگی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کی دائمی زندگی اگر خیر ہے تو صرف اس کی ذات کے لیے ہے لیکن خیر کلی کے لیے وہ شر ہوگی۔ بخلاف اس کے اس خاص شخص کی موت صرف اس کے لیے ایک جزئی شر ہے۔ لیکن یہی شر بہت سے جزئی خیرات کے حصول کا بھی ذریعہ ہے۔ رہا خیر کلی تو اس شخص کے مر جانے سے اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا کیونکہ نظام عالم میں اس کی موت سے کوئی خلل نہیں آتا۔

اسی مثال پر قیاس کر کے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اشخاص پر جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں وہ سب ایک اعتبار سے شر ہیں اور دوسرے اعتبار سے وسیلۂ خیر، اور خیر کلی کے لیے ان کا وقوع ناگزیر ہے۔ بسا اوقات ہم خود غور کر کے ان کے وسیلۂ خیر ہونے کی جہت کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ سے ہم پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے شر سمجھا تھا وہ حقیقت میں سبب خیر تھی۔ لیکن اگر کبھی کسی شر کی جہت خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، تب بھی ہم کو مجملاً اس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے، اور ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اس

کی قضا کے آگے سر جھکا دیں خواہ اس کے فعل کی علم ہماری سمجھ میں آسکے یا نہ آسکے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۴ھ۔ جون ۱۹۳۵ء)

ہدایت و ضلالت کا راز

کچھ مدت ہوئی کہ اسلام کے متعلق مسٹر جارج برنارڈ شا کے خیالات جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ حال میں جب انہوں نے مشرق کا سفر کیا تو اس کے دوران میں سنگاپور کے عربی اخبار "الہدیٰ" کا نامہ نگار ان سے ملا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے پھر ایک مرتبہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آزادی اور دستوری و ذہنی حریت کا دین ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے مسیحیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی مذہب کا نظامِ اجتماعی اتنا مکمل نہیں ہے جتنا اسلام کا نظام ہے۔ دنیائے اسلام کا تنزل اسلام سے دور ہٹ جانے کی بدولت ہے۔ مسلمان جب صرف اسلام کی بنیادوں پر جد و جہد کریں گے تو عالمِ اسلامی کا خواب، بیداری سے بدل جائے گا۔

ان خیالات کے سننے کے بعد نامہ نگار نے سوال کیا کہ جب آپ اسلام کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری طور پر ان بیانات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک سلیم الطبع آدمی کے لیے کسی چیز کے اعترافِ قبح اور اس کو ترک کر دینے اور کسی چیز کے اعترافِ حسن اور اس کو قبول و تسلیم کر لینے میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسٹر شا نے جو کچھ جواب دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبولِ اسلام کے لیے تیار نہیں ہیں، اور ایسا نہ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے، بلکہ صرف اس چیز کی کمی ہے جس کو شرحِ صدر کہتے ہیں۔

ایک مسٹر شا ہی پر موقوف نہیں ہے بہت سے اہلِ فکر و نظر پہلے بھی گزر چکے ہیں

اوراب بھی موجود ہیں جنہوں نے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس کے دنیوی یا دینی یا دونوں حیثیتوں سے مفید ہونے کا اقرار کیا، اس کی تہذیب، اس کے نظامِ اجتماعی، اس کی علمی صداقت اور اس کی عملی قوت کی برتری تسلیم کی، مگر جب ایمان لانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کا سوال سامنے آیا تو کسی چیز نے ان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا، اور وہ اسلام کی سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔

برعکس اس کے بہت سے آدمی ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی مخالفت اور اس کی دشمنی میں صرف کر دیا، لیکن اسی مخالفت کے سلسلہ میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقتِ اسلام ان پر منکشف ہو گئی اور اس انکشاف کے بعد کوئی چیز ان کو ایمان لانے سے نہ روک سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا راز بھی ایک عجیب راز ہے۔ ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے، مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، کوئی توجہ کرتا ہے لیکن وہ اس کے پردۂ گوش پر سے اچٹ کر چلی جاتی ہے، کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر مانتا نہیں، کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا، اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔

ہمارا شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ بہت سے اس کو معمولی واقعہ سمجھ کر یونہی بس دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے مگر وہ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اللہ کے بندے ایسے نکلتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں، اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ ایک مجرم کو پابہ زنجیر جاتے ہوئے بہت سے آدمی دیکھتے ہیں کوئی اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا، کوئی اس پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے، کوئی اس پر ترس کھاتا ہے، کوئی اس کی ہنسی اڑاتا ہے، کوئی اس کے انجام پر خوش ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے

کہ جیسا کیا ویسا بھرا، اور کوئی اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور جرم سے بچنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ تو مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں، جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے تاثر اور اس پر ایک ہی چیز کے اثر کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہی ایک بات ہے جس کو ایک شخص ہزاروں مرتبہ سنتا ہے اور نہیں مانتا، مگر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ یکایک اس کے دل کا بند کھل جاتا ہے، جو بات کان کے پردے میں اٹک کر رہ جاتی تھی وہ سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہے، اور وہ خود حیران ہوتا ہے کہ یہی بات میں پہلے بھی بارہا سن چکا ہوں، پھر آج یہ کیا ماجرا ہو گیا کہ یہ خود بخود دل میں اتری چلی جا رہی ہے؟ ایک ہی شخص کو بارہا آفت رسیدہ آدمیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا۔ لیکن ایک موقع پر کسی شخص کی مصیبت دیکھ کر دفعتہً اس کا دل بھر آتا ہے، قساوت کا پردہ چاک چاک ہو جاتا ہے اور وہ سب سے زیادہ ہمدرد، رحیم اور نرم دل بن جاتا ہے۔ ایک شخص کو اپنی عمر میں بے شمار عبرتناک مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے کبھی وہ ان کو تماشا سمجھ کر دیکھتا ہے، کبھی ایک حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتا ہے اور کبھی ایک معمولی نظر سے اس پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دل پر ایک مستقل نقش بیٹھ جاتا ہے۔

یہی حال ہدایت و ضلالت کا بھی ہے۔ وہی ایک قرآن تھا۔ وہی ایک اس کی تعلیم تھی۔ وہی ایک اس کو سنانے والی زبان تھی۔ ابو جہل اور ابو لہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی وہ ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰؓ، ابوبکرؓ، اور علیؓ بن ابی طالب نے سنا اور پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شک کا شائبہ بھی گزرتا۔ عمر ابن الخطاب نے بیسیوں مرتبہ اس کو سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہ کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف اور دشمن ہوتے چلے گئے، لیکن ایک مرتبہ انہی کانوں نے اس چیز کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جتنی مضبوط دیواریں چنی ہوئی تھیں، یکایک منہدم ہو گئیں اور اس چیز نے ان کے دل میں ایسا اثر کیا کہ ان کی زندگی

کی بالکل کایا پلٹ گئی۔

ہر چند نفسی نقطۂ نظر سے اس اختلافِ کیفیت اور اختلافِ اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جا سکتی ہیں اور وہ سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مدت تک حجاب بنی رہتی ہے اور ایک نفسیاتی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے، کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں، کہیں کسی بات کے لیے حجاب بنتی ہے اور کسی بات کے لیے نہیں بنتی، وہ بالکل انسان کے ارادہ و اختیار کے تابع نہیں ہے، بلکہ فطری و جبلّی طور پر خود بخود انسان میں پیدا ہوتی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (الانعام ۱۲۵)	اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا اور ایسا بھینچتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا چلا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ ہے جس سے ایمان نہ لانے والوں پر اللہ کی طرف سے ناپاکی مسلط کی جاتی ہے۔

ایک اور موقع پر اس کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (النحل: ۹۳)	اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

پھر اس ہدایت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ:۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (الرعد ۲۷)	ان سے کہو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو

دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے

اور ضلالت کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ :۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا	جب تم نے قرآن پڑھا تو ہم نے تمہارے اور
بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	آخرت کا یقین نہ رکھنے والوں کے درمیان
بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّ جَعَلْنَا	ایک گاڑھا پردہ ڈال دیا اور ان کے دلوں
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ	پر غلاف چڑھا دیئے کہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۔ (بنی اسرائیل، ۴۵، ۴۶)	ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی۔

ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات سن کر اسے قبول کر لینے کے لیے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو آخرکار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے، خدائی ہدایت اور اس کے پیدا کرنے کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کو اللہ کی طرف سے مسلّط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے اور "شرح صدر" کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس "ہدایت وضلالت" اور "شرح صدر" و "ضیق صدر" کے پیدا ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہے اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ مجھے کبھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے، اس کو لاکھ کوئی شخص کلمۂ حق سنائے اور وعظ و تلقین کرے، کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی اور وہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتا۔

یہاں پھر وہ باتیں مل گئی ہیں جن کو الگ الگ سمجھ لینے سے قرآن مجید کے وہ مقامات بآسانی حل ہو جاتے ہیں جن میں یہ مضمون مختلف پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک طرف ہدایت و شرح صدر اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ انسان

خدا کی طرف رجوع اور توجہ کرے۔ اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول و جوابدہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا۔

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو یوں سمجھو کہ انسان کی فطرت میں خدا نے ایک ایسی قوت رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل کے امتیاز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور جس کی طرف ارشادِ خداوندی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی ہے، غلطی اور کج روی کی طرف مائل کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہنچانے والی ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو۔ اکتسابِ علم اور اس کے مختلف مدارج، تربیت اور اس کی مختلف کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال، یہ وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے کسی ایک میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنے اختیارِ تمیزی، اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتسابِ علم سے صحیح یا غلط کام لینا، اور اپنی قوتِ فیصلہ کو بجا یا بے جا استعمال کرنا، یہ وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادے کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت و ضلالت کی متضاد قوتوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہِ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر رجھاتی جاتی ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہو کر اور خود اپنی

اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کر کے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہوتا ہے اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل و بصیرت، دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعۃً تیز ہو کر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے، کبھی ادھر کھنچتا ہے کبھی اُدھر، قوتِ فیصلہ اتنی قوی نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف کا ہو جائے۔ بعض بدقسمت اسی تذبذب کے عالم میں دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے، اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایتِ الٰہی کا اشارہ پا لیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت، صحیح القلب، اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل، اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیاتِ الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا۔ ضلالت کی کج راہیوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر جونہی کہ وہ حق کی طرف رجوع کرتے اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں، حق ان کے استقبال کو آتا ہے، ہدایت کا نور ان کے سامنے چمکنے لگتا ہے اور حق کو حق سمجھ لینے اور باطل کو باطل جان لینے کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو راہِ راست سے پھیرنے اور گمراہی کی طرف لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں قابلِ بیان ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو ذہن نشین کر لیں۔ عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت

دیتے ہیں گویا ان کا اسلام کو اچھا سمجھنا اسلام کے لیے کوئی سرٹیفکیٹ ہے۔ لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اسلام کی صداقت وحقانیت اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے۔ جس طرح آفتاب کا روشن ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کو روشن کہے اور جس طرح آگ کا گرم ہونا اور پانی کا سیال ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کی گرمی اور اس کے سیلان کو تسلیم کرے، اسی طرح اسلام کا برحق ہونا اس کا حاجتمند نہیں کہ کوئی اس کے برحق ہونے کو مان لے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کی تحسین اور مدح تو کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی جن کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے اور جو خود اپنے اعراض وانکار سے اپنی مدح وتحسین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اگر حقیقت میں وہ اسلام کی خوبی کے معترف ہوتے تو اس پر ایمان لے آتے لیکن جب انہوں نے زبانی اعتراف کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا تو اہلِ عقل کی نگاہ میں ان کی حیثیت بالکل اس شخص کی سی ہے جو طبیب کی صداقت کو تسلیم کرے، اس کے تجویز کردہ نسخہ کی صحت کا اعتراف کرے مگر اپنی بیماری کا علاج کسی عطائی طبیب سے کرائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ کسی بڑے سے بڑے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کے لیے قابلِ فخر نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک ہی فخر کافی ہے۔ اور وہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: ۱۹) اور رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ: ۳) کا فخر ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۵۲ھ۔ مئی ۱۹۳۳ء)

اسلام ایک علمی و عقلی مذہب

انسان نے خود اپنی تلاش و جستجو سے جتنے طریقے یا مذاہب ایجاد کیے ہیں ان سب کو دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ان مذاہب کی ہے جو تخیل کی بلند پروازیوں سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی اعجوبہ پسندی کو اپیل کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان طریقوں کی ہے جو خواہشات اور اہوائے نفس سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے حواس کو اپیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں قسم کے طریقوں میں عقل اور استعدادِ علمی سے کام لیا گیا ہے لیکن نہ عقل ان کی محرک ہے نہ وہ عقل کو اپیل کرتے ہیں، نہ عقلی نتائج کا حصول ان کا منتہائے مقصود ہے۔ عقل اور استعداد علمی ان کے پاس محض ایک آلہ کے طور پر ہے جس سے وہ ادنیٰ درجہ کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کام لیتے ہیں۔ ایک عالمِ مادی سے قطع نظر کرکے عالمِ باطنی کی طرف توجہ کرتا ہے اور علم و عقل کی تمام قوتوں کو ایسے ذرائع دریافت کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جن سے وہ نفس کی باطنی قوتوں کو مادی قیود سے آزاد کرکے مکاشفات اور لذاتِ روحانی اور خوارقِ عادت کے حصول پر قادر ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا عالمِ باطنی سے قطع نظر کرکے اپنی تمام توجہ عالمِ مادی کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہاں وہ علم و عقل کی ساری طاقتوں کو ان طریقوں کے دریافت کرنے میں استعمال کرتا ہے جن سے وہ مادی اسباب و وسائل سے زیادہ سے زیادہ انتفاع کرکے اپنے جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش اور اپنے حواس کے لیے زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کرسکے۔ غرض علم و عقل ان طریقوں کے خادم ضرور ہیں، مگر بجائے خود ان کی بنا جہل اور نادانی پر ہے۔

ان کے مقابلہ میں ایک مذہب وہ ہے جو خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے۔

یہ مذہب خالص علم سے پیدا ہوا ہے، سراسر عقل کو اپیل کرتا ہے، اور اس کا اصل مقصد انسان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا ہے تاکہ وہ کائنات میں اپنی اصلی حیثیت سے واقف ہو۔ موجودات کے ساتھ اپنے تعلق کی حقیقی نوعیت کو سمجھے، اور علم و فہم کی روشنی میں اپنی تمام ظاہری و باطنی قوتوں اور مادی و روحانی وسائل کو اس مقصد تک پہنچنے میں استعمال کرے جو در حقیقت انسانی زندگی کا اصلی مقصد ہے ——— یعنی اس دنیا میں اس خدمت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر اس کے سپرد کی ہے، اور آخرت میں اپنے مالک کی خوشنودی سے سرفراز ہونا جو ادائے فرض کا لازمی نتیجہ ہے۔

یہ مذہب انسان کی کسی قوت کو بیکار نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کو صرف کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ وہ انسان کی کسی خواہش کو پامال نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کے لیے ایک جائز اور معقول حد مقرر کر دیتا ہے۔ وہ تخیل کو بلند پروازی سے روکتا نہیں بلکہ اس کی پرواز کے لیے ایک بہتر فضا اور ایک صحیح رُخ متعین کرتا ہے۔ وہ انسان کی عملی قوتوں کو مادی اسباب و وسائل کے اکتشاف اور ان سے انتفاع کرنے سے باز نہیں رکھتا، بلکہ اس اکتشاف و انتفاع کو صحیح مقاصد کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ ہر شخص کو اسی کام میں لگاتا ہے جس کی اہلیت لے کر وہ پیدا ہوا ہے، خواہ اس کا میلان روحانیت کی طرف ہو یا مادیت کی طرف، لیکن ان دونوں قسم کے انسانوں کو وہ ایسے علم اور ایسے تعقل سے بہرہ ور کر دینا چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ افراط و تفریط کو چھوڑ کر ایک صراطِ مستقیم پر چل سکیں، انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو سمجھیں اور بجا لائیں، ان کی ذات پر خدا اور مخلوقات اور خود ان کے اپنے نفس کے جو حقوق ہیں ان کو جانیں اور ادا کریں، اور روحانیات کی طرف جائیں تو ان میں اس قدر گم نہ ہو جائیں کہ تمام تر مکاشفات اور لذاتِ روحانی ہی ان کی جدوجہد کا محور بن کر رہ جائیں، اور مادیت کی طرف متوجہ ہوں تو ادھر بھی ان کا انہماک اس قدر نہ بڑھ جائے کہ وہ بالکل حسّی لذتوں اور جسمانی آسائشوں اور مادی کامیابیوں ہی کو اپنا کعبۂ مقصود بنا لیں۔

یہ سراسر علمی و عقلی مذہب ہے، اس لیے اس کا صحیح اتباع بھی علم اور عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہر ہر قدم پر تفقہ اور تدبر کی ضرورت ہے۔ جو شخص اس مذہب کی رُوح سے ناآشنا ہو، اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو، اس کے اصول کو نہ سمجھتا ہو، اس کی تعلیم میں غور و فکر نہ کرتا ہو، وہ اس راہ راست پر استقامت کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جس کی طرف یہ مذہب رہنمائی کر رہا ہے۔ اس کا عقیدہ بے قیمت ہے جبتک کہ وہ زبانی اقرار سے گذر کر فکر و شعور پر حاوی نہ ہو گیا ہو۔ اس کا عمل بے اثر ہے جب تک کہ وہ علم اور فہم کی رُوح سے معمور نہ ہو جائے۔ اس کا اتباع قانون بے معنی ہے جب تک کہ قانون کی سپرٹ اس کے جوارح سے گذر کر اس کے دل و دماغ پر چھا نہ گئی ہو۔ اگر محض تقلید کی راہ سے وہ بغیر سمجھے بوجھے اس مذہب کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا اتباع کر رہا ہو، تو اس کا ایمان اور اتباع بالکل ایک ریت کے تودے کی طرح ہوگا جسے ہوا کا ہر جھونکا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ ایسے جاہل کے ایمان اور اندھے کے اتباع میں کوئی پائیداری نہیں ہو سکتی۔ ہر گمراہ کرنے والا اس کو صحیح مرکز سے ہٹا سکتا ہے۔ ہر خوش نما راستہ اس کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔ ہر توہم، ہر مفروضہ، ہر نظریہ اس کے اعتقاد کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتا ہے۔ ہوائے نفس کی ہر لہر اور ضلالت عام کی ہر رو اس کو بہا کر کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔ اگر وہ قدامت پسند ہوگا تو اعتقاد اور عمل کی ہر اس گمراہی پر اصرار کرے گا جو آباؤ اجداد سے اس کو میراث میں ملی ہو۔ اگر تجدد کا ذوق رکھتا ہوگا تو خواہشات نفس کو اپنا خدا بنا کر ہر اس نئے راستہ پر بھٹکتا پھرے گا جسے اس کے نفس کا شیطان اس کے سامنے مزین بنا کر پیش کر دے۔ اگر کمزور طبیعت کا ہوگا تو ہر اس راہرو کے پیچھے چل کھڑا ہوگا جو اسے زندگی کے راستے پر کسی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ قطع منازل کرتا نظر آئے۔ اگر خود اپنے اجتہاد سے کوئی راہ نکالنے کی اس میں صلاحیت ہوگی تو دین میں صحیح بصیرت نہ رکھنے اور الٰہی قانون کے اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زندگی کے سفر میں ہر دوراہے پر پہنچ کر وہ علم کے بجائے ظن و تخمین سے کام لے گا اور آخر کہیں

نہ کہیں جا کر سیدھے راستے سے بھٹک ہی جاتے گا۔ غرض اس خدائی مذہب کا صحیح اتباع اور اس اتباع میں استقامت، جہل اور نافہمی کے ساتھ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے علم اور سمجھ بوجھ اور غور و فکر ناگزیر ہے، اور انہی چیزوں کے کمال پر کمالی درجات مترتب ہوتے ہیں۔

اس مذہب کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو ہمارے اس بیان کی صداقت آپ کے سامنے نمایاں ہو جاتے گی۔ جتنے انبیاء علیہم السّلام اللہ کی طرف سے آتے وہ صرف ایک قانون اور ایک کتاب ہی لے کر نہیں آتے بلکہ اس کے ساتھ حکمت بھی لاتے، تاکہ لوگ ان کی تعلیم کو سمجھیں اور علی وجہ البصیرت اس قانون کی پیروی کریں جو ان کے ذریعہ سے بھیجا گیا تھا۔ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (النساء: ۵۴) وَیُعَلِّمُهُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (آل عمران: ۴۸) وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ (ص: ۲۰) قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَةِ (الزخرف: ۶۳) یہ حکمت کیا چیز تھی؟ دین کی سمجھ، علم کی روشنی، بصیرت کا نور، تدبر کی صلاحیت، اور تفقہ کی قابلیت۔ جب کبھی کوئی نبی آیا اس نے اپنے پیروؤں کو کتاب کے ساتھ یہ چیز بھی دی اور اسی کی مدد سے لوگ سیدھے رستے پر قائم رہے۔ اس کے بعد ایک دور جہالت اور اندھی تقلید کا آیا جس میں حکمت غائب ہو گئی اور کتاب باقی رہ گئی۔ کچھ عرصہ تک لوگ محض کتاب کو لیے ہوتے اس ڈگر پر چلتے رہے جس پر ان کے اسلاف انہیں چلا گئے تھے۔ مگر اب ان میں گمراہیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، کیونکہ وہ چیز ان میں باقی نہیں رہی تھی جس سے وہ کتاب کو سمجھتے اور ہدایت کو ضلالت سے ممتاز کر سکتے۔ رفتہ رفتہ ان کے قدم راہِ راست سے ہٹنے شروع ہوتے۔ کسی نے ہوائے نفس کا اتباع کیا۔ کسی نے ظن و تخمین کی پیروی کی۔ کسی نے گمراہ قوموں کے اثرات قبول کیے۔ کسی نے جھوٹے رہنماؤں کو ارباب من دون اللہ بنایا۔ آخر کار حکمت کے ساتھ کتاب بھی رخصت ہو گئی، اور خدا کے بھیجے ہوتے دین کو مسخ کر کے اوہام اور خرافات اور فکر و عمل کی گمراہیوں کا مجموعہ بنا دیا گیا۔

اس طرح بار بار دینِ الٰہی کے مسخ ہونے، اور کتبِ آسمانی کے گم یا محرّف ہو جانے اور امتوں میں ہدایت کے بعد ضلالت کے پھیل جانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دینِ الٰہی میں اصل چیز الفاظِ کتاب کی تلاوت اور رسومِ مذہب کی بجا آوری نہیں ہے، بلکہ تمام تر دارومدار کتاب کے صحیح علم و فہم پر ہے۔ جب تک لوگوں میں حکمت رہی اور وہ آیاتِ الٰہی میں تدبر کرتے رہے اور انبیاء کی بتائی ہوئی راہِ مستقیم پر نورِ بصیرت کے ساتھ چلتے رہے، اس وقت تک کوئی چیز ان کو گمراہ نہ کر سکی۔ اور جب یہ چیز ان سے مفقود ہو گئی تو گویا ان میں بیماریوں کی استعداد پیدا ہو گئی۔ ان کے اندر بھی امراض پیدا ہوتے اور باہر سے بھی وبائی جراثیم نے ان پر حملہ کیا یہاں تک کہ دین اور کتاب اور قانون سب کچھ کھو کر وہ ضلالت کے ہزارہا راستوں میں بھٹک گئے۔

انبیاء سابقین کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایسی کتاب اور ایسی ہدایت دے کر بھیجا گیا جس کو پچھلی کتابوں کی طرح مسخ اور محرّف ہونے کا تو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح صورت میں باقی رکھنے کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اگر انسان اس کو بدلنے اور مٹانے کی کوشش بھی کرے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب بھی اس کتاب اور اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے، اور دین کے سیدھے راستے پر قائم رہنے اور اعتقاد و عمل کی گمراہیوں سے بچنے کا انحصار کلیتہً اسی چیز پر ہے جس پر ابتدا سے دینِ الٰہی کی بنا رکھی گئی ہے، یعنی علم اور عقل۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت ہر زمانے اور ہر حال میں بہترین رہنما ہے، مگر ان کے لیے جو علم اور عقل رکھتے ہوں، اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کو سمجھیں، اس میں غور و خوض کریں، اس سے اکتسابِ نور کریں، اور زندگی کی ہر راہ میں اس نور کو لے کر چلیں۔ رہے وہ لوگ جو تفقہ و تدبر کی نعمت کھو چکے ہیں اور صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا ان کو مسلمان چھوڑ گئے ہیں، تو درحقیقت ان کے لیے دین میں کوئی استقامت ہے ہی نہیں۔ وہ ہر وقت گمراہی کے خطرہ میں ہیں۔ گمراہی ان کے اندر سے بھی پھوٹ سکتی ہے اور باہر سے بھی

حملہ کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی اپنی جہالت اور نافہمی ان کو راہ راست سے بھٹکا دے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے گرد وپیش جو ضلالتیں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے کسی کے پیچھے وہ بغیر جانے بوجھے لگ چلیں۔ کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے ہی نہیں جو ان کو دین کے سیدھے رستے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

قرآن مجید میں انسان کی گمراہی کا اصل سبب صرف ایک چیز کو قرار دیا گیا ہے اور وہ آیاتِ الٰہی کو نہ سمجھنا ہے، چنانچہ وہ بار بار اس پر متنبہ کرتا ہے اور نہایت شدت کے ساتھ اس کی مذمت کرتا ہے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (الانفال:۲۲)

اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف:۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوتے ہیں۔

صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (التوبہ:۱۲۷)

اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔

لَأَنتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِم مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ۔ (الحشر:۱۳)

ان کے دلوں میں خدا سے زیادہ تمہارا (یعنی بندوں کا) خوف ہے، یہ اس لیے کہ وہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ

کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے

عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴) — دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ (مومنون: ۶۸) — کیا انہوں نے اس بات پر (جو ان سے کہی جا رہی ہے) غور نہیں کیا؟

اس عدم تدبر اور نافہمی کے نتائج دو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور وہ دونوں گمراہی کی بدترین صورتیں ہیں

ایک صورت یہ ہے کہ انسان بغیر سمجھے بوجھے اپنے دین وایمان کو دوسروں پر چھوڑ دیتا ہے۔ خواہ وہ اس کو نجات کے رستے پر لے جائیں یا ہلاکت کے رستے پر۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ۔ (المائدہ: ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو بولے کہ ہمارے لیے وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ باپ دادا ہی کی تقلید کریں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا لیا ہے (کہ جس کو وہ حرام کہیں وہی ان کے نزدیک حرام ہے خواہ اللہ نے اس کو حلال کیا ہو اور جس کو وہ حلال کہیں وہ ان کے لیے حلال ہے خواہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہو)۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا۔ (احزاب: ۶۶-۶۷)

جب ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانی ہوتی۔ اور کہیں گے کہ خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے۔ اس راہ میں اوّل تو یقین نہیں ہوتا (جو راہ راست پر چلنے کا یقینی ذریعہ ہے) بلکہ زیادہ تر ظن وگمان ہوتا ہے، دوسرے بڑا خطرہ اس میں یہ ہے کہ انسان کی عقل پر نفس کی خواہشات غالب آجاتی ہیں اور اس کو اعتدال کے خطِ مستقیم سے ہٹا کر افراط و تفریط کی جانب لے جاتی ہیں۔ جب انسان اس رستے پر چلتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گامزن ہو، کہیں علم صحیح اور عقل سلیم کی بجلی اتفاق سے چمک گئی تو راستہ نظر آگیا اور کچھ چل لیے، کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ، ورنہ حیران ہو کر کھڑے ہو گئے، وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا، یا چلے تو کسی خارزار میں جا پھنسے یا کسی گڑھے میں گر گئے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (یونس: ۳۶)

اور ان میں سے اکثر بجز گمان کے کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے۔ اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق (علم یقین) سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ...... اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (الفرقان: ۴۳-۴۴)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟ ...... کیا تو گمان کرتا ہے کہ ایسے لوگوں میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ نہیں وہ تو بس جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بدراہ۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (قصص: ۵۰)

اور اس سے زیادہ بدراہ اور کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کی؟

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا

اور اس شخص کی بات ہرگز نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور جس نے

(کہف: ۲۸) — اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کے کام میں اعتدال سے تجاوز ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (جاثیہ: ۱۸) — اور ان لوگوں کی خواہش کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے۔

یہ نتائج ہیں آیاتِ الٰہی میں غور و خوض نہ کرنے اور تدبر و تفقہ سے کام نہ لینے کے جو لوگ آیات کی تلاوت کرتے ہیں مگر ان کو نہیں سمجھتے، کتاب رکھتے ہیں مگر خود اس کی تعلیم میں بصیرت حاصل کرتے اور اس کے احکام کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، رسول کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس ہدایت کی طرف سے اندھے ہیں جو رسول نے پیش کی ہے، اسلام کی حقانیت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر اس کے اصول اور اس کی روح سے ناواقف ہیں، ان کے لیے ہر ہر قدم پر یہ خطرہ ہے کہ گمراہی کی ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت میں مبتلا ہو جائیں۔ اسی لیے اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ دین میں بصیرت پیدا کریں، اس کی تعلیم اور اس کے احکام کو سمجھیں، اور کم از کم ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے جو تفقہ فی الدین حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ص: ۲۹) — یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے، برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و خوض کریں اور جو عقل رکھتے ہیں وہ اس سے سبق لیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ۔ (انعام: ۹۸) — ہم نے آیات کو مفصل بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ — اللہ نے مومنوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان

إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران: ۱۶۴)

یں خود انہی میں کا ایک رسول بھیج دیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (بقرہ: ۲۶۹)

اور جس شخص کو حکمت دی گئی اس کو بہت کچھ بھلائی دے دی گئی۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ۔ (توبہ: ۱۲۲)

پھر کیوں ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ ایسے نہ نکلے کہ دین میں تفقہ حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنی قوم کو آگاہ کرتے۔

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت ہدایات فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا لَا خَيْرَ فِي عِبَادَةٍ لَيْسَ فِيهَا تَفَقُّهٌ وَلَا عِلْمَ لَيْسَ فِيهِ تَفَهُّمٌ وَلَا قِرَاءَةَ لَيْسَ فِيهَا تَدَبُّرٌ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سن رکھو اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے اور اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبر نہیں ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے

مَن يُّرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ۔

اللہ جس کے لیے بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین میں تفقہ عطا کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

أَفْضَلُ النَّاسِ أَفْضَلُهُمْ عَمَلًا إِذَا فَقِهُوا دِينَهُمْ۔

لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو عمل کے اعتبار سے بہتر ہیں بشرطیکہ دین میں سمجھ بوجھ

رکھتے ہوں۔

اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی بلکہ اصلی مصیبت یہی ہے کہ ان میں تفقّہ فی الدین اور تدبر فی الکتب وابستہ نہیں ہے۔ اسی چیز کے فقدان نے ان کے اعتقادات کو کھوکھلا، ان کی عبادت کو بے روح، ان کی مساعی کو پراگندہ و پریشان اور ان کی زندگیوں کو بے ضابطہ و بدنظم کر دیا ہے۔ اسلام کے شیدائی ان میں بہت ہیں، مگر اسلام کو سمجھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام پر مرمٹنے والوں کی کمی نہیں، مگر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس دین کو پیش کیا ہے اس کی روح اور اس کے اصول کو سمجھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں بلکہ اتنے بھی نہیں۔ یہ اسی نافہمی کے نتائج ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں ان میں بدترین قسم کے توہمات اور مشرکانہ عقائد سے لے کر الحاد، دہریت اور کفر کی حد کو پہنچے ہوئے خیالات تک پائے جاتے ہیں اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ جس اسلام کی پیروی کے وہ مدّعی ہیں اس میں اور ان خیالات میں کلّی تباین ہے۔ اس سے بدتر حالت اخلاقی و عملی زندگی کی ہے۔ بت پرستانہ رسوم و رواجات سے لے کر جدید مغربی تہذیب کے بدترین ثمرات تک ہر قسم کے اطوار اس قوم میں رائج ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کا پیرو کہتی ہے۔ اور الا ماشاء اللہ کسی گروہ کو یہ احساس تک نہیں کہ وہ کہاں کہاں اس قانون کے اصول اور قواعد سے صریح انحراف کر گئی ہے جس پر ایمان رکھنے کا اس کو دعویٰ ہے۔ ہر غلط خیال اور غلط طریقہ جو کہیں سے آتا ہے ان میں رواج پا جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ ہر گمراہ کن شخص جو کسی خوش آیند طریقہ پر چل رہا ہے، بآسانی ان کا رہنما بن جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہم اس کی پیروی بھی کر سکتے ہیں۔ ہر چیز جو غیر اسلام ہے وہ بے تکلف اسلام کے ساتھ ایک ہی دماغ اور ایک ہی زندگی میں جمع کر لی جاتی ہے، کیونکہ اسلام اور غیر اسلام کا امتیاز علم و فہم پر موقوف ہے، اور اسی کا یہاں فقدان ہے۔ جو شخص مشرق اور مغرب کا فرق جانتا ہو وہ کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ مشرق کی

طرف چل رہا ہو اور یہ سمجھے کہ مغرب کی سمت جا رہا ہوں۔ یہ فعل صرف ایک جاہل ہی کا ہو سکتا ہے، اور یہی جہالت ہم ایک نہایت قلیل جماعت کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ ان پڑھ عوام ہوں، یا دستار بند علماء یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ سب یکساں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت ہی حکیمانہ ارشاد ہے کہ :۔

صِنْفَانِ اِذَا صَلَحَا صَلَحَتِ الْاُمَّةُ وَاِذَا فَسَدَا فَسَدَتِ الْاُمَّةُ اَلسُّلْطَانُ وَالْعُلَمَاءُ	دو گروہ ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو امت درست ہے اور اگر وہ بگڑ جائیں تو امت بگڑ جاتی ہے، حکمران اور علماء۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ہر باب اس ارشاد نبوی کی صداقت پر گواہ ہے۔ اور سب سے زیادہ آج ہم اس کی صداقت کو نمایاں دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہمارے حکمرانوں اور علماء میں تقویٰ اور دین کا صحیح علم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی، اور آج بھی اگر مسلمانوں کو ایسے رہنما میسر آ جائیں تو حالات کے اس درجہ بگڑ جانے پر بھی اصلاح سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

(ترجمان القرآن، شوال ۱۳۵۴ھ۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

اسلام میں عبادت کا تصوّر

انسان کے مذہبی تصورات میں عبادت کا تصوّر سب سے پہلا اور اہم تصور ہے[1] بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مذہب کا بنیادی تصور عبادت ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک نوع انسانی کے جتنے مذاہب کا پتہ چلا ہے، عام اس سے کہ وہ انتہا درجہ کی وحشی اقوام کے خرافات واوہام ہوں۔ یا اعلیٰ درجہ کی متمدن اقوام کے پاکیزہ معتقدات، ان میں سے ایک بھی عبادت کے تصور و تخیل سے خالی نہیں۔ علم الانسان اور آثارِ قدیمہ کی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں پرانی سے پرانی تہذیب کی حامل قوموں کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ گو وہ قومیں عقل و شعور کے بالکل ابتدائی درجہ میں تھیں لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے اپنی بساط بھر کسی نہ کسی کو ضرور معبود بنایا ہے اور کوئی نہ کوئی طریق عبادت ضرور اختیار کیا ہے۔ قدیم قوموں کو جانے دیجیے آج بھی بہت سی انسانی جماعتیں زمین کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں جو عقلی و ذہنی اعتبار سے قدیم ترین قوموں کی سطح پر ہیں، یا یوں کہیے کہ نوعِ انسانی کے بالکل ابتدائی

---

[1] بلکہ علم الانسان کی تازہ ترین تحقیقات سے تو یہ عجیب حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اوّلین انسانی تہذیب کی حامل قوموں میں خالص توحید کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور وہ شرک کے اثرات سے بالکل پاک ہیں (ملاحظہ ہو کتاب علم الاقوام مصنفہ ڈاکٹر بیرن عمر الف ایہرن فلس، شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی) ۔ یہ قرآن کریم کے اس بیان کی پوری پوری تصدیق ہے کہ انسان کا اوّلین مذہب توحید ہے اور شرک بعد کی پیداوار ہے۔ اس تحقیقات نے انیسویں صدی کے فلسفۂ مذہب کا نظریہ الٹ دیا۔

دور کا نقشہ اپنی زندگی میں پیش کر رہی ہیں۔ ان میں مشکل ہی سے کوئی ایسی جماعت دیکھی گئی ہے جو معبود اور عبادت کے تصور سے کلیتہً خالی ہو[1]۔ پس یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان قدیم ترین وحشت و بداوت سے لے کر جدید ترین تہذیب و حضارت تک جتنے مدارج سے گزرا ہے ان میں سے ہر درجہ میں عبادت کا تصور اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے، گو اس کے مظاہر و اشکال میں بے شمار تغیرات و اختلافات رونما ہوتے ہیں۔

عبادت ایک فطری جذبہ | غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ یہ خیال سارے بنی آدم پر حاوی ہے اور تمام زمانوں میں باوجود اختلافِ احوال یکساں حاوی رہا ہے؟ کیا یہ بالارادہ اختیار کیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ساری نوع پر اس کا اس طرح حاوی ہونا غیر ممکن تھا کیونکہ بالارادہ اختیار کی ہوئی چیزوں میں کبھی کامل اتفاق نہیں ہو سکتا۔ انسان کی اختیار کی ہوئی چیزوں میں سے ایک بھی ایسی نہ ملے گی جس کے اندر ہر مرتبہ اور ہر دور کی تمام انسانی جماعتیں یکساں مشترک ہوں اور یہ کسی طرح متصور نہیں ہے کہ ہر زمانہ کے تمام آدمیوں نے ایک عالمگیر کانفرنس کر کے باہم یہ ٹھہرا لیا ہو کہ وہ کسی کی عبادت ضرور کریں گے خواہ معبود مختلف اور طریقہائے عبادت بے شمار ہوں۔ پھر جب یہ چیز اختیاری نہیں ہو سکتی تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ عبادت کا جذبہ انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہے[2]۔ جس طرح انسان کو بھوک فطری طور پر لگتی ہے اور اس کے

---

[1] ان معلومات کے لیے کتاب مذکور کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

[2] معترض کہہ سکتا ہے کہ ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں اور تقریباً ہر زمانہ میں موجود رہی ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں اور جو عملاً و اعتقاداً کسی کی عبادت نہیں کرتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح مخنثوں کی ایک کثیر تعداد کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ جذبۂ شہوت ایک فطری جذبہ نہیں ہے اور جس طرح مجردوں اور راہبوں کے ایک بڑے گروہ کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ ازدواج کی خواہش ایک فطری خواہش نہیں ہے، اسی طرح ایسے افراد یا جماعتوں کا موجود ہونا بھی جن کے اندر مخصوص اسباب کے تحت عبادت کا فطری جذبہ مردہ یا بے حس ہو چکا ہے اس دعوے کی دلیل نہیں بن سکتا کہ انسان میں عبادت کا جذبہ ایک فطری جذبہ نہیں ہے۔

فرو کرنے کے لیے وہ غذا تلاش کرتا ہے، جس طرح اسے سردی اور گرمی فطری طور پر محسوس ہوتی ہے اور اس سے بچنے کے لیے وہ سایہ اور لباس ڈھونڈتا ہے جس طرح اداے مافی الضمیر کی خواہش اس میں فطری طور پر پیدا ہوتی ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے وہ الفاظ واشارات بہم پہنچاتا ہے بالکل اسی طرح عبادت کا جذبہ بھی انسان میں فطرۃً پیدا ہوتا ہے اور اس کی تسکین کے لیے وہ کسی معبود کو تلاش کرتا اور اس کی بندگی کرتا ہے۔

مگر جیسا کہ ہم بھوک اور سردی و گرمی کے احساس، اور اداے مافی الضمیر کی خواہش کے معاملہ میں دیکھتے ہیں، فطرت کا اثر زیادہ تر اس مجرّد داعیہ کی حد تک رہتا ہے جو انسان کو غذا، سایہ، لباس اور وسیلۂ اظہار مافی الضمیر کی تلاش پر مجبور کرتا اور جسم کے ان اعضاء کو جو ان کاموں سے متعلق ہیں حرکت دینے پر اُبھارتا ہے۔ اور اسی حد تک تمام انسانوں میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے آگے فطرت کا اثر کمزور اور خود انسان کا اپنا اختیار غالب ہو جاتا ہے اور یہیں سے وہ بے شمار اختلافات شروع ہوتے ہیں، جو غذا، مکان، لباس، زبان اور اشارات و علامات کی مختلف صورتوں اور ہیئتوں کے اعتبار سے ہر زمانہ کی مختلف قوموں میں پائے گئے ہیں۔ قریب قریب یہی حال عبادت کے جذبہ کا بھی ہے کہ وہ انسان کو بندگی و پرستش پر اُکسا کر چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد یہ انسان کے اپنے انتخاب پر ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے وہ کس کو معبود مانتا ہے اور اس کی عبادت کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسی اختیار کی حد پر پہنچ کر معبودوں اور عبادت کے طریقوں میں وہ اختلاف شروع ہوتا ہے جو انسان کی اختیار کی ہوئی تمام چیزوں میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس معاملہ میں بھی فطرت کی رہنمائی انسان کا ساتھ بالکل نہیں چھوڑ دیتی، جس طرح غذا اور لباس وغیرہ فطری معلومات کے انتخاب میں نہیں چھوڑتی ہے، لیکن یہ رہنمائی اتنی دھندلی اور خفی ہوتی ہے کہ اس کا ادراک کرنے کے لیے نہایت لطیف و نازک شعور کی ضرورت ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

آئیے اب ہم سراغ لگائیں کہ اس فطری داعیہ کا سر رشتہ کہاں سے ملتا ہے؟

اس کشش کا مرکز کہاں ہے جو انسان کو عبادت کے لیے کھینچتی ہے؟ کونسی قوتیں ہیں جو اسے معبود کی تلاش اور اس کی عبادت پر اُبھارتی ہیں؟ اور وہ کیا رہنمائی ہے جو اس تلاش میں ہم کو خود فطرت سے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے لیے ہم کو سب سے پہلے خود عبادت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے بغیر ان سوالات کا حل مشکل ہے۔

عبادت کی حقیقت | عبادت کا تصور دراصل ایک جامع تصور ہے جو دو ذیلی تصورات کے امتزاج سے مکمل ہوتا ہے، ایک بندگی، دوسرے پرستش، بندگی کے معنی ہیں کسی بالاتر قوت کی بڑائی تسلیم کرکے اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرنا۔ اور پرستش کے معنی ہیں کسی بالاتر ہستی کو پاک، مقدس اور بزرگ سمجھ کر اس کے آگے سرِ نیاز جھکا دینا اور اسے پوجنا۔ ان میں سے پہلا تصور عبادت کا ابتدائی اور بنیادی تصور ہے اور دوسرا تصور انتہائی اور تکمیلی۔ پہلا زمین کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا عمارت کی۔ اس لیے ہمیں اپنی تحقیق کی ابتدا پہلے تصور سے کرنی چاہیے۔

بندگی | بندگی یا فرمانبرداری و اطاعت ہمیشہ اس قوت کے مقابلہ میں کی جاتی ہے جو بندگی کرنے والے پر قہر و غلبہ اور قدرت و استیلاء رکھتی ہو، اور بندے یا مطیع میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو۔ اس کی محدود شکل تو وہ ہے جو آقا اور نوکر کے درمیان ہم عموماً دیکھتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ وسیع تصور کے لیے سب سے زیادہ واضح مثال وہ بندگی ہے جو رعایا اپنی حکومت کی کرتی ہے۔ حکومت کوئی مادی شے نہیں ہے، نہ ایک محسوس و مشاہد چیز ہے۔ ایک نظام و ضابطہ کی بندش ہے جس کا غلبہ و استیلاء لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر حاوی ہوتا ہے۔ رعایا اس کے قانون پر طوعاً و کرہاً چلتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں، کسان اپنے کھیتوں میں اور مسافر دور دراز جنگلوں میں، جہاں بظاہر حکومت کا زور جتلانے والی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی، اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے حدود و اختیار میں رہ کر جو شخص اس کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے اور زیادہ شدید نافرمانی کی صورت میں اس کے تمام وہ حقوق سلب ہو جاتے ہیں جو رعیت ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل تھے۔ اس لحاظ سے جس قدر لوگ کسی حکومت کے

حدود میں رہتے ہیں اور اس کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں ان کے متعلق ہم کہا کرتے ہیں کہ وہ فلاں حکومت کی فرمانبرداری و اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان الفاظ کی جگہ مذہبی اصطلاح استعمال کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی بندگی و عبادت کر رہے ہیں۔

اب اس تصور کو اور زیادہ وسیع کیجیے۔ پوری کائنات پر نظر ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سارا عالم اور اس کا ایک ایک ذرہ ایک زبردست نظام میں جکڑا ہوا ہے اور ایک قانون ہے جس پر خاک کے ایک ذرہ سے لے کر آفتابِ عالمتاب تک ساری کائنات طوعاً و کرہاً عمل کر رہی ہے۔ کسی شے کی یہ مجال نہیں کہ اس قانون کے خلاف چل سکے۔ جو چیز اس سے ذرہ برابر سرتابی کرتی ہے، وہ فساد اور فنا کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ زبردست قانون جو انسان، حیوان، درخت، پتھر، ہوا، پانی، اجسامِ ارضی اور اجرامِ فلکی سب پر یکساں حاوی ہے، ہماری زبان میں قانونِ فطرت یا قانونِ قدرت کہلاتا ہے۔ اس کے ماتحت جو کام جس چیز کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ہوائیں اس کے اشارے پر چلتی ہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ پانی اس کے فرمان سے بہتا ہے۔ ستارے اس کے ارشاد سے حرکت کرتے ہیں۔ غرض اس تمام کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی قانون کے ماتحت ہو رہا ہے اور ہر ذرہ اسی کام میں لگا ہوا ہے جس پر اس قانون نے اسے لگا دیا ہے۔ جس چیز کو ہم زندگی، بقا اور کون کہتے ہیں وہ دراصل نتیجہ ہے اس قانون کی اطاعت کا اور جس کو ہم موت، فنا، اور فساد کہتے ہیں وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس قانون کی خلاف ورزی کا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر شے جو زندہ اور باقی ہے وہ اس قانون کی اطاعت کر رہی ہے اور کائنات عالم میں کوئی شے زندہ اور باقی نہیں رہ سکتی اگر اس کی اطاعت نہ کرے۔

لیکن جس طرح حکومت کی مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قانون کی اطاعت دراصل قانون کی اطاعت نہیں بلکہ اس حکومت کی اطاعت ہے جس نے اپنے قہر و غلبہ سے اس قانون کو نافذ کیا ہے، اور حکومت کا نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے لامحالہ ایک حاکم، ایک مرکزی فرمانروا، ایک مقتدرِ اعلیٰ ہستی کا وجود ضروری ہے، بالکل اسی

طرح قانونِ فطرت کی اطاعت بھی در اصل اس غالب و قاہر حکومت کی اطاعت ہے جو اس قانون کو بنانے اور زور و قوت سے اس کو چلانے والی ہے، اور یہ حکومت ایک فرمانروا کے دستِ قدرت میں ہے جس کے بغیر اتنا بڑا عالمگیر نظام ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ یہاں اگر ہم قانونی لفظ "اطاعت" کو مذہبی اصطلاح "عبادت" سے بدل دیں اور لفظ "حاکم" کی جگہ "اللہ" یا "خدا" کا لفظ رکھ دیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساری کائنات اور اس کی ہر ہر چیز اللہ کی عبادت کر رہی ہے، اور یہ ایسی عبادت ہے جس پر ہر شے کے وجود و بقا کا انحصار ہے۔ کائنات کی کوئی شے اور مجموعی طور پر ساری کائنات اللہ کی عبادت سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہو سکتی، اور اگر غافل ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

قرآن مجید میں اس بندگی کو کہیں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے، کہیں تسبیح و تقدیس سے کہیں سجود سے، اور کہیں قنوت سے۔ چنانچہ جگہ جگہ اس مضمون کی آیات آئی ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (الذاریات: ۵۶)	میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔
وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ۔ (انبیاء: ۱۹-۲۰)	آسمانوں اور زمین میں جس قدر مخلوقات ہیں اور جو خدا کے پاس حاضر ہیں سب اسی کے ہیں اور اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔ رات دن اس کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور کبھی اس سے کاہلی نہیں کرتے۔
يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (جمعہ: ۱)	آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے اللہ ہی کی تسبیح کر رہی ہے، اس بادشاہ کی جو پاک غالب اور صاحب حکمت ہے۔
أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ جس قدر مخلوق آسمانوں

...فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ..... وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ (النور: ۴۱، ۴۲)

اور زمین میں ہے، اور جو پرندے پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں سب اللہ ہی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ سب اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتے ہیں ..... اور زمین و آسمان کی حکومت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اسی کی تسبیح کر رہے ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے گیت نہ گاتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ (الروم: ۲۶)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے حکم کے آگے جھکے ہوتے ہیں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۔ (الرحمٰن: ۵، ۶)

سورج اور چاند ایک حساب سے چکر لگا رہے ہیں، اور درخت اور تارے سجدے میں ہیں۔

"کیا لوگوں نے خدا کی مخلوق میں سے کسی چیز کی طرف بھی نظر نہیں کی جن کے سائے دائیں اور بائیں جھکتے ہیں، گویا اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور اظہار عجز کر رہے ہیں؟ اور جتنے جاندار اور ملائکہ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور اپنے رب سے جو بالاتر ہے ڈرتے ہیں اور جو ان کو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔" (النحل: ۴۸ تا ۵۰)

"کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو مخلوق آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور چاند اور سورج اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت

نیک آدمی اور بہت سے وہ بھی جو اپنی نافرمانی کی وجہ سے مستحق عذاب ہو چکے ہیں، سب کے سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔" (الحج: ۱۸)

"زمین اور آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں سب طوعاً و کرہاً اللہ ہی کو سجدہ کر رہی ہیں۔" (الرعد: ۱۵)

یہ عبادت، یہ سجود، یہ تسبیح، یہ قنوت، تمام جاندار اور بے جان، ذی شعور اور بے شعور چیزوں پر یکساں حاوی ہے، اور انسان بھی اس پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح مٹی کا ایک ذرہ، پانی کا ایک قطرہ اور گھاس کا ایک تنکا۔ انسان خواہ خدا کا قائل ہو یا منکر، خدا کو سجدہ کرتا ہو یا پتھر کو، خدا کی پوجا کرتا ہو یا غیر خدا کی، جب وہ قانونِ فطرت پر چل رہا ہے اور اس قانون کے تحت ہی زندہ ہے تو لامحالہ وہ بغیر جانے بوجھے، بلا عمد و اختیار، طوعاً و کرہاً خدا ہی کی عبادت کر رہا ہے، اسی کے سامنے سربسجود ہے اور اسی کی تسبیح میں لگا ہوا ہے۔ اس کا چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سب اسی کی عبادت ہے۔ چاہے وہ اپنے اختیار سے کسی اور کی پوجا کر رہا ہو اور اپنی زبان سے کسی اور کی بندگی و اطاعت کر رہا ہو مگر اس کا رونگٹا رونگٹا اسی خدا کی عبادت میں مشغول ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس کا خون اسی کی عبادت میں چکر لگا رہا ہے، اس کا قلب اسی کی عبادت میں متحرک ہے، اس کے اعضاء اسی کی عبادت میں کام کر رہے ہیں اور اس کی وہ زبان بھی جس سے وہ خدا کو جھٹلاتا اور غیروں کی حمد و ثنا کرتا ہے دراصل اسی کی عبادت میں چل رہی ہے۔

<u>بندگی کا صلہ</u>: اس عبادت کا صلہ یا اجر خدا کی طرف سے کیا ملتا ہے؟ فیضانِ وجود، رزق اور قوتِ بقاء، جتنی چیزیں خدا کے قانون پر چلتی ہیں اور اس کی بندگی کرتی ہیں، وہ زندہ اور باقی رہتی ہیں اور انہیں وہ وسیلۂ بقا عطا کیا جاتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں "رزق" کہتے ہیں۔ اور جو چیزیں اس کے قانون سے انحراف کرتی ہیں ان پر فساد مسلط ہو جاتا ہے، ان کا رزق بند ہو جاتا ہے، اور وہ فیضانِ وجود سے

محروم ہو جاتی ہیں۔ یہ معاملہ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ ہو رہا ہے اور اس میں شجر و حجر، حیوان و انسان، کافر و شاکر کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا۔ (ہود: ۶)

کوئی چیز زمین پر چلنے والی ایسی نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اللہ ہر ایک کے ٹھکانے سے بھی واقف ہے اور اس کے سونپے جانے کی جگہ بھی جانتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ۔ (فاطر: ۳)

لوگو اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو زمین اور آسمان سے تم کو رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ۔ (الملک: ۱۵)

وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مطیع و مسخر بنا دیا پس تم اس کی پہنائیوں پر چلو اور پھر اس کا رزق کھاؤ۔

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ أَإِلٰهٌ مَعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (النمل: ۶۴)

کون ہے جو مخلوقات کو اول بار پیدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ إِنِ

کیا یہ لوگ پرندوں کو نہیں دیکھتے جو ان کے اوپر پر پھیلائے اور سکیڑتے ہوئے اڑ رہے ہیں؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو ان کو سنبھالے ہوئے ہو۔ وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ اور یہ رحمٰن کے سوا اور کون ہے

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ (الملک: ۲۰تا۲۱)

جو تمہارا لشکر بنکر تمہاری مدد کرتا ہے؟ مگر کافریں کردھوکے میں پڑے ہوتے ہیں اور اگر اللہ اپنا رزق بند کردے تو کون ہے جو تم کو رزق دے سکتا ہے؟ مگر کافر سرکشی اور سرتابی پرجے ہوئے ہیں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح انسان اس بندگی میں دوسری اشیاء کے ساتھ مساوی ہے، اسی طرح اس بندگی کے اجر اور معاوضہ میں بھی وہ ان کے ساتھ مساوی رکھا گیا ہے۔ انعام کی صورتوں کا فرق جو کچھ بھی ہے، دراصل استعداد اور حاجتوں کے فرق پر مبنی ہے لیکن صورتوں سے قطع نظر کرکے اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایک درخت، ایک جانور، ایک چڑیا، ایک گھاس کی پتی کی احتیاج واستعداد کے مطابق اللہ اس کی دیکھ بھال، خبر گیری، امداد واعانت اور رزق رسانی کر رہا ہے، اسی طرح انسان کی احتیاج واستعداد کے مطابق اس پر بھی انعام فرماتا ہے۔ اس بارے میں انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اگر کوئی فضیلت ہے تو محض وہ صورت انعام کے اعتبار سے ہے نہ کہ حقیقتِ انعام کے اعتبار سے اور صورتِ انعام کا حال یہ ہے کہ وہ ہر شے کی طبیعت اور حاجت کے عین مناسب ہے۔ ایک چوہے پر جو انعام فرمایا گیا ہے، انعام کی وہی صورت اس کی فطرت اور ضرورت سے مناسبت رکھتی ہے۔ دوسری کوئی صورت جس کو ہم بہتر سمجھتے ہیں، اس کے لیے انعام نہیں سزا ہو جاتی ہے۔ ایک بڑے سے بڑا منعم انسان جو آرام اپنی پھولوں کی سیج پر محسوس کرتا ہے، وہی آرام ایک چھوٹی سے چھوٹی چڑیا اپنے گھاس پھونس کے گھونسلے میں محسوس کرتی ہے۔ پھولوں کی سیج تنکوں کے گھونسلے پر لاکھ فخر کرے مگر حقیقت میں گھونسلے والے کی استعداد کے مطابق اس کی احتیاج پوری کی گئی ہے۔ اس حیثیت سے دونوں پر خدا کا انعام یکساں ہے پھر یہی معاملہ کافر وشاکر، مومن ومشرک کے ساتھ بھی یکساں ہے۔ جو لوگ خدا کے

منکر ہیں اور اس کی پرستش نہیں کرتے، جو اس کے ساتھ اس کی مخلوق کو شریک کرتے ہیں جو شجر و حجر کو اس کا مدِ مقابل ٹھہراتے ہیں، ان پر بھی رزق اور فیضانِ وجود اور حفاظت و خبر گیری کا انعام اسی طرح ہوتا ہے جس طرح پکے موحدوں اور خدا پرستوں پر ہوتا ہے۔ بلکہ اگر قانونِ فطرت کی پیروی یا بالفاظِ دیگر "فطری عبادت" میں ایک کافر ایک مومن سے بڑھا ہوا ہے تو اس کی عبادت کا صلہ بھی کافر کو مومن سے بہتر صورت میں عطا ہوتا ہے خواہ وہ حقیقت کی نگاہ میں متاعِ غرور ہی کیوں نہ ہو۔

جذبۂ عبادت کیوں پیدا ہوتا ہے | اب یہ سوال بآسانی حل ہو جاتا ہے کہ انسان میں عبادت کا جذبہ فطری طور پر کیوں پیدا ہوتا ہے اور وہ کیوں اپنے معبود کو تلاش کرتا ہے۔ جب ساری کائنات اور اس کی ہر چیز ایک غالب و قاہر فرمانروا کی بندگی کر رہی ہے، اور جبکہ خود انسان کا اپنا بھی ایک ایک رونگٹا اس کی عبادت میں لگا ہوا ہے، وہ تمام عناصر جن سے انسان کا جسم مرکب ہے اس کے آگے سربسجود ہیں، جسمِ انسانی میں ان عناصر کی ترکیب اسی کے فرمان سے ہوتی ہے، اور انسان کا وجود ہر آن اس کی بندگی ہی پر منحصر ہے، تو آپ سے آپ بندگی و عبودیت انسان کی سرشت میں داخل ہو گئی ہے۔ گو وہ اس صاحبِ حکومت کو نہیں دیکھتا جس کا وہ بندہ ہے، نہ دنیوی حکومتوں کی طرح اس خدائی حکومت کے عامل اور نمائندے اس کے سامنے آتے ہیں، مگر چونکہ وہ بندہ ہی پیدا ہوا ہے، اور بلا ارادہ ہر وقت بندگی کر رہا ہے اور اس کے مالک کی حکومت نے ہر طرف سے ــــ اندر سے بھی اور باہر سے بھی ـــــ اس کو اور اس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں کو جکڑ رکھا ہے، اس لیے فطری طور پر اس کے اندر نیاز مندی، نیائش و گزارش، پرستش و عبودیت کا ایک گہرا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کا دل بے اختیار کسی معبود کو تلاش کرتا ہے کہ اس کی حمد و ثنا کرے، اس کی بڑائیاں کرے، اس کے آگے اپنی بندگی و عقیدت کی نذر پیش کرے، اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگے، اور ہر آفت سے اس کے دامن میں پناہ ڈھونڈے ــ یہی سرشت ہے جس نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو تلاش

معبود پر مجبور کیا ہے۔ اسی تحریک پر اس نے ہمیشہ پرستش کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی ہے اور یہی وہ عنصر ہے جس سے مذہب کی پیدائش ہوتی ہے۔

تلاشِ معبود میں فطرت کی رہنمائی | لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، فطرت نے ہر معاملہ میں انسان کے اندر ایک مجرد طلب، ایک سادہ خواہش، ایک ناقص کشش پیدا کر کے اس کو چھوڑ دیا ہے کہ اپنے مطلوب کو خود تلاش کرے۔ گویا یوں سمجھیے کہ فطرت انسان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ایک نامعلوم چیز کی طلب پر اس کو اکساتی ہے اور پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے تاکہ وہ اپنی عقل پر زور دے کر اپنے حواس سے کام لے کر معلوم کرے کہ اس کے دل میں جس چیز کی لگن لگی ہوئی ہے، اس کی فطرت جو چیز مانگ رہی ہے، وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور کس طرح اس کو حاصل کیا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر انسان کو مشکلات پیش آئی ہیں اور اس نے اپنی عقلی استعداد، اپنی قوتِ فکر و تمیز کی رسائی اور اپنے ذوق و وجدان کی صلاحیت کے مطابق اپنے لیے وہ مختلف راستے نکالے ہیں جو آج نوعِ انسانی کے تمدن و معاشرت کی گوناگونی میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس تلاش و جستجو اور اختیار و انتخاب میں فطرت نے کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ مگر جس طرح وہ ہر ہر قدم پر حیوانات کی رہنمائی کرتی ہے، اس طرح انسان کی رہنمائی نہیں کرتی۔ انسان کو وہ نہایت لطیف اشاروں میں ہدایت دیتی ہے، نہایت خفیف روشنی دکھاتی ہے جس کا ادراک معمولی عقل و بصیرت والے لوگ نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ انسان کا اختیار تمیزی صحیح راستہ کی تلاش میں ناکام ہوا اور ہوائے نفس اس کو غلط راستوں پر بھٹکا لے گئی۔

مثال کے طور پر غذا کی خواہش پیدا کرنے سے فطرت کا منشا تو یہ تھا کہ انسان ایسا مواد اپنے جسم کو مہیا کرے جس سے وہ زندہ رہ سکے اور تحلیل شدہ اجزاء کا بدل اس کو ملتا رہے۔ مگر بہت سے لوگ اس خوردن برائے زیستن کی حقیقت کو نہ سمجھے۔ تلاشِ غذا پر ابھارنے کے لیے جو ذائقہ کی چاشنی فطرت نے اس کے کام و دہن میں لگا دی تھی

اس، کو وہ اصل مقصود سمجھ بیٹھے اور ہوائے نفس ان کو زلیستن برائے خوردن کی غلط فہمی میں مبتلا کر کے فطرت کے اصل منشا سے دُور ہٹالے گئی۔ اسی طرح لباس اور مکان کی طلب دراصل موسمی اثرات سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ مگر ہوائے نفس نے اس کو بھڑک اور تفاخر اور اظہارِ شان وتصنّع کا ذریعہ بنا لیا، اور انسان فطرت کے منشا سے تجاوز کر کے انواع واقسام کے نفیس لباس اور عالیشان محل بنانے لگا جو آخر کار خود اسی کے لیے معزت رساں ثابت ہوتے۔ یہی حال ان تمام داعیاتِ فطرت کا ہُوا ہے جنہوں نے انسان میں مختلف چیزوں کی طلب پیدا کی، اور انسان نے فطرت کے منشاء کو نہ سمجھ کر، یا بسا اوقات سمجھنے کے باوجود نظر انداز کر کے، اپنے اختیار سے اس طلب کو پُورا کرنے کے لیے وہ مختلف ڈھنگ اور طریقے نکال لیے جو فطرت کے اصل مقصد سے زائد اور بہت سے معاملات میں اس کے خلاف تھے۔

پھر یہی چیزیں اگلوں سے پچھلوں تک تمدن وتہذیب، رسم ورواج اور آدابِ اطوار بن کر پہنچیں جن کی گرفت نے بعد کی انسانی نسلوں کو ایسا جکڑا کہ فطرت کی رہنمائی کو سمجھنا تو درکنار، ان کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی کو استعمال کرنے کی آزادی بھی باقی نہ رہی، اور اسلاف کے طریقوں نے مقدس قوانین بن کر ان کو اندھی تقلید کے رستے پر ڈال دیا۔ حالانکہ فطرت جس طرح پہلے انسان کو لطیف اشارے اور خفیف ہدایتیں دے رہی تھی، اسی طرح آج بھی دے رہی ہے اور ہمیشہ دیتی رہے گی، جنہیں عقلِ سلیم تھوڑے یا بہت اجتہاد سے ہر وقت سمجھ سکتی ہے۔

معبود کی طرف ہادی فطرت کے اشارے تلاشِ معبُود کی فطری خواہش کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا ہے۔ جب انسان نے عبادت کے جذبہ سے بے چین ہو کر اپنے لیے کسی معبود کو ڈھونڈنا شروع کیا تو فطرت اپنے اسی لطیف انداز میں اس کو معبودِ حقیقی کے اتے پتے دینے لگی کہ تیرا معبود وہ ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے جو تجھ سے بالاتر ہے، جس کی قوت کے سامنے تو عاجز ہے، جو ہر چیز پر غالب ہے جو تجھے اور ہر جاندار کو رزق دیتا ہے جو اپنے حسن وجمال اور خوبی وعلائی کی

بنا پر ہر طرح تیری مدح وستائش کا مستحق ہے، جس کا نور آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو روشنی دیتا ہے، جس کا جمال اپنے جلووں سے آب گل کی صورتوں کو یہ جوبن اور یہ نکھار اور یہ دلفریب حسن بخشتا ہے، جس کا جلال پانی کی موج، ہوا کے طوفان، زمین کی لرزش، پہاڑ کی سربلندی، شیر کی درندگی اور سانپ کی گزندگی میں اپنی شوکت کا اظہار کرتا ہے، جس کی ربوبیت ماں کے سینے میں محبت و شفقت بن کر، گائے کے تھن میں دودھ بن کر، پتھر کے کلیجے میں پانی بن کر ظہور کرتی ہے۔ یہ لطیف اشارے ہر زمانے میں مختلف سمجھ بوجھ کے لوگوں کو دیئے گئے، اور ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق الٹوں سیدھوں سے اس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کی۔ جب انسان اپنی ابتدائی فطری حالت (State of Nature) میں تھا تو وہ ان اشاروں کو صاف سمجھتا تھا اور اس ایک ہی معبود کے آگے جھکتا تھا جس کی طرف یہ اشارے ہو رہے تھے۔ مگر جب وہ اس حالت سے آگے بڑھا اور استدلالی فکر کی راہ پر چلنے لگا تو اس کی سرگردانیوں کا آغاز ہو گیا۔

انسان کی سرگردانیاں کسی نے ان صفات کے معبود کو زمین پر تلاش کیا اور پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، اور نفع و ضرر پہنچانے والے جانوروں پر فریفتہ ہو گیا، صنفی اعضاء (Sexual Organs) کو پوجنے لگا، آگ کے سامنے دھونی رما بیٹھا، ہوا کے آگے سربسجود ہوا، دھرتی ماتا کو عقیدت کا خراج دینے لگا۔ غرض اس کی نظر آس پاس ہی کے مناظر میں الجھ کر رہ گئی۔

کسی کی نظر اس سے آگے بڑھی۔ وہ ارضی معبودوں سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ یہ سب چیزیں تو اسی کی طرح کسی اور کی بندگی میں مبتلا ہیں، خود اپنے وجود و بقا کے لیے بھی غیر کی محتاج ہیں، ان کے پاس کیا رکھا ہے جس کے لیے ہم استعانت کا ہاتھ بڑھائیں اور عقیدت کی پیشانی جھکائیں۔ آخر اس نے زمین کو چھوڑ کر آسمان پر اپنے معبود کو تلاش کیا۔ سورج کو دیکھا، چاند پر نظر ڈالی، اجرام فلکیہ کی چمک دمک دیکھی اور کہا کہ یہ ہیں عبادت کے لائق۔

مگر جو اس سے زیادہ باریک بین تھا اس کو آسمان والوں کا حال بھی زمین والوں سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہ آیا۔ اس نے کہا یہ لاکھ بلند تر و برتر سہی، روشن اور روشن گر سہی۔ لیکن اپنے اختیار سے کیا کر سکتے ہیں؟ ایک مقرر قانون، ایک سخت بندھے نظام کے تحت گردش کیے جا رہے ہیں۔ سورج کو با ایں ہمہ عظمت و بزرگی آج تک یہ مجال نہ ہوئی کہ مشرق کے بجائے کسی روز مغرب سے نکل آتا یا اپنے مقام سے ایک ہی انچ سرک جاتا۔ چاند کبھی اس قابل نہ ہوا کہ جو دن اس کے ہلال بننے کا تھا اس دن بدرین کر نکلتا۔ اسی طرح کوئی اور سیارہ بھی اپنی مقررہ گردش سے یک سر مو تجاوز نہ کر سکا۔ اس بندگی، بیچارگی، کھلی ہوئی غلامی کو دیکھ کر اس جویائے معبود نے آسمان سے بھی منہ موڑ لیا، تمام مادی و جسمانی چیزوں کو ناقابلِ پرستش قرار دیا، اور اپنے معبود کی تلاش میں معانی مجردہ (Abstract Ideas) اور روحانیات کی طرف پیشقدمی کی، نور کا پروانہ بنا۔ دولت کی دیوی کا فریفتہ ہوا، محبت کے دیوتا پر ریجھا، حسن کی دیوی کا گرویدہ ہوا، قوت کے دیوتا کو سجدہ کیا، مدبرات عالم (World Forces) کے ہیکل تجویز کیے اور ان کی عبادت اختیار کی، ارواح اور عقول (Logos) اور ملائکہ کو مسجود بنایا اور سمجھا کہ یہی عبادت کے لائق ہیں۔

اس طرح کائنات کی ہر وہ چیز جس کے اندر مختلف قابلیتوں کے لوگوں کو اپنی اپنی فکر کی رسائی اور نظر کی استعداد کے مطابق برتری، ربوبیت، نعمت بخشی، قدرت، حسن و جمال، قہر و جلال، اور خالقیت کی جھلک نظر آئی، اس کے آگے جھک گئے اور فطرت کے دیئے ہوئے سراغ پر جو شخص جتنی دور جا سکا، گیا، اور ٹھہر گیا، مگر جو لوگ زیادہ صحیح وجدان، زیادہ لطیف ادراک اور زیادہ سلیم عقل رکھتے تھے، اور فطرت کے بتلائے ہوئے نشانات پر ٹھیک ٹھیک سفر کر رہے تھے وہ ان ارضی و سماوی معبودوں اور روحانی و خیالی دیوتاؤں میں سے ایک سے بھی مطمئن نہ ہوتے، بیچ کی منازل میں ایک پر بھی نہ ٹھہرے اور بڑھتے بڑھتے اس منزل پر پہنچ گئے جہاں انہیں کائنات کی تمام مادی، روحانی، ذہنی، علوی اور سفلی قوتیں کسی اور کی گرفت میں جکڑی ہوئی، کسی

اور کی بندگی میں مشغول، کسی اور کے آگے جھکی ہوئی، کسی اور کی تسبیح پڑھتی ہوئی نظر آگئیں۔
یہاں انہوں نے اپنے دل کے کانوں سے یہ آواز سنی۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ (انبیاء: ۲۵) میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو۔

یہ اسی معبود کی آواز تھی جس کی تلاش میں وہ چلے تھے۔ طالب کو قریب پاکر مطلوب خود پکار اٹھا۔ اس نے آپ ہی آگے بڑھ کر اپنا پتہ بتا دیا۔ یہاں پہنچ کر سفر ختم ہو گیا، منزل مقصود مل گئی، اور ڈھونڈنے والے مطمئن ہو گئے۔[1] یہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس آخری ہدایت کو پانے کے بعد پھر کوئی مزید تلاش وجستجو کے لیے بے چین نہ ہوا۔ بے چینی، بے قراری، بے اطمینانی جو کچھ بھی تھی بیچ کی منزلوں میں تھی۔ آخری منزل پر پہنچ کر ہر دل نے گواہی دی کہ جس کو ڈھونڈ رہے تھے وہ یہی ہے۔ اب کسی تلاش وجستجو کی حاجت نہیں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد: ۲۸)

انسان اپنے معبود کی تلاش میں جب تک خدائے واحد تک نہ پہنچا بے چین رہا، غیر مطمئن رہا، اس کے دل میں تلاش کی بے کلی اور جستجو کی کھٹک برابر چٹکیاں لیتی رہی مگر جب خدائے واحد کو اس نے پا لیا تو اس کا دل مطمئن ہو گیا۔ پھر کبھی اس نے تلاش معبود کی

---

[1] آج کل مذہب پر لکھنے والے مصنفین کا رجحان زیادہ تر تاریخی ارتقاء کے نظریہ کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان نے ابتدا شرک کی ادنیٰ شکلوں سے کی تھی۔ جوں جوں شعور بڑھتا گیا معبودوں کا معیار اونچا ہوتا گیا اور ان کی تعداد گھٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ ترقی کرکے انسان توحید تک پہنچا۔ لیکن تاریخ خود اس تاریخی نظریہ کا ابطال کرتی ہے۔ مسیح سے ڈھائی ہزار برس پہلے حضرت ابراہیمؑ خالص توحید کے پرستار تھے اور مسیح سے دو ہزار برس بعد آج بھی نوع انسانی میں کروڑوں آدمی شرک کے پرستار موجود ہیں۔ کیا یہ تاریخی ارتقاء کا ثبوت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ادنیٰ ترین شرک سے لیکر بلند ترین توحید تک عبادت اور عقیدت کی تمام اقسام ہر زمانہ میں پائی گئی ہیں اور آج تک پائی جاتی ہیں۔ تفاوت دراصل مختلف انسانوں کے عقلی و ذہنی مدارج میں ہے، نہ کہ تاریخی ترتیب میں۔

بے چینی محسوس نہ کی۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ تلاشِ معبود کا یہ سفر خدا کے سوا کسی غیر پر ختم نہیں ہوا اور خدا تک پہنچ کر ایسا ختم ہوا کہ پھر کسی اور کی جستجو دل میں پیدا ہی نہ ہوئی؟ غور کرنے سے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو جو فطری جذبہ پرستش پر مجبور کرتا ہے، اس کا اصل مقصد خدائے واحد ہی کی پرستش ہے۔ جب تک وہ اپنے اس معبودِ حقیقی کو نہیں پہنچ جاتا، مطمئن نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ عقل و فکر کی نارسائی، یا تعصب اور ہٹ دھرمی، یا آباء و اجداد کی اندھی تقلید بعض افراد کو یہ بے اطمینانی محسوس نہ ہونے دے۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں: انسان کے اندر پرستش کا فطری جذبہ پیدا ہی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کے گرد و پیش کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی بندگی میں مشغول ہے۔ ایسی حالت میں جب ایک ظلوم و جہول انسان خدا سے ناواقف ہو کر غیر خدا کی پرستش کے لیے جھکتا ہے تو اس کے گرد و پیش کا کوئی عنصر، حتیٰ کہ خود اس کے اپنے جسم کا بھی کوئی جزو اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ جن پاؤں سے اپنے خود ساختہ معبود کی طرف بڑھتا ہے وہ خدا کی عبادت میں چلتے ہیں۔ جن ہاتھوں سے اس کے آگے نذر پیش کرتا ہے وہ خدا کی بندگی میں حرکت کرتے ہیں۔ جس پیشانی سے اس کو سجدہ کرتا ہے وہ خدا کے سجدہ میں جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ جس زبان سے اس کی ثنائی بیان کرتا ہے وہ خدا کی تقدیس و تمجید میں مشغول ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی یہ ساری پرستش، یہ تمام نیائش و گزارش ایک جھوٹ، ایک افتراء، ایک بہتان، ایک صریح جہل ہوتی ہے جس کے بطلان پر کائنات کا ہر ذرّہ گواہی دیتا ہے، اور خود انسان کی فطرت اپنی لطیف و غیر محسوس آواز میں بار بار اسے تنبیہ کرتی ہے کہ یہ تو کس دھوکے میں پڑ گیا ہے؟ کیا تجھے بندے کی بندگی، پرستار کی پرستش، فرمانبردار کی فرمانبرداری کرتے شرم نہیں آتی اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ۔ (انبیاء: ۶۷)

پرستش اور بندگی کی یکجائی پرستش دراصل بندگی کی فرع ہے اور اپنی عین فطرت کے اقتضا رسے اپنی اصل کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ جب انسان اپنے جہل اور بے خبری کی بنا پر فرع کو اصل سے جُدا کرتا ہے ـــــ بندگی ایک کی کرتا ہے اور پرستش دوسرے کی ـــــ تو یہ تفریق سراسر فطرت کے خلاف واقع ہوتی ہے اور ایک نہایت خفی و غیر محسوس تحت الشعوری بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب نادانی کا پردہ درمیان سے اُٹھ جاتا ہے ـــــ انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جاتا ہے کہ معبود وہی ہے جو مالک اور خالق اور پروردگار ہے ـــــ تو بندگی اور پرستش دونوں یکجا ہو جاتی ہیں، فرع اصل سے مل جاتی ہے، بیٹی اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے، اور اس وصال سے وہ لطف وہ مزا، وہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے جو ہجر و فراق کی حالت میں مفقود تھا۔

خلافت و نیابت الٰہی بندگی اور پرستش کی یہی مواصلت ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوقات پر شرف حاصل ہوتا ہے، اور وہ اس مرتبہ پر پہنچتا ہے جسے خدا نے اپنی خلافت و نیابت قرار دیا ہے۔ پچھلی تقریر پر پھر ایک نظر ڈال لیجے۔ عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی بندگی تو انسان آپ سے آپ بلا ارادہ و اختیار، بغیر جانے بوجھے کر ہی رہا ہے، اور ٹھیک اسی طرح کر رہا ہے جس طرح لایعقل حیوان، بے شعور درخت، بے جان پتھر کر رہے ہیں۔ اس حیثیت سے اس میں اور دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔ اور اس بندگی کا جو انعام ہے یعنی فیضانِ وجود اور عطاء رزق، اس میں بھی وہ فی الحقیقت دوسری مخلوقات سے ممتاز نہیں ہے۔ فرق و امتیاز اور برتری و شرف جو کچھ ہے، اس امر میں ہے کہ دوسری موجودات کے برخلاف جو عقل و شعور، جو آزادیٔ ارادہ و اختیار، اور جو قوتِ علمیہ انسان کو دی گئی ہے اس سے کام لے کر وہ اس کو پہچانے جس کا وہ بندہ ہے، اور بالاختیار بھی اسی کی عبادت اور پرستش کرے جس کی وہ بلا اختیار بندگی کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی عقل اور قوتِ علمیہ سے اپنے مالک کی معرفت حاصل نہ کی، اور اپنے اختیار کے حدود

میں اس کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت اور پرستش شروع کر دی تو شرف کیسا، وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا، أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ (اعراف: ۱۷۹)

بجائے خود عقل اور قوتِ علمیہ میں کوئی شرف اور برتری نہیں ہے۔ یہ تو محض حصولِ شرف کے لیے ایک آلہ ہے اور اس آلہ نے انسان کو یہ استعداد بہم پہنچائی ہے کہ اس سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر وہ بندگیٔ اضطراری کے حیوانی مقام سے ترقی کر کے عبادتِ اختیاری کے انسانی مقام پر پہنچ سکے۔ لیکن اگر انسان نے اس آلہ سے غلط کام لیا، اور اس کو چھوڑ کر جس کا وہ بندہ ہے ان کی عبادت اختیار کی جن کا فی الحقیقت وہ بندہ نہیں ہے[1] تو وہ حیوانی مقام سے بھی نیچے اتر گیا۔ حیوان گمراہ تو نہ تھا، یہ گمراہ ہوا۔ حیوان منکر تو نہ تھا، یہ منکر ہوا۔ حیوان کافر و مشرک تو نہ تھا، یہ کافر و مشرک ہو گیا۔ حیوان جس مقام پر پیدا کیا گیا تھا اسی مقام پر وہ رہا۔ اور حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی اسی مقام پر ہے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے جو ترقی اس کو کرنی چاہیے تھی وہ اس نے نہ کی، بلکہ اُلٹا تنزل کی طرف چلا گیا۔ ترقی کے لیے اس کو جو عقل کا آلہ دیا گیا تھا اس کو اس نے انسانی ترقی کے لیے استعمال نہ کیا بلکہ حیوانیت میں ترقی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے دُوربین بنائی کہ حیوان جتنی دُور کی چیز دیکھ سکتا ہے اس سے زیادہ دُور کی چیز یہ دیکھ سکے۔ اس نے ریڈیو ایجاد کیا کہ حیوان جتنی دُور کی آواز سن سکتا ہے اس سے زیادہ دُور کی آواز یہ سن سکے۔ اس نے ریل اور موٹر بنائی کہ حیوان جس قدر قطع مسافت کر سکتا ہے اس سے زیادہ یہ کر سکے۔ اس نے ہوائی جہاز بنائے کہ اڑنے میں پرندوں سے بازی لے جائے

---

[1] ان معبودوں میں انسان کی اپنی ہوائے نفس بھی شامل ہے۔ جو شخص خدا کی بندگی نہیں کرتا وہ یا تو بتوں اور مصنوعی معبودوں کی بندگی کرتا ہے، یا فرعون صفت انسانوں کی، یا پھر اپنی خواہشات کی۔

اس نے بحری جہاز بنانے کہ تیرنے میں مچھلیوں کو مات کر دے۔ اس نے آلاتِ حرب بنائے کہ لڑنے میں درندوں پر سبقت لے جاتے۔ اس نے عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے کہ جانوروں سے زیادہ پُرلطف زندگی بسر کرے۔ مگر کیا ان ترقیات کے باوجود یہ مقام حیوانی سے کچھ بھی بلند ہوا؟ عقل و علم کے ذریعہ سے عالمِ مادی میں جتنے تصرفات یہ کر رہا ہے وہ سب کے سب انہی قوانینِ فطرت کے ماتحت تو ہیں جن کے تحت عقل و علم کے بغیر حیوانات ایک محدود پیمانے پر ایسے ہی تصرفات کرتے ہیں۔ پس یہ تو وہی بندگیٔ اضطراری کا مقام ہوا جس میں حیوان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حیوان نے کمتر درجہ کی بندگی کی، کمتر درجہ کا رزق پایا۔ اس نے عقل و علم کی قوت سے اعلیٰ درجہ کی بندگی کی۔ اعلیٰ درجہ کے رزق کا مستحق ہوا۔ حیوان کو گھاس ملتی تھی۔ اس کو توس اور مکھن ملا۔ حیوان کو صوف اور اون ملتا تھا۔ اس کو نفیس کپڑے ملے۔ حیوان کو گھونسلے میں جگہ دی جاتی تھی۔ اس کو بنگلوں اور کوٹھیوں میں ٹھیرایا گیا۔ حیوان کو پیدل دوڑنا پڑتا تھا اس کو موٹر دے دی گئی۔ یہ اس کی حیوانی بندگی اور اس کی اضطراری عبادت کا کافی انعام ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ترقی کا جو آلہ اس کو دیا گیا تھا اس سے اس نے ترقی کیا کی؟ ترقی کے معنی تو یہ تھے کہ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کو بے اختیار سجدہ کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اختیاری سجدہ بھی اسی کو کرتا۔ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کے حکمِ تکوینی (Natural Law) کی اطاعت کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اسی کے حکمِ شرعی (Moral Law) کی اطاعت بھی کرتا۔ اگر یہ ترقی اس نے کی تو بے شک یہ حیوانات اور تمام موجودات پر شرف لے گیا، اس نے بالفعل وہ خلافت حاصل کر لی جس کی قوت و استعداد اس کو دی گئی تھی، اس نے تمام موجودات سے بڑھ کر اپنے خالق کی بندگی و عبادت کی، اس لیے تمام موجوداتِ عالم سے زیادہ اجر کا مستحق ہو گیا۔ لیکن اگر یہ ترقی اس نے نہ کی اور آلۂ ترقی کے غلط استعمال سے اُلٹا تنزل کی پستیوں میں اُتر گیا تو بلا شائبۂ شک و ریب تمام اسافل سے اسفل اور تمام اراذل سے ارذل بن گیا ۔۔

اس نے خود اپنی حماقت سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنایا[1]۔ یہی حقیقت ہے جس کو سورۂ تین میں بیان کیا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ، ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ۔ (التین: ۴)

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو تمام ادنیٰ درجہ والوں سے بھی ادنیٰ درجہ میں پھیر دیا بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کے لیے بے نہایت اجر ہے۔

یہ اجمال ان تفصیلات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ "بہترین ساخت" سے مراد ترقی کی وہ قوت و استعداد ہے جو انسان کو زمین کی تمام مخلوقات سے بڑھ کر دی گئی ہے۔ مگر محض بہترین ساخت پر ہونا بالفعل ترقی نہیں ہے۔ ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ انسان اس قوت و استعداد سے کام لیکر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے جس کے انتہائی مرتبے کا نام "ایمان" ہے اور اس کے حکم شرعی کے تحت دنیا میں کام کرے جس کو "عملِ صالح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس نے یہ نہ کیا وہ ادنیٰ درجہ کی مخلوقات سے بھی فروتر درجہ میں گر گیا۔ اور جس نے یہ ترقی کر لی وہ "اجر غیر ممنون" کا مستحق ہو گیا۔ یعنی ایسا اجر جو کبھی بند ہونے والا نہیں ہے، جو دنیا کی اس زندگی سے لیکر آخرت کی زندگی تک بلا نہایت چلتا ہے۔ بندگیٔ اضطراری کے صلہ میں جو اجر ملتا ہے وہ تو منقطع ہو جاتا ہے بس ایک اجل مقرر تک ہی زندگی عطا کی جاتی ہے اور ایک حد

---

[1] یہ بحث نہایت غور و تامل کی مستحق ہے۔ اس مسئلے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے وہ خدا کے قانون طبیعی یا حکم تکوینی کی اطاعت ہی کو اصل عبادت سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اس عبادت کا حق ادا کر دے وہی عابد اور صالح اور ان تمام وعدوں کا مستحق ہے جو قرآن میں صالحین سے کیے گئے ہیں۔ حالانکہ انسان سے جو عبادت مطلوب ہے وہ محض حکم تکوینی کی اطاعت ہی نہیں بلکہ حکم شرعی کی اطاعت بھی ہے۔

خاص تک ہی رزق دیا جاتا ہے۔ مگر عبادت اختیاری کے صلہ میں وہ عیش نصیب ہوتا ہے جو خلل سے پاک ہے، وہ رزق میسّر آتا ہے جس کے بند ہونے کا کوئی خوف نہیں۔

عبادت کا پورا مفہوم | اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں عبادت کا صحیح اور مکمل مفہوم واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوچکا ہے کہ عبادت کے اجزائے معنوی دو ہیں جن کی ترکیب سے عبادت کا مفہوم مکمل ہوتا ہے، ایک بندگی یعنی قانونِ فطرت کی ٹھیک ٹھیک پیروی اور اس سے منحرف نہ ہونا۔ دوسرے پرستش جو اپنی تکمیل کے لیے دو چیزوں کی محتاج ہے۔

(۱) اپنے حقیقی معبود یعنی خدائے واحد کی ایسی معرفت جو بالکل خالص ہو، جس میں شرک کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں کفر و انکار اور شک و ریب کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہو۔ جس میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، کسی کے انعام کی طمع نہ ہو، کسی پر اعتماد و توکل نہ ہو۔ کسی کی طرف الوہیت و ربوبیت کو منسوب نہ کیا جائے، کسی کو نافع و ضارّ نہ سمجھا جائے، کسی سے عبدیت کا تعلق وابستہ نہ کیا جائے۔ اسی کا نام "ایمان" ہے۔

(۲) اپنی زندگی کے اختیاری شعبہ میں اس معبود کے حکم شرعی کی اسی طرح اطاعت کرنا جس طرح اضطراری شعبہ میں اس کے حکم تکوینی کی اطاعت کی جاتی ہے تاکہ ساری زندگی ایک ہی فرمانروا، ایک ہی حکومت اور ایک ہی قانون کی تابع فرمان ہو کر ہم رنگ وہم آہنگ ہوجائے اور اس میں کسی حیثیت سے بھی دو رنگی اور ناہمواری باقی نہ رہے۔ اسی کو "عملِ صالح" کہتے ہیں۔

غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ یہ عبادت صرف تسبیح و مصلّٰی اور خانقاہ تک محدود ہے۔ مومن صالح صرف اسی وقت اللہ کا عبادت گزار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے، اور بارہ مہینوں میں ایک مہینہ کے روزے رکھتا ہے اور سال میں ایک وقت زکوٰۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے۔ جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا؟ جب

وہ معاملات میں ظلم اور جھوٹ اور دغا سے پرہیز کرکے انصاف اور راستبازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں ہے ؟ جب وہ خلق خدا کی خدمت اور حقداروں کی حق رسانی کے لیے کمربستہ ہوتا ہے تو کیا اس کی ہر حرکت عین عبادت نہیں ہوتی ؟ جب وہ اپنے افعال و اقوال میں خدا کے قانون کی پیروی کرتا اور اس کی حدود کا لحاظ رکھتا ہے تو کیا اس کا ہر قول و فعل عبادت میں شمار نہ ہوگا ؟ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو کام بھی کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے، حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے۔

مگر یہ عبادت کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اس عبادت کی مثال ایسی ہے جیسے رعیت کے عام افراد اپنے بادشاہ کے قانون کی پیروی اور اس کے فرامین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے بڑا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مالک کا نوکر بن جاتے اور اس کے قوانین کی نہ صرف خود پیروی کرے بلکہ دوسروں پر بھی ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرے، اس کے احکام پر نہ صرف خود عامل ہو بلکہ دنیا میں ان کے اجرا کے لیے بھی جد و جہد کرے، اس کی حکومت میں نہ صرف خود امن اور وفاداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ رہے بلکہ اپنے دل و دماغ اور دست و بازو کی قوتیں امن کے قیام میں، بگڑی ہوئی رعایا کی اصلاح میں اور باغی و سرکش بندوں کی سرکوبی میں بھی صرف کرے اور اس خدمت میں اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کر دے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳)	اور اس طرح ہم نے تم کو اقوام عالم کے درمیان ایک بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو[1] اور رسول تم پر گواہ ہو۔

---

[1] یعنی اپنی زبان سے، اخلاق سے، کردار سے، اپنی زندگی کے پورے رویہ سے اور پھر اپنی قربانیوں سے، محنتوں سے، کوششوں سے اور جانفشانیوں سے اسلام کی صداقت پر گواہی دو۔ ایک طرف ساری دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اسلام کا مظاہرہ بھی کرو اور دوسری طرف اسلام کی راہ میں جانفشانی کرکے یہ بھی ثابت کر دو کہ تم واقعی اس دین پر ایمان لائے ہو، اور تمہارے نزدیک یہ ایسی صداقت ہے جس پر تن من دھن سب کچھ نثار کیا جا سکتا ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ۔ (الحج: ۷۸)

اسی نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی تاکہ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے رستے پر جمے رہو۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج: ۴۱)

وہ جن کو اگر ہم زمین میں طاقت بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

یہ ہے اس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے اور دنیا کے معاملات سے اس کو کچھ سروکار نہیں، حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور ذکر و تسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے مستعد کرنے والی تمرینات (Training Courses) ہیں جو انسان کی زندگی کو حیوانی زندگی کے ادنیٰ مقام سے اٹھا کر انسانی زندگی کے بلند ترین مقام پر لے جاتی ہیں، اس کو اضطرار و اختیار دونوں میں اپنے مالک کا مطیع و فرمانبردار بندہ بنا دیتی ہیں، اور اسے بادشاہ حقیقی کی سلطنت کا ایسا ملازم بناتی ہیں کہ اس کی خدمت وہ اپنے جسم و جان کی ساری قوتوں کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں کرتا ہے۔ جب انسان عبادت سے اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو وہ شرف حاصل ہوتا ہے جس میں کائنات کی کوئی مخلوق اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ملائکہ تک اس کے مقام سے فروتر ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اس کو خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت نہیں دی جاتی۔ اس کی گردن میں خدا کی غلامی کے سوا کسی کی غلامی کا طوق نہیں ہوتا۔ اس کے پاؤں میں خدا کی زنجیر کے سوا کسی کی زنجیر نہیں ہوتی۔ اس کا سر خدا کے حکم کے سوا کسی کے حکم کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ خدا کا غلام اور سب کا آقا ہوتا ہے۔ وہ خدا کا محکوم اور سب کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے اس کی

زمین پر حکومت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ فرعون و نمرود کی طرح باغی اور غاصب نہیں ہوتا بلکہ شاہی فرمان سے زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے اور حق کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا۔ (النور: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین میں خلیفہ بنائیگا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو بنا چکا ہے اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی کے ساتھ قائم کریگا۔ اور بالیقین ان کی حالت خوف کو امن سے بدل دیگا پس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

یہ تو دنیا کا انعام ہے۔ اور آخرت کا انعام کیا ہے؟ یہ کہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ (النور: ۵۲)

اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اور اللہ سے ڈرا اور اس کے غضب سے بچا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ (النور: ۳۸)

وہ لوگ جن کو کوئی تجارت اور کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی، جو ڈرتے ہیں اس دن سے جب دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پھر جائیں گی۔ ان کو امید ہے کہ اللہ ان کے اعمال کا بہتر سے بہتر بدلہ دیگا اور اپنے فضل سے اس پر مزید اضافہ کریگا۔

عبادت کا غلط مفہوم | افسوس کہ عبادت کے اس صحیح اور حقیقی مفہوم کو مسلمان بھول گئے۔ انہوں نے چند مخصوص اعمال کا نام عبادت رکھ لیا اور سمجھے کہ بس انہی اعمال کو انجام دینا عبادت ہے اور انہی کو انجام دے کر عبادت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس عظیم الشان غلط فہمی نے عوام اور خواص دونوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ عوام نے اپنے اوقات میں سے چند لمحے خدا کی عبادت کے لیے مختص کر کے باقی تمام اوقات کو اس سے آزاد کر لیا۔ قانونِ الٰہی کی دفعات میں سے ایک ایک دفعہ کی خلاف ورزی کی، حدود اللہ میں سے ایک ایک حد کو توڑا، جھوٹ بولے، غیبت کی، بدعہدیاں کیں، حرام کے مال کھاتے، حق داروں کے حق مارے، کمزوروں پر ظلم کیا، نفس کی بندگی میں دل، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سب کو نافرمانی کے لیے وقف کر دیا، مگر پانچ وقت کی نماز پڑھ لی، زبان اور حلق کی حد تک قرآن کی تلاوت کر لی، سال میں مہینہ بھر کے روزے رکھ لیے، اپنے مال میں سے کچھ خیرات کر دی، ایک مرتبہ حج بھی کر آئے اور سمجھے کہ ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں۔ کیا اسی کا نام خدا کی عبادت ہے؟ کہ اس کے سجدے سے سر اٹھاتے ہی ہر معبود باطل کے آگے جھک جاؤ، اس کے سوا ہر زندہ اور مُردہ کو حاجت روا بناؤ، ہر اس بندے کو خدا بنا لو جس میں تم کو نقصان پہنچانے یا نفع دینے کی ذرہ برابر بھی قوت نظر آتے، روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے کفار و مشرکین تک کے آگے ہاتھ جوڑو اور ان کے پاؤں چومو، انہی کو رازق سمجھو، انہی کو عزت اور ذلت دینے والا سمجھو، انہی کے قانون کو قانون سمجھو اس لیے کہ وہ طاقت رکھتے ہیں اور خدا کے قانون کو بے تکلف توڑ دو اس لیے کہ تمہارے زعم باطل میں وہ اپنے قانون کو نافذ کرنے کی قوت نہیں رکھتا، کیا یہی تمہارا اسلام ہے؟ یہی تمہارے ایمان کی شان ہے؟ اسی پر تمہیں گمان ہے کہ تم خدا کی عبادت کرتے ہو؟ اگر یہی اسلام اور ایمان ہے اور یہی اللہ کی عبادت ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے تم کو دنیا میں ذلیل و خوار کر رکھا ہے؟ کیا چیز ہے جو تم سے خدا کے سوا ہر در کی گدائی کرا رہی ہے؟ کس چیز نے تمہاری گردنوں میں غلامی اور ذلت کے طوق ڈال

رکھے ہیں؟

خواص نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ تسبیح و مصلّٰی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے۔ خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں، دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے۔ حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھائی جا رہی ہے، خدا کی زمین پر ظالموں اور باغیوں کا قبضہ ہو رہا ہے، الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کرائی جا رہی ہے، مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں، تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں، ہُو حق کے نعرے لگا رہے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں مگر محض ثواب تلاوت کی خاطر حدیث پڑھتے ہیں مگر صرف تبرکاً، سیرتِ پاک اور اسوۂ صحابہ پر وعظ فرماتے ہیں مگر قصہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں، دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ ان کو قرآن میں ملتا ہے، نہ حدیث میں، نہ سیرتِ پاک میں، نہ اسوۂ صحابہ میں، کیا یہ عبادت ہے؟ کیا یہی عبادت ہے کہ بدی کا طوفان تمہارے سامنے اٹھ رہا ہو اور تم آنکھیں بند کیے ہوئے مراقبہ میں مشغول رہو؟ کیا عبادت اسی کو کہتے ہیں کہ گمراہی کا سیلاب تمہارے حجرہ کی دیواروں سے ٹکرا رہا ہو اور تم دروازہ بند کر کے نفل پر نفل پڑھے جاؤ؟ کیا عبادت اسی کا نام ہے کہ کفار چار دانگ عالم میں شیطانی فتوحات کے ڈنکے بجاتے پھریں، دنیا میں انھیں کا علم پھیلے، انہی کی حکومت کارفرما ہو، انہی کا قانون رواج پائے۔ انہی کی تلوار چلے، انہی کے آگے بندگانِ خدا کی گردنیں جھکیں اور تم خدا کی زمین اور خدا کی مخلوق کو ان کے لیے چھوڑ کر نمازیں پڑھنے روزے رکھنے اور ذکر و شغل کرنے میں منہمک ہو جاؤ؟ اگر عبادت یہی ہے جو تم کر رہے ہو، اور اللہ کی عبادت کا حق اسی طرح ادا ہوتا ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ عبادت تم کرو اور زمین کی حکومت و فرمانروائی دوسروں کو ملے؟ کیا معاذ اللہ خدا کا وہ وعدہ جھوٹا ہے جو اس نے قرآن میں تم سے کیا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ

وَلَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (النور:۵۵) اگر خدا اپنے وعدے میں سچا ہے، اور اگر یہ واقعہ ہے کہ تمہاری اس عبادت کے باوجود نہ تم کو زمین کی خلافت حاصل ہے، نہ تمہارے دین کو تمکن نصیب ہے، نہ تم کو خوف کے بدلے میں امن میسر آتا ہے، تو تم کو سمجھنا چاہیے کہ تم اور تمہاری ساری قوم عبادت گزار نہیں بلکہ تارکِ عبادت ہے اور اسی ترکِ عبادت کا وبال ہے، جس نے تم کو دنیا میں ذلیل کر رکھا ہے۔

(ترجمان القرآن" ربیع الثانی ۵۴ھ جولائی ۳۵ء)

جہاد فی سبیل اللہ

عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy War) "مقدس جنگ" کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوشِ جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے۔ ڈاڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آرہا ہے، جہاں کسی کافر کو پاتا ہے پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الٰہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جُدا کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلمکاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ

بُو تے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لُطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ (UNHOLY WAR) میں مشغول ہیں۔ ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ دولت و اقتدار کے بھُوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں، خام پیداوار کے ذخیرے، نوآبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنے نفس کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لیے ایندھن فراہم کریں ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے، ہوس اور نفسِ امارہ کی راہ میں ہے۔ ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لیے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ

اس کی زمین میں کانیں ہیں، یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں، یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جا سکتا ہے، یا اپنی زائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جا سکتا ہے، یا اور کچھ نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستہ میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کر چکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانہ ماضی کا قصہ ہے، اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرض کرۂ زمین کا کونسا حصہ ایسا بچارہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہو چکا؟ مگر ان کی مہارت قابلِ داد ہے۔ انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی۔ اور ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوّروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں، ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پُرامن مبلغ لوگ ہیں، چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد تسلیم کرا لینا، بس یہ ہمارا کام ہے، ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا۔ سو اب ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں۔ حضور کی طمانیت کے لیے تلوار والے جہاد کو "سرکاری طور پر" منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام۔

جہاد کے متعلق غلط فہمی کے اسباب خیر یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے "جہاد فی سبیل اللّٰہ" کی کوشش کو سمجھنا غیر مسلموں اور خود مسلمانوں کے لیے دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے:-

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں محض ایک مذہب سمجھا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلہ کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشہ کو بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور چند عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہی ہونا چاہیے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں، اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو اس کو جس طرح چاہیں پکاریں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کے لیے موجود ہے تو آپ دنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھریئے، اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجیے۔ اس کے لیے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کونسا موقع ہے؟ کیا آپ لوگوں کو مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک "مذہب" قرار دے لیں، اور یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لیے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح قوم کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہ اشخاص (Homogeneous Group of Men) کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہو۔ اس معنی میں جو گروہ ایک قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے۔ یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کے لیے کوئی اس پر حملہ کرے، یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لیے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لیے کچھ نہ کچھ

اخلاقی جواز موجود بھی ہے (اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے) لیکن دوسری صورت کو تو بعض ڈکٹیٹروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی اس کو جائز کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

جہاد کی حقیقت | پس اگر اسلام ایک "مذہب" اور مسلمان ایک "قوم" ہے تو جہاد کی ساری معنویت جس کی بنا پر اسے افضل العبادات کہا گیا ہے، سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی "مذہب" کا اور مسلمان کسی "قوم" کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم (Social Order) کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جمعیت (International Revolutionary Party) کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے، اور جہاد اس انقلابی جدوجہد (Revolutionary Struggle) اس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عمل میں لائی جائے۔

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی زبان (Terminology) اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں۔ لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ (War) کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، قصداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ "جہاد" کا لفظ استعمال کیا جو (Struggle) کا ہم معنی ہے بلکہ اس سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

("To exert one's utmost Endavour in furthering a cause")

"اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا۔"

سوال یہ ہے کہ پُرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "جنگ" کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی ان لڑائیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہوتا رہا ہے، جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان لڑائیوں کے مقاصد محض ایسے شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نظریہ اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں ہے اس لیے وہ سرے سے اس لفظ کو ہی ترک کر دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا نقصان نہیں ہے۔ وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے یا دوسری سلطنت کا۔ اس کو دلچسپی جس چیز سے ہے وہ محض انسانیت کی فلاح ہے۔ اس فلاح کے لیے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے۔ اس نظریہ اور مسلک کے خلاف جہاں جس چیز کی حکومت بھی ہے اسلام اس کو مٹانا چاہتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی قوم ہو اور کوئی ملک ہو۔ اس کا مدعا اپنے نظریہ اور مسلک کی حکومت قائم کرنا ہے بلالحاظ اس کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اُٹھتا ہے اور کس کی حکمرانی پر اس کی ضرب پڑتی ہے۔ وہ زمین مانگتا ہے —— زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ پُورا کرۂ زمین —— اس لیے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر زمین کی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آجائے، بلکہ صرف اس لیے کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے اس سے تمام نوعِ انسانی متمتع ہو۔ اس غرض کے لیے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لیے کارگر ہو سکتی ہیں اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام "جہاد" رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ تلوار کے زور سے پُرانے ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

فی سبیل اللہ کی لازمی قید | لیکن اسلام کا جہاد نرا "جہاد" نہیں ہے بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ"

ہے اور "فی سبیل اللہ" کی قید اس کے ساتھ ایک لازمی قید ہے۔ یہ "فی سبیل اللہ" کا لفظ بھی اسلام کی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "راہ خدا میں"۔ اس ترجمہ سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا "جہاد فی سبیل اللہ" ہے، کیونکہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں "راہِ خدا" کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں سما سکتا مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے کیا جائے اور جس کے کرنے والے کا مقصد اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو، بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو، اسلام ایسے کام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیتا ہے مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں اس نیت سے کہ اسی دنیا میں مادی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ آپ کی طرف پلٹ کر آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کر کے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے۔ پس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے نیک کاموں کے لیے جو کامل خلوص کے ساتھ ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر اس نظریہ پر کیے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لیے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے اور انسان کی زندگی کا نصب العین مالکِ کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

"جہاد" کے لیے بھی "فی سبیل اللہ" کی قید اسی غرض کے لیے لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظامِ حکومت میں انقلاب برپا کرنے اور اسلامی نظریہ کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لیے جدوجہد کرنے اُٹھے، تو اس قیام اور اس سربازی و جاں نثاری میں اس کی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہونی چاہیے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ قیصر کو ہٹا کر خود قیصر بن جائے، اپنی ذات کے لیے مال و دولت یا شہرت و ناموری یا عزت و جاہ حاصل کرنے کا شائبہ تک اس کی جدوجہد کے مقاصد میں شامل نہ ہونا چاہیے۔ اس کی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہونا چاہیے کہ بندگانِ خدا کے درمیان

ایک عادلانہ نظامِ زندگی قائم کیا جائے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا اور کچھ اس کو مطلوب نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء: ۷۶)

"ایماندار لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں"۔

طاغوت کا مصدر طغیان ہے جس کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں۔ دریا جب اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں طغیانی آگئی ہے۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گزر کر اس غرض کے لیے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصہ سے زیادہ فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں راہِ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانونِ عدل دنیا میں قائم ہو، لڑنے والا خود بھی اس کی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُہَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ (القصص: ۸۳)

آخرت میں عزت کا مقام ہم نے ان لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ اور عاقبت کی کامیابی تو خدا ترس لوگوں کے لیے ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "راہِ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لیے جنگ کرتا ہے۔ دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اس لیے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟" آنحضرت نے جواب دیا۔ کسی کی بھی نہیں۔ فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے

کی ایک رتی حاصل کرنے کی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہو گیا۔" اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لیے ہو، کسی شخصی یا جماعتی غرض کے لیے نہ ہو۔ پس جہاد کے لیے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جاندار کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے۔ لیکن "مسلمان" جس انقلابی جماعت کا نام ہے اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان و مال کھپاؤ، دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو، اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کر دو، نہ اس لیے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم ان کی جگہ لے لو، بلکہ صرف اس لیے کہ دنیا سے سرکشی و طغیان مٹ جائے اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو۔

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی اصلی معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد اس دعوتِ انقلاب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لیے جہاد کی حاجت کیا ہے اور اس کی غایت (Objective) کیا ہے۔

اسلام کی دعوتِ انقلاب اسلام کی دعوتِ انقلاب کا خلاصہ یہ ہے:-

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ	"اے انسانو! صرف اپنے اس رب کی
الَّذِیْ خَلَقَکُمْ۔ (البقرہ: ۲۱)	بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اسلام مزدوروں، یا زمینداروں یا کاشتکاروں یا کارخانہ داروں کو نہیں پکارتا بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے۔ اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے اور وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی، اطاعت، فرمانبرداری کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو، اور اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی نکال دو کہ

لے یہ ایک اور مقام ہے جہاں لوگوں نے عظیم الشان ٹھوکر کھائی ہے۔ انہوں نے مجرد جہاد اور جہاد فی سبیل اللہ کے فرق کو نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے قومی استعلاد و استکبار کی کوشش اور اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش میں کوئی وجہِ امتیاز باقی نہ رہی۔

دوسروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنی چاہیے اور اس بندگی میں سب کو ایک سطح پر آجانا چاہیے۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران: ۶۴)

آؤ ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور خداوندی میں کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امر و نہی کا مالک بھی نہ بنائے۔

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پکار کر کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے" کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذاتِ خود انسانوں کا حکمراں بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک سمجھنا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور یہی بنائے فساد ہے۔ اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جائیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کر دیں۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لے کر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں اور دوسری طرف اسی خدا فراموشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ ان طاقتوروں کی خداوندی مان لیتا ہے اور ان کے اس حق کو تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ حکم کریں اور وہ اس حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہی دنیا میں ظلم و فساد اور ناجائز انتفاع (Exploitation) کی بنیاد ہے، اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے۔ وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:

لَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ۔ (الشعراء: ۱۵۱، ۱۵۲)

ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی حد جائز سے گزر گئے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

لَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا۔ (الکہف: ۲۸)

اُس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشاتِ نفس کا بندہ بن گیا ہے اور جس کا کام افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا۔ (الاعراف: ۴۴، ۴۵)

خدا کی لعنت ہو اُن ظالموں پر جو خدا کے بنائے ہوئے زندگی کے سیدھے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ؟ یہ بہت سے چھوٹے بڑے خدا جن کی بندگی میں تم پسے جا رہے ہو ان کی بندگی قبول ہے، یا اس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کرو گے تو ان چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی، یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پائیں گے، اور فساد برپا کر کے رہیں گے:-

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ۔ (النمل: ۳۴)

یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظامِ حیات کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی وتیرہ ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرہ: ۲۰۵)

اور جب وہ اقتدار پالیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے، کھیتوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں پوری تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت توحید وخدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی جس میں اور دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ حقیقت میں یہ ایک اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلا واسطہ ان طبقوں پر پڑتی ہے جنہوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر، یا سیاسی رنگ میں بادشاہ اور رئیس اور حکمران گروہ بن کر، یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ یہ کہیں علانیہ اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنے ہوتے تھے، دنیا سے اپنے پیدائشی، استحقاقی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی اور اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً۔ اور کسی جگہ انہوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استعمال ——— کرنے کے لیے بتوں اور ہیکلوں کی شکل میں مصنوعی خدا بنا رکھے تھے جن کی آڑ میں کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگانِ خدا سے تسلیم کراتے تھے۔ پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت، اور خدائے واحد کی بندگی و معبودیت کے لیے اسلام کی تبلیغ براہِ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبی نے یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ کی صدا بلند کی، حکومتِ وقت فوراً اس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوتی اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے، کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ (Metaphysical Proposition) کا بیان نہ تھا، بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا، اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی۔

اسلامی دعوتِ انقلاب کی خصوصیت اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی لیڈر رہتے، اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر ہیں لیکن جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابی لیڈروں کے درمیان

واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی لوگ خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں، عدل اور توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے۔ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اُٹھتے ہیں، یا اُن کی حمایت کا جذبہ لے کر اُٹھتے ہیں، اور پھر سارے معاملات کو انہی طبقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر غیر جانبدارانہ اور خالص انسانیت کی نظر نہیں ہوتی بلکہ ایک طبقہ کی طرف غصہ و نفرت کا اور دوسرے طبقہ کی طرف حمایت کا جذبہ لیے ہوتے ہوتی ہے۔ وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً ایک جوابی ظلم ہوتا ہے۔ ان کے لیے انتقام جذ اور عداوت کے جذبات سے پاک ہو کر ایک ایسا معتدل اور متوازن اجتماعی نظام تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا جس میں مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح ہو۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے گئے ہوں اور کتنا ہی ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا گیا ہو، ان کی انقلابی تحریک میں کبھی ان کے شخصی جذبات کا اثر آنے نہیں پایا۔ وہ براہِ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے تھے، اور خدا چونکہ انسانی جذبات سے منزّہ ہے، کسی انسانی طبقہ سے اس کا مخصوص رشتہ نہیں، نہ کسی دوسرے انسانی طبقہ سے اس کو کوئی شکایت یا عداوت ہے، اس لیے خدا کی ہدایت کے تحت انبیاء علیہم السلام تمام معاملات کو بے لاگ انصاف کے ساتھ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ تمام انسانوں کی مجموعی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے اور کس طرح ایک ایسا نظام بنایا جائے جس میں ہر شخص اپنی جائز حدود کے اندر رہ سکے، اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو سکے، اور افراد کے باہمی روابط، نیز فرد اور جماعت کے باہمی تعلق میں کامل توازن قائم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی تحریک کبھی طبقاتی نزاع (Class War) میں تبدیل نہ ہونے پائی۔ انہوں نے اجتماعی تعمیرِ نو (Social Reconstruction) اس طرز پر نہیں کی کہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر مسلط کر دیں، بلکہ اس کے لیے عدل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں تمام انسانوں کے لیے ترقی اور مادی و روحانی سعادت کے یکساں امکانات رکھے گئے تھے۔

جہاد کی ضرورت اور اس کی غایت | اس مختصر مقالہ میں میرے لیے اس اجتماعی نظام (Social Order) کی تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ تفصیل کا موقعہ انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔ یہاں اپنے موضوع کی حد میں رہتے ہوئے جس بات کو مجھے واضح کرنا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور ان کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر سمجھتا ہے۔

اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لیے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ خود ان ظالم طبقوں اور ناجائز انتفاع کرنے والے گروہوں، حتیٰ کہ بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی پکارتا ہے کہ آؤ اس جائز حد کے اندر رہنا قبول کر لو جو تمہارے خالق نے تمہارے لیے مقرر کی ہے۔ اگر تم عدل اور حق کے نظام کو قبول کر لو گے تو تمہارے لیے امن اور سلامتی ہے۔ یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے، بلکہ دشمنی جو کچھ بھی ہے ظلم سے ہے، فساد سے ہے، بداخلاقی سے ہے، اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہے جو فطرت اللہ کے لحاظ سے اس کا نہیں ہے۔

یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کر لیں وہ خواہ کسی طبقہ، کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں، یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں، اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن "حزب اللہ" کے نام سے یاد کرتا ہے، اور جس کا دوسرا نام "اسلامی جماعت" یا "امتِ مسلمہ" ہے۔

یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصدِ وجود کی تحصیل کے لیے جہاد شروع کر دیتی ہے۔ اس کے عین وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو

مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے مقابلہ میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع لفظ "کلمۃ اللہ" سے تعبیر کرتا ہے اگر یہ پارٹی حکومت کو بدلنے اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ یہ کسی اور مقصد کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہے، اور اس جہاد کے سوا اس کی ہستی کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔ قرآن اس کی پیدائش کا ایک ہی مقصد بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں ہے بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) (البقرہ: ۱۴۳) اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے، أَرْبَابٌ مِّنْ دُونِ اللَّهِ کی خدائی کو ختم کر دے، اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ: ۱۹۳)[1] إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ[2] — هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔[3] لہٰذا اس پارٹی کے لیے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کیے بغیر کوئی چارہ

---

[1] "ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت صرف خدا کے لیے ہو جائے۔"

[2] "اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ ہوگا اور بڑا فساد برپا رہے گا۔"

[3] "وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح ضابطہ دیکر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں کو مٹا کر اسی ایک اطاعت کو سب پر غالب کر دے خواہ وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں جو خداوندی میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔"

نہیں ہے، کیونکہ مُفسدانہ نظامِ تمدّن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے اور ایک صالح نظامِ تمدّن اس وقت تک کسی طرح قائم ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت مُفسدین سے مسلوب ہو کر مُصلحین کے ہاتھ میں نہ آجائے۔

دُنیا کی اصلاح سے قطعِ نظر اس جماعت کے لیے خود اپنے مسلک پر عامل ہونا بھی غیر ممکن ہے اگر حکومت کا نظام کسی دوسرے مسلک پر قائم ہو۔ کوئی پارٹی جو کسی سسٹم کو برحق سمجھتی ہو کسی دوسرے سسٹم کی حکومت میں اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ایک اشتراکی مسلک کا آدمی اگر انگلستان یا امریکہ میں رہ کر اشتراکیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے تو کسی طرح اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا ضابطۂ حیات حکومت کی طاقت سے بجبر اس پر مسلّط ہو گا اور وہ اس کی قہرمانی سے کسی طرح بچ نہ سکے گا۔ اسی طور پر ایک مسلمان بھی اگر کسی غیر اسلامی حکومت میں رہ کر اسلامی اصول پر زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کا کامیاب ہونا بھی محال ہے۔ جن قوانین کو وہ باطل سمجھتا ہے، جن ٹیکسوں کو وہ حرام سمجھتا ہے، جن معاملات کو وہ ناجائز سمجھتا ہے، جس طرزِ زندگی کو وہ فاسد سمجھتا ہے، جس طریقِ تعلیم کو وہ مہلک سمجھتا ہے وہ سب کے سب اس پر، اس کے گھر بار پر، اس کی اولاد پر اس طرح مسلّط ہو جائیں گے کہ وہ کسی طرح ان کی گرفت سے بچ کر نہ نکل سکے گا۔ لہٰذا جو شخص یا گروہ کسی مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اپنے اعتقاد کے فطری اقتضاء ہی سے اس امر پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلکِ مخالف کی حکومت کو مٹانے اور خود اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے مسلک پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس کوشش سے غفلت برتتا ہے تو اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت اپنے عقائد ہی میں جھوٹا ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ	"اے نبی! خدا تمہیں معاف کرے تم نے
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	ان لوگوں کو جہاد کی شرکت سے علیحدہ رہنے
وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ لَا يَسْتَاْذِنُكَ	کی اجازت کیوں دے دی؟ حالانکہ جہاد ہی

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاہِدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ وَاَنْفُسِہِمْ۔ ۔۔۔ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (التوبہ: ۴۴تا۴۵)

وہ کسوٹی ہے جس سے تم پرکھ سکتے ہو کہ اپنے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون، جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی درخواست صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم آخر پر۔"

ان الفاظ میں قرآن نے صاف اور صریح فتویٰ دے دیا ہے کہ اپنے اعتقاد (Convictions) میں کسی جماعت کے صادق ہونے کا واحد معیار یہی ہے کہ وہ جس مسلک پر اعتقاد رکھتی ہو اس کو حکمران بنانے کے لیئے جان و مال سے جہاد کرے۔ اگر تم اپنے اوپر مسلک مخالف کی حکومت کو گوارا کرتے ہو تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تم اپنے اعتقاد میں جھوٹے ہو، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہے، اور یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار اسلام کے مسلک پر تمہارا نام نہاد عقیدہ بھی باقی نہ رہے گا۔ ابتداء میں تم مسلکِ مخالف کی حکومت کو بکراہت گوارا کرو گے، پھر رفتہ رفتہ تمہارے دل اس سے مانوس ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ کراہت رغبت سے بدل جائے گی، اور آخر میں نوبت اس حد تک پہنچے گی کہ مسلکِ مخالف کی حکومت قائم ہونے اور قائم رہنے میں تم خود مددگار ہو گے، اپنی جان و مال سے جہاد اس لیے کرو گے کہ مسلک اسلام کے بجائے مسلکِ غیر اسلام قائم ہو یا قائم رہے، تمہاری اپنی طاقتیں مسلکِ اسلام کے قیام کی مزاحمت میں صرف ہونے لگیں گی، اور یہاں پہنچ کر تم میں اور کافروں میں اسلام کے منافقانہ دعویٰ، ایک بدترین جھوٹ، ایک پُرفریب نام کے سوا کوئی فرق نہ رہے گا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نتیجہ کو صاف صاف بیان فرما دیا ہے:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَاْمُرُنَّ

اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان

بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ يَدَ الْمُسِيْءِ وَلَتَأْطِرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ اِطْرَاءً اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اَوْ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

ہے، یا تو تمہیں ایسا کرنا پڑیگا کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف بزور موڑ دو، یا پھر اللہ کے قانون فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا کہ بدکاروں کے دلوں کا اثر تمہارے دلوں پر بھی پڑ جائے اور ان کی طرح تم بھی ملعون ہو کر رہو۔

عالمگیر انقلاب اس بحث سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔

اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظامِ حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب (World Revolution) کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لے کر اٹھا ہو، اپنے انقلابی مطمح نظر کو کبھی ایک ملک یا ایک قوم کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضاء ہی سے مجبور ہے کہ عالمگیر انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ حق جغرافی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اگر کسی دریا یا پہاڑ کے اس پار بھی حق ہی ہوں تو اس پار بھی حق ہی ہوں۔ نوعِ انسانی کے کسی حصہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختہ مشق بنا ہوا ہے وہاں اس کی مدد کے لیے پہنچنا میرا فرض ہے۔ اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جنہیں کمزور پا کر دبا لیا گیا ہے اور جو دعائیں

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (النساء: ۷۵) مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے کارفرما ظالم ہیں۔

علاوہ بریں قومی و ملکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پُوری طرح عمل نہیں کرسکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہوجائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لیے اصلاحِ عمومی اور تحفظِ خودی، دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں، اس نظام کو تمام اطرافِ عالم میں وسیع کرنے کی کوشش کرے وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دیگی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لیے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کریگی۔

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب، جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی، سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیرنگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی، مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کردیا۔ آنحضرت کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کردیا اور پھر حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ مصر و شام اور روم و ایران کے عوام اوّل اوّل اس کو عرب کی امپیریلسٹ پالیسی سمجھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ جس طرح پہلے ایک قوم دوسری قوموں کو غلام بنانے کے لیے نکلا کرتی تھی اسی طرح اب بھی ایک قوم اسی غرض کے لیے نکلی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر لوگ قیصر و کسریٰ کے جھنڈے

تلے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے۔ مگر جب ان پر مسلم پارٹی کے انقلابی مسلک کا حال کھلا، جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ جفاکارانہ قوم پرستی (Aggressive Nationalism) کے علمبردار نہیں ہیں بلکہ قومی اغراض سے پاک ہیں اور محض ایک عادلانہ نظام قائم کرنے آئے ہیں، اور ان کا مقصد ان ظالم طبقوں کی خداوندی کو ختم کرنا ہے جو قیصریت وکسرویت کی پناہ میں ہم کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، تو ان کی اخلاقی ہمدردیاں مسلم پارٹی کی طرف جھک گئیں، وہ قیصر وکسریٰ کے جھنڈے سے الگ ہوتے چلے گئے اور اگر مارے باندھے سے فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے آئے بھی تو بے دلی سے لڑے۔ یہی سبب ہے اُن حیرت انگیز فتوحات کا جو ابتدائی دَور میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، اور یہی سبب ہے اس کا کہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد جب ان ممالک کے باشندوں نے اسلامی نظامِ اجتماعی کو عملاً کام کرتے ہوئے دیکھا تو وہ خود فوج در فوج اس بین الاقوامی پارٹی میں شریک ہوتے چلے گئے اور خود اس مسلک کے علمبردار بن کر آگے بڑھے تاکہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کو پھیلا دیں۔

جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم غیر متعلق ہے | یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر جب آپ غور کریں گے تو یہ بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آجائے گی کہ جنگ کی جو تقسیم جارحانہ (Offensive) اور مدافعانہ (Deffensive) کی اصطلاحوں میں کی گئی ہے اس کا اطلاق سرے سے اسلامی جہاد پر ہوتا ہی نہیں۔ یہ تقسیم صرف قومی اور ملکی لڑائیوں پر ہی منطبق ہو سکتی ہے کیونکہ اصطلاحاً "حملہ" اور "مدافعت" کے الفاظ ایک ملک یا ایک قوم کی نسبت سے ہی بولے جاتے ہیں۔ مگر جب ایک بین الاقوامی پارٹی ایک جہانی نظریہ ومسلک کو لے کر اُٹھے، اور تمام قوموں کو انسانی حیثیت سے اس مسلک کی طرف بلاتے اور ہر قوم کے آدمیوں کو مساویانہ حیثیت سے اپنی پارٹی میں شریک کرے، اور محض مسلکِ مخالف کی حکومت کو مٹا کر اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے، تو ایسی حالت میں اصطلاحی حملہ اور اصطلاحی مدافعت کا قطعاً کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر اصطلاح سے قطع نظر کر لی جائے تب

بھی اسلامی جہاد پر جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم منطبق نہیں ہوتی۔ اسلامی جہاد بیک وقت جارحانہ بھی ہے اور مدافعانہ بھی۔ جارحانہ اس لیے کہ مسلم پارٹی مسلکِ مخالف کی حکمرانی پر حملہ کرتی ہے اور مدافعانہ اس لیے ہے کہ وہ خود اپنے مسلک پر عامل ہونے کے لیے حکومت کی طاقت حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ پارٹی ہونے کی حیثیت سے اس کا کوئی گھر نہیں کہ وہ اس کی مدافعت کرے۔ اس کے پاس محض اپنے اصول ہیں جن کی وہ حمایت کرتی ہے۔ اسی طرح مخالف پارٹی کے بھی گھر پر وہ حملہ نہیں کرتی بلکہ اس کے اصولوں پر حملہ کرتی ہے اور اس حملہ کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اس سے زبردستی اس کے اصول چھڑائے جائیں، بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ اس کے اصولوں سے حکومت کی طاقت چھین لی جائے۔

<u>ذمیوں کی حیثیت</u> یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو کسی دوسرے عقیدہ و مسلک کے متبع ہوں۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور ان کے طریقِ عبادت یا قوانینِ معاشرت سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ ان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں اور جس مسلک پر چاہیں چلیں۔ البتہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ایسے کسی طریقہ پر حکومت کا نظام چلائیں جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔ نیز وہ ان کے اس حق کو بھی نہیں مانتا کہ وہ معاملات کے ان طریقوں کو اسلامی نظامِ حکومت میں جاری رکھیں جو اسلام کے نزدیک اجتماعی فلاح کے لیے مہلک ہیں۔ مثلاً وہ حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی سودی کاروبار کی تمام صورتوں کو مسدود کر دے گا۔ جوئے کی ہرگز اجازت نہ دیگا۔ خرید و فروخت اور مالی لین دین کی ان تمام شکلوں کو روک دیگا جو اسلامی قانون میں حرام ہیں۔ قحبہ خانوں اور نواحش کے اڈوں کو کلیتہً بند کر دے گا۔ غیر مسلم عورتوں کو ستر کے کم سے کم حدود کی پابندی کرنے پر مجبور کرے گا اور انہیں تبرّج جاہلیت کے ساتھ پھرنے سے روک دے گا۔ سینما پر احتساب قائم کرے گا اور تمام غیر اخلاقی عناصر کو اس سے

نکال دے گا۔ کسی گروہ کو مخلوط تعلیم کی اجازت نہ دیگا۔ اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جن میں ایک اسلامی نظامِ حکومت نہ صرف اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر، بلکہ اپنے تحفظ (Defence) کی خاطر بھی ان تمدنی معاملات کی اجازت نہ دیگا جو غیر مسلموں کے مسلک میں چاہے ناجائز نہ ہوں، مگر اسلام کی نگاہ میں موجبِ فساد و ہلاکت ہیں۔

اس باب میں اگر کوئی شخص اسلام پر ناروا داری کا الزام عائد کرے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ دنیا کے کسی انقلابی و اصلاحی مسلک نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ اتنی رواداری نہیں برتی ہے جتنی اسلام برتتا ہے۔ دوسری جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلک والوں کے لیے زندگی دوبھر کر دی جاتی ہے[1]۔ حتیٰ کہ وہ وطن چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام غیر مسلک والوں کو پورے امن کے ساتھ ہر قسم کی ترقی کرنے کا موقع دیتا ہے، اور ان کے ساتھ ایسی فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

امپیریلزم کا شبہ یہاں پہنچ کر مجھے پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں جہاد صرف وہی ہے جو محض فی سبیل اللہ ہو، اور اس جہاد کے نتیجہ میں جب اسلامی حکومت قائم ہو تو مسلمانوں کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کو ہٹا کر خود ان کی جگہ لے لیں۔ مسلمان اس لیے نہیں لڑتا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں لڑ سکتا کہ اس کی ذاتی حکومت قائم ہو جائے، اور وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنالے اور ناجائز طور پر لوگوں کی گاڑھی محنتوں کا روپیہ وصول کر کے اپنے لیے زمین میں جنتیں بنانے لگے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں بلکہ جہاد فی سبیل الطاغوت ہے، اور ایسی حکومت کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کا جہاد تو ایک خشک اور بے مزہ محنت ہے جس میں جان

---

[1] اس کی تازہ ترین مثال روس کا انقلاب اشتراکی ہے جس کی تاریخ ظلم و خونریزی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

مال اور خواہشاتِ نفس کی قربانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر یہ جہاد کامیاب ہو اور نتیجہ میں حکومت مل جاتے تو سچے مسلمان حکمران پر ذمہ داریوں کا اس قدر بھاری بوجھ عائد ہو جاتا ہے کہ اس غریب کے لیے راتوں کی نیند اور دن کی آسائش تک حرام ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے معاوضہ میں وہ حکومت و اقتدار کی ان لذتوں میں سے کوئی لذت بھی حاصل نہیں کر سکتا جن کی خاطر دنیا میں عموماً حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام کا فرمانروا نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے، نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے، نہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے، نہ قانونِ شریعت کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے، نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبہ سے بچا سکے، نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے، ایک متوسط درجہ کے مسلمان کو زندگی بسر کرنے کے لیے جتنی تنخواہ کافی ہو سکتی ہے اس سے زیادہ بیت المال سے ایک پائی لینا بھی اس کے لیے حرام ہے۔ وہ غریب نہ عالیشان قصر بنوا سکتا ہے، نہ خدم و حشم رکھ سکتا ہے، نہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ ایک دن اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا اور اگر حرام کا ایک پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ، ظلم و بے انصافی کا ایک دھبہ اور خواہشاتِ نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے سخت سزا بھگتنی ہو گی۔ اگر کوئی شخص حقیقت میں دنیا کا لالچی ہو تو اس سے بڑا کوئی بے وقوف نہ ہو گا اگر اسلامی قانون کے مطابق حکومت کا بار سنبھالنے پر آمادہ ہو، کیونکہ اسلامی حکومت کے فرمانروا سے بازار کے ایک معمولی دوکاندار کی پوزیشن زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ وہ دن کو خلیفہ سے زیادہ کماتا ہے اور رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، خلیفہ

بیچارے کو نہ اس کے برابر آمدنی نصیب اور نہ رات کو چین سے سونا ہی نصیب۔

یہ بنیادی فرق ہے اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں۔ غیر اسلامی حکومت میں حکمران گروہ اپنی خداوندی قائم کرتا ہے اور اپنی ذات کے لیے ملک کے وسائل و ذرائع استعمال کرتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت میں حکمران گروہ مجرد خدمت کرتا ہے اور عام باشندوں سے بڑھ کر اپنی ذات کے لیے کچھ حاصل نہیں کرتا۔ اسلامی حکومت کی سول سروس کو جو تنخواہیں ملتی تھیں، ان کا تقابل آج کل کی یا خود اس دور کی امپیریلیسٹ طاقتوں کی سول سروس کے مشاہروں سے کر کے دیکھیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی جہاں کشائی اور امپیریلزم کی عالمگیری میں روحی و جوہری فرق ہے۔ اسلامی حکومت میں خراسان، عراق، شام اور مصر کے گورنروں کی تنخواہیں آپ کے معمولی انسپکٹروں کی تنخواہوں سے بھی کم تھیں۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ صرف سو روپے مہینہ پر اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ نہ تھی دراں حالیکہ بیت المال دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں کے چھوڑے ہوئے خزانوں سے بھرپور ہو رہا تھا۔ اگرچہ ظاہر میں امپیریلزم بھی ملک فتح کرتا ہے اور اسلام بھی۔ مگر دونوں کے جوہر میں زمین و آسمان کا بل ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ ہے اس جہاد کی حقیقت جس کے متعلق آپ بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ آج اسلام اور مسلم جماعت اور جہاد کا وہ تصور جو تم پیش کر رہے ہو کہاں غائب ہو گیا۔ اور کیوں دنیا بھر کے مسلمانوں میں کہیں بھی اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، تو میں عرض کرونگا کہ یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے بلکہ ان لوگوں سے کیجیے جنہوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کے اصلی مشن سے ہٹا کر تعویذ گنڈوں اور عملیات اور مراقبوں اور ریاضتوں کی طرف پھیر دی۔

جنہوں نے نجات اور فلاح اور حصولِ مقاصد کے لیے شارٹ کٹ تجویز کیے تاکہ مجاہدے اور جانفشانی کے بغیر سب کچھ تسبیح پھرانے یا کسی صاحبِ قبر کی عنایات حاصل کر لینے ہی سے میسر آجائے جنہوں نے اسلام کے کلیات اور اصول اور مقاصد سب کو لپیٹ کر تاریک گوشوں میں پھینک دیا اور مسلمانوں کے ذہن کو آمین بالجہر اور رفع یدین اور ایصالِ ثواب و زیارتِ قبور اور اسی قسم کے بیشمار جزئیات میں ایسا پھنسایا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصدِ تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے۔ اگر اس سے بھی آپ کی تشفی نہ ہو تو پھر یہ سوال ان امراء اور اصحابِ اقتدار کے سامنے پیش کیجیے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا دعوئے تو کرتے ہیں مگر قرآن کے قانون اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا اس سے زیادہ کوئی حق اپنے اوپر تسلیم نہیں کرتے کہ کبھی ختم قرآن کرا دیں اور کبھی عید میلاد کے جلسے کرا دیں اور کبھی اللہ میاں کو نعوذ باللہ ان کی شاعری کی داد دے دیا کریں۔ رہا اس قانون اور ہدایت کو عملاً نافذ کرنا، تو یہ حضرات اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ سمجھتے ہیں، کیونکہ درحقیقت ان کا نفس ان پابندیوں کو قبول کرنے اور ان ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے جو اسلام ان پر عائد کرتا ہے۔ یہ بڑی سستی نجات کے طالب ہیں۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۵۸ھ۔ مئی ۱۹۳۹ء)

آزادی کا اسلامی تصوّر

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (احزاب:۳۷) (اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر) مگر حضرت زیدؓ نے اس حکم نبوی کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینب کو طلاق دے دی اس فعل کے خلافِ حکم ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور قرآن کے انداز بیان میں صراحتہً یا کنایتہً ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید کی اس سرتابی کو ادنیٰ درجہ بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیان واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (احزاب:۳۷) (جس پر اللہ نے انعام کیا) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جاسکتی ہے اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہو جائے کہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی وہ اس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے۔"

سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ چند لفظوں میں شبہ کو رفع کیا جا سکتا تھا لیکن دراصل شبہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہاں متعدد غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دُور تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اصل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیئے جائیں۔

قرآنِ حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکمِ مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ[1]۔ صرف اسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے، اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ[2]۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ[3]۔ اطاعت اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور دراصل صرف اسی کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[4]۔ اس کے سوا انسان کسی کا مخلوق ہے نہ بندہ نہ پروردہ، اس لیے دراصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ[5]۔ کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیتِ مطلقہ (Absolute Authority) حاصل ہے اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ وہ اس خاص شخص کا حکم ہے۔

قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاعِ حقیقی (Real Sovereign) کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطورِ خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بمنزلہ خدا ہے۔ اس قسم کی اطاعت اور

---

[1] خدا کے سوا کسی کے لیے حکم نہیں۔ (انعام: ۵۷) [2] اللہ جو چاہے حکم دے۔ (مائدہ: ۱)

[3] اس کے کام میں سوال نہیں کیا جا سکتا۔ (انبیاء: ۲۳)

[4] میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ (الذّٰریٰت: ۵۱)

[5] وہ پوچھتے ہیں کہ حکم میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو حکم پورا کا پورا اللہ کے لیے ہے۔ (عمران: ۱۵۴)

محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علماء و مشائخ کو، پنڈتوں اور پروہتوں کو، اور دنیوی حاکموں کو اربابٌ من دُون اللّٰہ (Gods other than God) بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھہراتا ہے۔ کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کرے گا، تو لامحالہ اس کی تہ میں الوہیت کا تصور اور عبودیت کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلیتہً دستبردار ہوتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بری اور عیوب و نقائص سے پاک اور جزو کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتی حق کی بنا پر امر و نہی کا مالک ہے اور اسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے، یا یہ گمان کرتا ہے کہ وہی دراصل نفع اور نقصان پہنچانے والا اور رزق دینے اور رزق روکنے والا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کو ان صفات کا حامل سمجھنا ہی شرک اور غلامی کی جڑ ہے۔ اور توحید — جس کا لازمی نتیجہ آزادی ہے — یہ ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ان صفات سے خالی سمجھا جائے اور ان کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد، اب اس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے، اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران، یا ابن مریم، یا ابن عبداللہ ہے، اور یہ شخصِ خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھیرانے کا حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذاللہ نبی خود بھی اربابٌ من دُون اللّٰہ میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں وہ مقصد فوت ہو کر رہے گا جس کے لیے وہ نبی بنا کر بھیجا گیا ہے قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ

كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا[1] (بنی اسرائیل: ۹۳) وَقَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[2] (ابراہیم: ۱۱)
البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ "حکم" بھی عطا ہوتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ[3] (الانعام: ۸۹) حکم کے مفہوم میں قوت فیصلہ (Judgment) اور اقتدار حکومت (Authority) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو اقتدار حاصل ہے وہ ذاتی اقتدار نہیں بلکہ تفویض کردہ اقتدار ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت دراصل خدا ہی کی اطاعت ہے، مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ[4] (النساء: ۸۰) وہ بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کے احکام نافذ کرے اور تم ان احکام کی اطاعت کرو، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ[5] (النساء: ۶۴) اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون وچرا کرنے کا حق نہیں، وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا[6] (النساء: ۱۱۵) عمل تو درکنار اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آجائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے، فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا[7] (النساء: ۶۵) اور اس فرق

---

[1] اے نبی ان سے کہو کہ پاک ہے میرا رب۔ کیا میں اس کے سوا بھی کچھ ہوں کہ ایک انسان ہوں جسے پیغمبر بنایا گیا؟ [2] اور ان سے ان کے پیغمبروں نے کہا کہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں [3] یہ پیغمبر وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی۔ [4] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ [5] ہم نے جو نبی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔
[6] جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد نبی سے جھگڑا کرے اور ایسا طریق اختیار کرے جو ایمان لانے والوں کے طریقہ سے مختلف ہو تو جدھر وہ مڑے گا ہم بھی اسے اسی طرف موڑ دیں گے اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت بری جائے قرار ہے۔
[7] خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں اور جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

کا نتیجہ ابدی خسران و نامرادی ہے، يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ ۔[۱] (النساء: ۴۲)

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا یہ اطاعت اور کامل سپردگی جس پر دین و ایمان کا مدار رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہدایت سراسر نبی کی اطاعت پر منحصر ہے " وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا (النور: ۵۴) اس کا مرجع نبی کی انسانی اور شخصی حیثیت نہیں ہے۔ کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنائے، بلکہ صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان کو خدا کا تابع فرمان بنائے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ[۲] (آل عمران: ۷۹) وہ اس لیے نہیں آیا کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی پر مجبور کرے، اپنی شخصی عظمت و بزرگی کا سکہ ان پر جمائے اور ان کو اپنے شخصی اقتدار کے شکنجہ میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلہ میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دستبردار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہوئی جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا جاتا ہے۔ انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی تو نبی کی بعثت کا مقصود ہے، وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔[۳] (اعراف: ۱۵۷) انسان نے انسان کیلئے فرائض اور حقوق مقرر کرنے اور جائز و ناجائز کی من مانی حدیں ٹھہرانے کے جن اختیارات پر قبضہ کر رکھا تھا ان کو

---

[۱] جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز ان پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ وہ چاہیں گے کہ زمین ان پر پاٹ دی جائے۔ [۲] کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت بخشے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ نہیں، بلکہ وہ کہے گا کہ تم خدا کے بندے بنو۔ [۳] اور یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو توڑتا ہے جن میں وہ بندھے ہوئے تھے۔

سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ[1] (النحل: ۱۱۵) انسانی حکم و فیصلے کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوت قائم کی جاتی ہے، وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ[2] (آل عمران: ۶۴) پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی انکی گردنوں سے دوسروں کا طوق اتار کر اپنا طوق ڈال دے اور تحلیل و تحریم کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں کر لے اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جاتے۔ اس نے تو یہود و نصاریٰ کو اسی پر ملامت کی تھی کہ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ[3] (التوبہ: ۳۱) پھر وہ کیسے کہتا کہ اب تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو رب بنا لو اور میری خواہشاتِ نفس کی پابندی کرو۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، جو اصل ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سرِ مُو انحراف کا بھی حق نہیں، وہ دراصل نبی بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بحیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ یعنی اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت جسے اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ پس درحقیقت اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔

اے نبی ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس حق کے مطابق

---

[1] تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی زبان سے جس چیز کو چاہو حلال کرو اور جسے چاہو ممنوع ٹھہرا دو۔

[2] ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے بجائے اپنا خدا نہ بنائے۔

[3] انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے بجائے اپنا خدا بنا لیا۔

(النساء : ۱۰۵) فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ۔ (المائدہ: ۴۵) اور جو اللہ کے نازل کیے ہوتے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس آیت میں جس طرح دوسرے انسان بندھے ہوتے ہیں اسی طرح خود نبی بحیثیت انسان بھی بندھا ہوا ہے :-

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (الانعام: ۵۰) میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ شانہ کی ہے۔ اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبی کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو "حکم" عطا کیا گیا ہے۔ حکام کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسول کے امر و نہی اور اس کے مقرر کیے ہوتے حدود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے۔ وہ اس میں ہرگز چون و چرا کرنے کا حق نہیں رکھتا اس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے حاصل نہیں۔ لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے۔ تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور حکام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری

کا قلادہ انسان کی گردن میں ڈال دیں۔ اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اس کی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ دونوں کام آپ کے مقصدِ بعثت میں شامل تھے اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی۔ پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں۔ کیونکہ آپ کی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کسی انسان کی، حتیٰ کہ خود محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے اور ان کی روحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیتِ نبوت اور حیثیتِ بشریت دونوں جمع تھیں اور ان کو کسی واضح خطِ امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ کے رسولِ پاک نے اللہ کی بخشی ہوئی حکمت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا۔ آپ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخ عالم میں کبھی کسی امیر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے جاں نثار متبعین کو ایسی آزادیِ رائے عطا کی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ اگر کوئی شخص اس امر پر غور کرے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اپنے پیروؤں پر کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا اور مسلمان کتنی گہری عقیدت آپ کے ساتھ رکھتے تھے اور پھر یہ دیکھے کہ اتنا زبردست اقتدار رکھنے کے باوجود آپ کس طرح معاشرت اور معاملات میں ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پیغمبرانہ حیثیت اور انسانی حیثیت کو الگ الگ رکھتے تھے، اور پیغمبرانہ حیثیت میں اپنی بے چون و چرا اطاعت کرانے کے ساتھ انسانی حیثیت میں لوگوں کو کتنی مکمل آزادیِ رائے عطا فرماتے اور خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں کس طرح ان کی ہمت افزائی کرتے تھے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ کمال درجہ

کا ضبطِ نفس، یہ حیرت انگیز قوتِ امتیاز اور ایسی مکمل بصیرت صرف ایک نبی ہی کو میسّر آسکتی ہے۔ اس مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کی شخصی حیثیت الگ ہونے کے باوجود اس کی پیغمبرانہ حیثیت میں گم ہو جاتی ہے۔ نبی اپنی شخصی حیثیت میں بھی پیغمبری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ جب اپنی شخصی حیثیت میں کام کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پیرووں میں آزادیٔ فکر کی رُوح پھونکتا ہے، صحیح جمہوری اصولوں پر ان کی تربیت کرتا ہے، انہیں سکھاتا ہے کہ انسان کے مقابلہ میں ان کو کس طرح آزادیٔ رائے استعمال کرنی چاہیے، اور انہیں بتاتا ہے کہ آزادیٔ رائے کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے حتیٰ کہ اس انسانِ کامل، اس عظیم الشان شخصیت کے مقابلہ میں بھی وہ رائے کی پوری آزادی رکھتے ہیں جس کو وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے بلند ترین اقتدار کا درجہ دینے پر مجبور ہیں۔ نبی کے سوا کسی دوسرے کو لوگوں پر ایسا مکمل اقتدار نصیب ہو تو وہ ضرور ان کو اپنا بندہ بنا لے اور ان پر اپنے وہی حقوق جمائے جو دنیا میں پیروں اور پنڈتوں اور بادشاہوں نے جما کر دکھا دیئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّاْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔	مَیں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو۔ اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے مدینے کے باغبانوں کو کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپؐ سے اس بارے میں عرض کیا گیا تو جواب میں آپؐ نے فرمایا:

اِنِّیْ اِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا وَلَا تُؤَاخِذُوْنِیْ بِالظَّنِّ وَلٰكِنْ اِذَا حَدَّثْتُكُمْ عَنِ اللّٰهِ شَیْئًا فَخُذُوْا بِهٖ فَاِنِّیْ	مَیں نے تو اندازے سے ایک بات کہی تھی تم میری ان باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے

لَمْ اَکْذِبْ عَلَی اللّٰہِ۔ کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضورؐ ابتدا میں جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ مناسب نہ تھی۔ حضرت حباب بن منذر نے آپ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعہ سے کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کر فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیرانِ بدر کے مسئلہ میں حضورؐ نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکن جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے آپؐ کی اور صدیقِ اکبرؓ کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا جس کا واقعہ تمام تاریخوں میں مشہور ہے۔ اسی مجلس میں حضورؐ نے خود اپنے داماد ابوالعاص کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہے تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہ نے بخوشی اس کی اجازت دی تب آپ نے ہار انہیں واپس کیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر حضورؐ نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجالِ کلام نہیں، اور اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضورؐ نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلحنامہ کا مسودہ چاک کر ڈالا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے علانیہ اس سے اختلاف کیا۔ مگر جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجودیکہ غیرتِ اسلامی کی بنا پر سب ملول تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ وہ ایک ایسے امر میں حضورؐ سے اختلاف

کر بیٹھے جو بحیثیت رسول کیا جا رہا تھا۔

جنگِ حُنین کے موقع پر تقسیم غنائم میں آپ نے مؤلفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چیں بجبیں ہوئے۔ حضورؐ نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو چاہوں کروں، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے ان کے ایمان یا رسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انہیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

یہ تو خیر ان لوگوں کے ساتھ معاملہ تھا جو سوسائٹی میں بڑی اونچی پوزیشن رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے غلاموں اور لونڈیوں تک میں استقلال رائے کی روح پھونک دی تھی۔ بریرہ ایک لونڈی تھی جو اپنے شوہر سے متنفر ہو گئی تھی۔ مگر شوہر اس کا عاشقِ زار تھا۔ وہ اس کے پیچھے روتا پھرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے کہا کہ تو اپنے شوہر سے رجوع کر لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے پوچھا "یا رسول اللہ کیا آپ حکم دیتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "حکم نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں" اس نے کہا "اگر یہ سفارش ہے تو میں اس کے پاس جانا نہیں چاہتی"۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضورؐ کی تصریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہار رائے کرتے تھے اور آپ خود اس آزادانہ اظہار رائے میں ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا، بلکہ آپ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپ خود بسا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔

اب حضرت زید کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کے تعلقات کئی طرح کے تھے۔ ایک تعلق یہ تھا کہ آپ ان کے پیشوا تھے اور وہ آپ کے پیرو تھے۔ دوسرا تعلق یہ تھا کہ آپ ان کے برادرِ نسبتی تھے اور وہ آپ کے بہنوئی

تھے تیسرا تعلق یہ تھا کہ آپ ان کے مُربّی تھے اور وہ آپ کے پروردہ تھے۔ بیوی سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ان کو وہی مشورہ دیا جو ہر برادرِ نسبتی اپنے بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دے گا یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بنا پر زوجین میں باہم نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کو حضرت زید خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و ایمان کا نہیں بلکہ ان کے حسیاتِ نفس کا تھا۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسول کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا، اس لیے نہ آپ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن سے پالا ہو اور اس پر احسانات کیے ہوں اور آخر میں غلامی سے داغدار ہونے کے باوجود اپنی بہن کی شادی اس سے کی ہو، اور پھر اس نے باوجود منع کرنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا۔ مگر حضورؐ صرف مربّی اور برادرِ نسبتی ہی نہ تھے بلکہ رسولِ خدا بھی تھے اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلوائیں۔ اس لیے آپ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اِس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی ذات میں حیثیتِ نبوی اور حیثیتِ بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے۔ حیثیتِ بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض اس کے ضمن میں ادا ہوتے رہتے تھے۔

سرکارِ رسالت مآب نے جس حُرّیتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادیٔ رائے استعمال کرنے کا

جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھایا تھا، اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام تمام انسانوں سے زیادہ احکامِ الٰہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں سے جو بڑے آدمی تھے، جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادیٔ رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں لوگوں کی آزادی کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی اور کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں اس لیے ہماری بات بے چون و چرا تسلیم کرو۔

خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس نے حریتِ فکر کو خوف اور طمع دلا کر ظلم و ستم اور زر پاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی، مگر تابعین اور تبع تابعین میں اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک مسلمانوں میں یہ روح باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخِ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ امراء اور حکام کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ رُوح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے، جس کی عزت و عظمت اس کے پہنائے قلب میں جاگزین ہو اس کی اندھی تقلید سے انکار کر دے، اور اس کے مقابلہ میں آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی سپرٹ ہم کو اس دور کے اہلِ علم میں نظر آتی ہے۔ صحابۂ کرام سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی؟ اور حضرات

تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہوگا؟ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابہ کرام کی آراء پر نقد کرتے تھے، ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے، اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کرتے تھے۔ اختلافِ صحابہؓ میں امام مالکؒ کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خَطَاءٌ وَصَوَابٌ فَانْظُرُوْا فِیْ ذٰلِكَ "صحابہ کی آراء میں خطاء بھی ہے اور صواب بھی تم خود غور کر کے رائے قائم کرو" اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے: اَحَدُ الْقَوْلَيْنِ خَطَاءٌ وَالْمَاثَمُ فِيْهِ مَوْضُوْعٌ "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہر حال غلط ہوگا"

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکرؓ صدیق جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے کہ هٰذَا رَأْيِیْ فَاِنْ يَّكُنْ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ يَّكُنْ خَطَاءً فَمِنِّیْ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ "یہ میری رائے ہے، اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری خطا ہے اور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں لَا تَجْعَلُوْا خَطَاءَ الرَّاْيِ سُنَّةً لِلْاُمَّةِ "رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بنالو"

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے اَلَا لَا يُقَلِّدَنَّ اَحَدُكُمْ دِيْنَهٗ رَجُلًا اِنْ اٰمَنَ اٰمَنَ وَاِنْ كَفَرَ كَفَرَ فَاِنَّهٗ لَا اُسْوَةَ فِی الشَّرِّ "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن رہا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے"

امام مالکؒ فرماتے ہیں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِئُ وَاُصِيْبُ فَانْظُرُوْا فِیْ رَاْيِیْ فَكُلَّمَا وَافَقَ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَخُذُوْهُ وَكُلَّمَا لَمْ يُوَافِقِ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ فَاتْرُكُوْهُ "میں ایک انسان ہوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی تم میری رائے پر غور کرو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ اسے قبول کرو اور

جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو" امام مالکؒ ہی کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی ان کی کتاب المؤطا کو تمام عالم اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کرکے صرف مذہب مالکی کو رائج کر دے مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق و آزادیٔ رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَقُوْلَ مَقَالَتَنَا حَتّٰی یَعْلَمَ مِنْ اَیْنَ قُلْنَا "کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہوتا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: مَثَلُ الَّذِیْ یَطْلُبُ الْعِلْمَ بِلَا حُجَّۃٍ کَمَثَلِ حَاطِبِ لَیْلٍ یَحْمِلُ حُزْمَۃَ حَطَبٍ وَفِیْہِ اَفْعٰی تَلْدَغُہٗ وَھُوَ لَا یَدْرِیْ "جو شخص دلیل کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چن رہا ہو۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اسے ڈس لے گا"

"تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریت فکر و نظر اور آزادانہ طلب حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امراء و حکام اور علماء و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا۔ درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی، دل اور دماغ، روح اور جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی، مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے

مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا۔ جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنا سوءِ ادبی ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان انسان کا خداوند اور اَن داتا بن جائے، جب انسان بذاتِ خود امر و نہی کا مختار اور کتابُ اللہ و سنّتِ رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے، جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بَری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران: ۶۴) کے الفاظ میں دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی ترقی ممکن ہی نہیں، پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان ۱۳۵۵ھ۔ دسمبر ۱۹۳۶ء)

رواداری

اگر ایک ہی شے کو ایک شخص سیاہ کہے، دوسرا سپید، تیسرا زرد اور چوتھا سُرخ تو ممکن نہیں ہے کہ یہ چاروں معاً سچے ہوں۔ اگر ایک ہی فعل کو ایک بُرا کہتا ہے اور دوسرا اچھا، ایک اس سے منع کرتا ہے اور دوسرا اس کا حکم دیتا ہے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ دونوں کی رائے صحیح ہو، دونوں برحق ہوں اور دونوں امر و نہی کا کھلا ہوا اختلاف رکھنے کے باوجود اپنے حکم میں درست ہوں۔ جو شخص ایسے متضاد اقوال کی تصدیق کرتا ہے اور ایسے متضاد احکام کو برحق قرار دیتا ہے اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہوگا۔ یا تو وہ سب کو خوش کرنا چاہتا ہے، یا اس نے اس مسئلہ پر سرے سے غور ہی نہیں کیا اور بے سوچے سمجھے رائے ظاہر کردی۔ بہرحال دونوں صورتیں عقل اور صداقت کے خلاف ہیں اور کسی دانشمند اور حق پسند انسان کے لیے یہ زیبا نہیں کہ کسی وجہ سے بھی مختلف الخیال لوگوں کی تصدیق کرے۔

عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دس مختلف خیالات رکھنے والے آدمیوں کے مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دینا "رواداری" ہے۔ حالانکہ یہ دراصل رواداری نہیں، علانیہ منافقت ہے۔ رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کرکے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور انہیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کا تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے

کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں، اور خود ایک دستور العمل کے پیرو رہتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں، تو اس منافقانہ اظہار رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔

صحیح رواداری وہ ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو دی ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

(انعام: ۱۰۹)

یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو، کیونکہ اس کے جواب میں نادانی کے ساتھ ناحق یہ خدا کو گالیاں دیں گے ہم نے تو اسی طرح ہر قوم کے لیے اس کے اپنے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے پھر ان سب کو اپنے پروردگار کی طرف واپس جانا ہے۔ وہاں ان کا پروردگار انہیں بتا دے گا کہ انہوں نے کیسے عمل کیے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔

(فرقان: ۷۲)

خدا کے نیک بندے وہ ہیں جو جھوٹ پر گواہ نہیں بنتے[1] اور جب کسی نامناسب فعل کے پاس سے گزرتے ہیں تو خودداری کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

---

[1] ہر وہ فعل جو حق کے خلاف ہو جھوٹ کی تعریف میں آجاتا ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں شرک کا ارتکاب ہوتا ہو یا جہاں ملحدانہ خیالات ظاہر کیے جاتے ہوں، یا جہاں فحش اور بےحیائی کا ارتکاب ہوتا ہو، یا جہاں ظلم اور فسق کیا جاتا ہو، وہاں دراصل جھوٹ کا ارتکاب ہوتا ہے جہاں کسی انسان یا دوسری مخلوق کو خدا بنا کر انسان اس کے آگے بندگی کرتا ہو وہاں بھی جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جھوٹ کا وسیع مفہوم ہے اور اس جھوٹ کے گواہ نہ بننے سے مراد یہ ہے کہ مومن ایسے مقامات پر قصداً نہ جائیگا کہ ان افعال کو دیکھے اور ان کا شاہد بنے

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ (الکٰفرون: ۱تا۶)

اے محمد! ان سے کہہ دو کہ اے کافرو! نہ میں ان معبودوں کو پوجتا ہوں جن کو تم پوجتے ہو اور نہ تم اس معبود کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ اور آئندہ بھی نہ میں ان معبودوں کو پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا ہے اور نہ تم اس معبود کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔"

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ: ۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ۔ (القصص: ۵۴، ۵۵)

وہ بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی نامناسب بات سنتے ہیں تو اس سے درگزر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے ہم جاہلوں سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔ (الشوریٰ: ۱۵)

پس تم ان کو حق کی دعوت دو اور اپنے مسلک پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی ہرگز پیروی نہ کرو اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر میں ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت نہیں۔ اللہ ہم سب کو قیامت میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف واپس جانا ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ	پند و نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان کے ساتھ
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (النحل: ۱۲۵)	اچھے طریقے سے مباحثہ کرو۔

یہی وہ رواداری ہے جو ایک حق پرست، صداقت پسند اور سلیم الطبع انسان اختیار کر سکتا ہے۔ وہ جس مسلک کو صحیح سمجھتا ہے اس پر سختی کے ساتھ قائم رہے گا اپنے عقیدہ کا صاف صاف اظہار و اعلان کرے گا، دوسروں کو اس عقیدہ کی طرف دعوت بھی دیگا، مگر کسی کی دل آزاری نہ کرے گا، کسی سے بدکلامی نہ کرے گا، کسی کے معتقدات پر حملہ نہ کرے گا، کسی کی عبادات اور اعمال میں مزاحمت نہ کریگا، کسی کو زبردستی اپنے مسلک پر لانے کی کوشش نہ کرے گا۔ باقی رہا حق کو حق جانتے ہوئے حق نہ کہنا۔ یا باطل کو باطل سمجھتے ہوئے حق کہہ دینا، تو یہ ہرگز کسی سچے انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اور خصوصاً لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسا کرنا تو نہایت مکروہ قسم کی خوشامد ہے۔ ایسی خوشامد نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ذلیل ہے بلکہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوتی جس کے لیے انسان اپنے آپ کو اس پست منزل تک گراتا ہے۔ قرآن کا صاف اور سچا فیصلہ ہے کہ:

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ	یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے
وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ	جبتک کہ تو ان کی ملت کا پیرو نہ بن جائے گا۔
قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی	صاف کہہ دے کہ اللہ کا راستہ ہی سیدھا
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ	راستہ ہے، ورنہ اگر تو نے اس علم کے بعد
الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ	جو تیرے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کی
مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔	پیروی کی تو کوئی حامی و مددگار تجھ کو خدا سے
(البقرہ: ۱۲۰)	بچانے والا نہ ہوگا۔

جھوٹی رواداری کا اظہار تو خیر سیاسی اغراض کے لیے کیا جاتا ہے اور اس دور میں یہ "جائز" ہے۔ کیونکہ مغربی ارباب ریاست کی کوششوں سے مدت

ہوئی کہ اخلاق اور سیاست کے درمیان مفارقت کرادی گئی ہے۔ لیکن افسوس کے قابل ان "محققین" کا حال ہے جو عقل کو سوچنے اور فکر کو حرکت کرنے کی زحمت دیئے بغیر اپنی مذہبی تحقیقات کا یہ عجیب نظریہ ظاہر فرمایا کرتے ہیں کہ "تمام مذاہب برحق ہیں"۔ یہ جملہ اکثر ان لوگوں کی زبان سے سنا جاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ہم کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے اور نہ تسلیم کرتے ہیں جب تک کہ اس کو میزانِ عقل میں تول نہ لیں۔ لیکن میزانِ عقل کا حال یہ ہے کہ وہ ان کی اس تحقیقِ انیق کو پرِ کاہ کے برابر بھی وزن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جن مختلف مذاہب کو معاً برحق ہونے کی سند عطا کی جاتی ہے، ان کے اصول میں سیاہ اور سفید کا کھلا ہوا فرق موجود ہے۔ ایک کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ دوسرا کہتا ہے دو ہیں۔ تیسرا کہتا ہے تین ہیں۔ چوتھا کہتا ہے بہت سی قوتیں خدائی میں شریک ہیں۔ پانچویں کی تعلیم میں سرے سے خدا کا تصوّر ہی موجود نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پانچوں سچے ہوں؟ ایک انسان کو خدائی کے مقام میں لے جاتا ہے۔ دوسرا خدا کو کھینچ کر انسانوں کے بیچ میں اتار لاتا ہے۔ تیسرا انسان کو عبد اور خدا کو معبود قرار دیتا ہے۔ چوتھا عبد اور معبود دونوں کے تخیل سے خالی ہے۔ کیا صداقت میں ان چاروں کے لیے اجتماع کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ ایک نجات کو صرف عمل پر موقوف رکھتا ہے دوسرا نجات کے لیے صرف ایمان کو کافی سمجھتا ہے۔ تیسرا ایمان اور عمل دونوں کو نجات کے لیے شرط قرار دیتا ہے۔ کیا یہ تینوں بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں؟ ایک نجات کی راہ دنیا اور اس کی زندگی سے باہر نکالتا ہے۔ دوسرے کے نزدیک نجات کا راستہ دنیا اور اس کی زندگی کے اندر سے گزرتا ہے۔ کیا یہ دونوں راستے یکساں درست ہو سکتے ہیں؟ ایسے متضاد امور کو صداقت کی سند عطا کرنے والی شے کا نام اگر عقل ہے تو پھر جمع بین الاضداد کو محال قرار دینے والی شے کا نام کچھ اور ہونا چاہیے۔

مذاہب میں جو تصورات مشترک نظر آتے ہیں، افسوس ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے

ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے اور محض سطح پر نگاہ ڈال کر چند غلط مقدمات کو غلط طریقے سے ترتیب دیکر غلط نتائج نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل یہ اشتراک ایک اہم حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ وہ پتہ دیتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام مذاہب ایک ہی اصل سے نکلے ہیں۔ ان تمام تصورات اور تعلیمات کا مبدأ ایک ہے۔ کوئی ایک ذریعۂ علم ہے جس نے انسان کو مختلف ممالک، مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں، ان مشترک صداقتوں سے روشناس کیا۔ کوئی ایک بصیرت ہے جو مشرق و مغرب کا بُعد رکھنے والے اور سینکڑوں ہزاروں برس کا فصل رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی، اور اس بصیرت سے وہ سب کے سب ایک ہی قسم کے نتائج تک پہنچے۔ لیکن مذاہب جب اپنی اصل اور اپنے مبدأ سے دُور ہو گئے تو ان میں کچھ خارجی تصورات اور اجنبی معتقدات و تعلیمات نے راہ پالی اور چونکہ یہ بعد والی چیزیں اس مشترک مبدأ اور مشترک بصیرت سے ماخوذ نہ تھیں، بلکہ مختلف طبائع، مختلف رجحانات اور مختلف علمی و عقلی مراتب رکھنے والے انسانوں کی طبعزاد تھیں، اس لیے انہوں نے ان مشترک بنیادوں پر جو عمارتیں تعمیر کیں وہ اپنے نقشوں اور اپنی وضع و ہیئت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں۔

پس حق اور صدق کا اگر حکم لگایا جا سکتا ہے تو اس اصل مشترک پر لگایا جا سکتا ہے جو تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے نہ کہ ان مختلف تفصیلی صورتوں اور ہیئتوں پر جن میں موجودہ مذاہب پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ حق ایک جنس بسیط ہے، اس کے افراد میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم سیاہ اور سپید، سرخ اور سبز پر لفظ "رنگ" کا اطلاق یکسانی کے ساتھ کرتے ہیں، اس طرح خدا ایک ہے اور خدا دو ہیں اور خدا کروڑوں ہیں کے مختلف احکام پر لفظ "حق" کا اطلاق نہیں کر سکتے۔

یہ بات کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے، اور ایک صداقت ہے جو مختلف قوموں پر مختلف زبانوں میں ظاہر کی گئی، قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ

بیان ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہر قوم میں خدا کے رسول اور پیغامبر آئے ہیں، وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا (النحل:۳۶) وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر:۲۴) یہ تمام انبیاء و رسل ایک سرچشمے سے صداقت کا پیغام حاصل کرتے تھے، جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (آل عمران:۱۸۴) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ (الحدید:۲۵)

ان سب کا پیغام ایک ہی تھا، اور وہ یہ تھا:-

أُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل:۳۶)	خدا کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو۔

سب پر خدا کی طرف سے ایک ہی وحی آئی تھی:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ۔ (انبیاء:۲۵)	اے محمدؐ تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا تم میری بندگی کرو۔

ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ ہماری اپنی عقل و فکر کا نتیجہ ہے، بلکہ سب یہی کہتے رہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔

وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا۔ (ابراہیم:۱۱،۱۲)	ہم یہ قدرت نہیں رکھتے کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی حجت لا سکیں۔ جو ایمان لانے والے ہیں وہ تو خدا ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ رکھیں جبکہ اسی نے ہم کو ہدایت بخشی ہے۔

پھر ان میں سے کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم ہماری بندگی کرو، بلکہ سب یہی کہتے رہے کہ خدا پرست بن جاؤ:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ	کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ جب اس کو

اَلْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔ (آل عمران : ۷۹)	کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ خدا پرست بنو۔

یہ تھی وہ مشترک تعلیم جو تمام قوموں کو ان کے مذہبی رہنماؤں نے دی تھی۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ اوّل اوّل تمام انسان ایک ہی امت تھے، یعنی ایک خالص انسانی فطری حالت (State of Nature) میں تھے اور ان کے پاس خدا کی طرف سے راہِ راست کا علم آیا ہوا تھا[1]۔ پھر ان میں اختلاف ہوا، اور اختلاف اس وجہ سے ہوا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنی حدِ جائز سے گزرنے، اپنے فطری مرتبے سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کرنے، اور اپنے فطری حقوق سے بڑھ کر حقوق قائم کرنے کی کوشش کی۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء آنے شروع ہوئے تاکہ لوگوں کو حق کا صحیح علم دیں، اور ان کے درمیان اجتماعی عدل (Social Justice) قائم کریں۔ تمام انبیاء کا دنیا میں یہی مشن رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس مشن کو قبول کیا اور نبی کے دیئے ہوئے علم کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی، اور نبی کے بتائے ہوئے قانون کا اتباع کیا، صرف وہی حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر ـــــ وہ بھی باطل پر جنہوں نے نبی کے اتباع سے انکار کیا، اور وہ بھی باطل پر جنہوں نے نبی کی تعلیم کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً	لوگ دراصل ایک ہی امت تھے، پھر مختلف

---

[1] یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آج کل کے نظریہ ارتقاء اور فلسفہ تاریخ کے برعکس قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ زمین پر نوعِ انسانی کا آغاز جہالت کی تاریکی میں نہیں ہوا بلکہ خدا داد علم کی روشنی میں ہوا تھا۔ خدا نے سب سے پہلے انسان یعنی آدم علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ان کو الہام کے ذریعہ سے وہ علم دے دیا تھا جو زمین پر صحیح زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری تھا۔

وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس:۱۹) ہو گئے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (بقرہ:۲۱۳)

لوگ پہلے ایک ہی اُمت تھے (پھر جب ان میں اختلاف ہوا) تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے اور متنبہ کرنے والے تھے، اور ان کے ساتھ برحق کتاب اتاری تاکہ وہ کتاب لوگوں کے درمیان ان معاملات کا فیصلہ کر دے جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور یہ اختلاف جو لوگوں میں ہوا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے پر زیادتی کرنی چاہی[1] ورنہ اللہ کی طرف سے تو ان کے پاس پہلے ہی واضح ہدایات آچکی تھیں۔ پھر جن لوگوں نے نبیوں اور کتابوں کی بات مان لی ان کو اللہ نے اس حق کی راہ دکھا دی جس میں لوگوں کے درمیان اختلاف

---

[1] اصل آیت میں قرآن نے لفظ بغی استعمال کیا ہے جس کے معنی اپنی جائز حد سے گزرنے اور زیادتی اور سرکشی کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید تمام اعتقادی گمراہیوں اور اجتماعی ظلم (Social Injustice) کی بنا اس کو قرار دیتا ہے کہ بعض انسانوں میں اپنی حد سے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض انسان دوسرے انسانوں کے خدا بن بیٹھتے ہیں اور ان سے اپنی بندگی کراتے ہیں۔ بعض خود تو خدا بننے کی ہمت نہیں رکھتے مگر کسی بت یا خیالی دیوتا یا کسی قبر کے پجاری یا مجاور بن جاتے ہیں اور ان معبودوں کے واسطے سے لوگوں پر اپنا اقتدار جماتے ہیں۔ بعض مذہبی عہدہ دار بن کر لوگوں کی فلاح و نجات کے ٹھیکہ دار بنتے ہیں اور اس طرح برہمنیت اور پاپائیت وجود میں آتی ہے۔ بعض اپنی بہتر مالی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر معاشی لوٹ کی مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسان کو فطری حالت سے نکال کر اعتقادی اور سماجی حیثیات سے اختلاف میں مبتلا کرنے والی چیز دراصل یہی "بغی" ہے۔

ہوا تھا اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست کی طرف ہدایت بخشتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (الحدید: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور ان کو ترازو دیا تاکہ لوگ انصاف کے طریقہ پر قائم ہوں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (طٰہٰ: ۱۲۳، ۱۲۴)

پھر جو میری ہدایت پر چلا وہ نہ راہِ راست سے بھٹکے گا اور نہ بدبخت ہوگا۔ اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو دنیا میں اس کی زندگی تنگ ہوگی اور آخرت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ قرآن کا نظریۂ تاریخ یا اخلاقی تعبیر تاریخ (Moral Interpretation of History) ہے جو تمدنی اختلافات کے معمہ کی طرح مذہبی اختلافات کے معمہ کو بھی نہایت تشفی بخش طریقے سے حل کر دیتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کے پاس خدا کے نبی اسی لیے آتے رہے ہے کہ جس فطری مسلک حیات سے وہ اپنی "بغاوت" کے سبب ہٹ گئی تھیں اسی کی طرف پھر انہیں لے جائیں اور انہیں حق اور عدل کے طریقہ پر قائم کر دیں مگر وہی بغاوت کا جذبہ جو ان کی گمراہی کا اصلی سبب تھا، انہیں بار بار ہٹا کر پھر ٹیڑھے راستوں کی طرف لے جاتا رہا۔ پس جو تھوڑے بہت صحیح تصورات اور اخلاق کے برحق اصول دنیا کی مختلف قوموں

---

[1] ترازو سے مراد وہ کمال درجہ کا متوازن (Well-Balanced) نظامِ اجتماعی ہے جو شریعتِ الٰہی کی صورت میں انبیاء کے ذریعہ سے بھیجا گیا تاکہ انسانوں کے درمیان عدل قائم کیا جائے۔

میں پائے جاتے ہیں وہ سب انبیاء کی تعلیمات کے وہ باقی ماندہ اثرات ہیں جو اپنی ذاتی قوت کی وجہ سے قوموں کے اذہان اور ان کی زندگی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد قرآن جو دعویٰ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جس "اسلام" کی طرف وہ بلا رہا ہے وہ وہی "اصل دین" ہے جس کو ابتداء سے تمام قوموں میں تمام انبیاء پیش کرتے رہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نرالا پیغام لے کر نہیں آتے ہیں جو پہلے کبھی پیش نہ کیا گیا ہو قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ[1] (احقاف: ۹) بلکہ آپ کا پیغام وہی ہے جو ہر نبی نے ہر قوم تک ہر زمانے میں پہنچایا ہے، إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ[2] (النساء: ۱۶۳) اس پیغام سے عرب، مصر، ایران، ہندوستان، چین، جاپان، امریکہ، یورپ، افریقہ، غرض کوئی سرزمین محروم نہیں رکھی گئی۔ سب جگہ اللہ کے رسول، اللہ کی کتابیں لے کر آتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ بدھ، کرشن، رام، کنفیوشس، زردشت، مانی، سقراط، فیثاغورث وغیرہم انہی رسولوں میں سے ہوں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ان دوسرے پیشواؤں میں فرق یہ ہے کہ ان کی اصل تعلیمات تو لوگوں کے اختلافات میں گم ہو گئیں مگر آنحضرت نے جو کچھ پیش فرمایا وہ اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

پس حقیقت یہ ہے کہ "اسلام" مذاہب میں سے ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ نوعِ انسانی کا اصل مذہب یہی ہے، اور باقی سب مذاہب اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ مذاہب میں جو کچھ "حق" اور "صدق" پایا جاتا ہے وہ اسی اصل اسلام کا بچا کھچا اثر ہے جو سب کے ہاں آیا تھا اور اختلافات میں گم کر دیا گیا۔ جس مذہب میں اس باقی ماندہ حق کی مقدار جتنی زیادہ ہے اس میں اتنا ہی زیادہ "اسلام" موجود ہے۔ رہے وہ اختلافات جو اصل "اسلام" کے

---

[1] اے نبی ان سے کہہ دو کہ میں کوئی نرالا پیغامبر نہیں ہوں۔

[2] ہم نے تمہاری طرف وہی پیغام وحی کیا ہے جو نوح اور ان کے بعد کے نبیوں پر وحی کیا تھا۔

خلاف ہیں، تو وہ سب یقیناً باطل ہیں اور ان پر "حق" کا حکم لگانا صریح ظلم ہے۔
بجائے اس کے کہ ہم اس جھوٹی رواداری کا مظاہرہ کریں، ہمیں تو اپنے تمام انسانی بھائیوں سے یہ کہنا چاہیے کہ، دوستو براہ کرم تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ دو اور حق و باطل کی آمیزشوں پر جمے رہنے کے بجائے اس چیز کو قبول کرو جو خالص اور بے آمیز حق ہے۔ حق کسی نسل یا قوم یا ملک کی موروثی جائداد نہیں ہے بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ یہ میراث خداوند عالم کی طرف سے سب ملکوں اور قوموں اور نسلوں کو بانٹی گئی تھی۔ دوسروں نے اسے اگر گم کر دیا اور اس کے ساتھ مخلوقات پرستی کے، ظلم و ناانصافی کے اور بے جا امتیازات کے زہر ملا دیئے تو یہ ایک بدقسمتی تھی، ہماری اور تمہاری سب کی بدقسمتی تھی، کوئی وجہ نہیں کہ تم اس بدقسمتی کے ساتھ خواہ مخواہ چمٹے رہو صرف اس وجہ سے کہ تمہارے آباؤ اجداد اس غلطی کے مرتکب ہو گئے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس میراث کو پاک کر جوں کا توں پہنچا دیا اور اس کے اندر کسی مخلوق پرستی کا، کسی ظالمانہ اور غیر منصفانہ رسم و رواج کا اور کسی قسم کے بے جا امتیازات کا زہر شامل نہ ہو سکا، تو یہ ایک خوش قسمتی ہے، ہماری اور تمہاری اور سب نوع انسانی کی خوش قسمتی ہے، اس کا شکر ادا کرو اور اس سے فائدہ اٹھانے میں صرف اس لیے تامل نہ کرو کہ خدا کی یہ نعمت ایک عرب کے ذریعہ سے تمہیں مل رہی ہے۔ حق تو اسی طرح کی عالمگیر نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جس طرح ہوا، پانی اور روشنی اس کی عالمگیر نعمتیں ہیں۔ پھر اگر ہوا سے تم محض اس لیے ناک بند نہیں کر لیتے ہو کہ وہ مشرق سے آ رہی ہے، پانی کو تم اپنے حلق سے اتارنے میں صرف اس بنا پر تامل نہیں کرتے ہو کہ اس کا چشمہ فلاں سرزمین میں واقع ہے، اور روشنی سے فائدہ اٹھانے میں تم کو صرف اس وجہ سے کوئی تامل نہیں ہوتا ہے کہ وہ فلاں شخص کے چراغ سے نکل رہی ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ خالص حق کی جو نعمت تم کو محمد عربی کے ذریعہ سے مل رہی ہے

اس کو لینے میں تم صرف اس لیے تامل کرو کہ اس کا پیش کرنے والا تمہاری سرزمین میں پیدا نہیں ہوا ہے۔

(ترجمان القرآن صفر ۵۳ھ۔ جون ۳۴ء)

اسلامی قومیّت کا حقیقی مفہوم

زمانۂ حال میں مسلمانوں کی جماعت کے لیے لفظ "قوم" کا استعمال بڑی کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عموماً یہی اصطلاح ہماری اجتماعی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے رائج ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے، اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کے لیے لفظ قوم دیانتش کے معنی میں کسی دوسرے لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان الفاظ میں اصل قباحت کیا ہے، جس کی وجہ سے اسلام میں ان سے پرہیز کیا گیا اور وہ دوسرے الفاظ کون سے ہیں جن کو قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ اس سے ہمارے بہت سے ان تصورات کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جن کی بدولت زندگی میں ہمارا رویہ بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

لفظ "قوم" اور اس کا ہم معنی انگریزی لفظ (Nation) یہ دونوں در اصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہلِ جاہلیت نے قومیت (Nationality) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (Cultural Basis) پر قائم نہیں کیا، نہ قدیم جاہلیت کے دور میں اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ ان کے دل و دماغ کے ریشوں میں نسلی اور روایتی علائق کی محبت کچھ اس طرح پلا دی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح آج بھی لفظ "نیشن" کے مفہوم میں مشترک جنسیت (Common Descent) کا تصور

لازمی طور پر شامل ہے، اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصورِ اجتماع (Conception of Society) کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً شعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اُس جماعت کے لیے کیونکر استعمال کی جا سکتی ہے جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا، جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی، اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطعِ نسب اور ترکِ علائقِ مادی سے ہوا تھا۔

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ ان کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ جن لوگوں سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک ہے وہ خواہ کسی ملک اور کسی قوم و نسل سے تعلق رکھتے ہوں ان میں شامل ہو جاتے ہیں، اور جن سے اس چیز میں ان کا اشتراک نہیں ہے وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے، ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول اور مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن سب کو ایک سمجھتا ہے کیونکہ ان کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہر حال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:-

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ — شیطان ان پر غالب آ گیا اور اس نے خدا سے

فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (المجادلہ: ۱۹)

انہیں غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد ہی رہنے والی ہے۔

برعکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے ان کے آبا و اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتاتے ہوئے طریق فکر اور مسلک حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے، حتیٰ کہ بیٹا باپ کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ مِلَّتَيْنِ دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے، محض اس لیے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو چکے۔ قرآن میں ہے لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ، نہ وہ ان کے لیے حلال نہ یہ ان کے لیے حلال۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری، ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کرا دیتا ہے حتیٰ کہ حزب اللہ والے کے لیے خود اپنی نسلی برادری کے ان لوگوں میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے جو حزب الشیطان سے تعلق رکھتے ہوں۔ قرآن کہتا ہے "مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن لونڈی مشرک خاتون سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام مشرک آزاد شخص سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔"

پارٹی کا یہ اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے جو دائماً قائم رہتی ہے تاوقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول تسلیم نہ کرلیں۔ قرآن کہتا ہے :

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ۔ (الممتحنہ : ۴)

تمہارے لیے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی (نسلی) قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو کوئی واسطہ نہیں ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت پڑ گئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ مگر تمہارے لیے ابراہیمؑ کے اس قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے کافر باپ سے کہا کہ میں تیرے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۔ (التوبہ : ۱۱۴)

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا تو محض اس وعدے کی بنا پر تھا جو وہ اس سے کر چکا تھا، مگر جب اس پر کھل گیا کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گیا۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک خاندان والوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان بھی محبت کا تعلق حرام کر دیتا ہے حتیٰ کہ اگر باپ اور بھائی اور بیٹے بھی حزب الشیطان میں شامل ہوں تو حزب اللہ والا اپنی پارٹی سے غداری کرے گا اگر ان سے محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْا اٰبَاءَهُمْ اَوْ اَبْنَاءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ..... اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (المجادلہ: ۲۲)	اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے خواہ وہ ان کے باپ بیٹے بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں ۔۔۔ یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخرکار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ "اُمّت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ اُمّت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک موجود ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانہ کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں۔ ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی امت کہے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس امر مشترک کی بنا پر امت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران: ۱۱۰)	تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت[1] بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر نگران[2] ہو اور رسول تم پر نگراں ہو۔

---

[1] لفظ وسط کے معنی متوسط اور درمیانی کے ہیں اور اسی معنی سے اعلیٰ اور اشرف کا مفہوم بھی پیدا ہوا ہے۔

[2] شہید کے معنی گواہ کے بھی ہیں اور نگران کے بھی، اور یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

شُہَدَآءَ۔ (بقرہ: ۱۴۲)

ان آیات پر غور کیجیے "بیچ کی امت" سے مراد یہ ہے کہ "مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) ہے جو دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے بھی ان کا تعلق نہیں رہا ہے، اس لیے یہ بیچ کی امت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے ان کا ایک دوسرا تعلق قائم ہوگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض سرانجام دیں۔ "تم نوع انسانی پر نگران ہو" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔ اور "نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے لیڈر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ اور يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا ہاتھ

ہے۔" بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے جماعت، حزب اور پارٹی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جبکہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ منسلک ہو۔ لیکن پارٹی، جماعت اور حزب کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں، ان کے لحاظ سے اصول و مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ آپ ایک پارٹی کے اصول و مسلک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے، نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں، نہ اس کے مفاد کے محافظ بن کر نمودار ہو سکتے ہیں، اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و مسلک سے تو متفق نہیں ہوں، لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں اور میرا نام اس کے ممبروں سے ملتا جلتا ہے اس لیے مجھے ممبروں کے سے حقوق ملنے چاہییں، تو آپ کا یہ استدلال اتنا مضحکہ خیز ہوگا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن پارٹی کے تصور کو قوم کے تصور سے بدل ڈالیے۔ اس کے بعد یہ سب حرکات کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔

اسلام نے اپنی بین الاقوامی پارٹی کے ارکان میں یک جہتی اور ان کی معاشرتی زندگی میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے اور ان کی ایک سوسائٹی بنا دینے کے لیے حکم دیا تھا کہ آپس ہی میں شادی بیاہ کرو۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اولاد کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تجویز کیا گیا تھا کہ وہ خود بخود پارٹی کے اصول و مسلک کے پیرو بن کر اٹھیں اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ افزائشِ نسل سے بھی پارٹی

کی قوت بڑھتی رہے یہیں سے اس پارٹی کے قوم بننے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعد میں مشترک معاشرت، نسلی تعلقات اور تاریخی روایات نے اس قومیت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔

اس حد تک تو جو کچھ ہوا درست ہوا لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس حقیقت کو بھولتے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک "قوم" بن کر رہ گئے ہیں، اسی طرح کی قوم جیسی کہ جرمن ایک قوم ہے یا جاپانی ایک قوم ہے، یا انگریز ایک قوم ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ اصول اور مسلک ہے جس پر اسلام نے ان کو ایک امت بنایا تھا، وہ مشن ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے پیرووں کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے انہوں نے غیر مسلم قوموں سے "قومیت" کا جاہلی تصور لے لیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی غلطی ہے اور اس کے قبیح اثرات اتنے پھیل گئے ہیں کہ احیائے اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک کہ اس غلطی کو مٹا نہ دیا جائے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت، رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے، شخصی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی، بلکہ صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ایک رکن اگر جماعتی اصول اور مسلک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرنا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدارانہ طرزِ عمل سے روکیں، نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں، پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال باہر کریں۔ ایسی مثالیں بھی دنیا میں ناپید نہیں ہیں کہ جو شخص پارٹی کے مسلک سے انحراف کرتا ہے اسے قتل کر دیا جاتا ہے[1]۔ لیکن ذرا مسلمانوں کا حال دیکھیے کہ اپنے آپ کو پارٹی کے

---

[1] اسلام میں قتلِ مرتد کی یہی بنا ہے۔ روسی اشتراکی بھی اشتراکیت سے مرتد ہونے کی یہی سزا دیتے ہیں۔

بجائے "قوم" سمجھنے کی وجہ سے یہ کیسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے غیر اسلامی اصولوں پر کام کرتا ہے تو دوسرے مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ اس کی مدد کریں گے۔ اگر مدد نہیں کی جاتی تو شکایت کرتا ہے کہ دیکھو مسلمان مسلمان کے کام نہیں آتے۔ سفارش کرنے والے اس کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھائی کا بھلا ہوتا ہے اس کی مدد کرو۔ مدد کرنے والے بھی اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو اپنے اس فعل کو اسلامی ہمدردی سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سارے معاملہ میں ہر ایک کی زبان پر اسلامی ہمدردی، اسلامی برادری، اسلام کے رشتۂ دینی کا نام بار بار آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام کے خلاف عمل کرنے میں خود اسلام ہی کا حوالہ دینا اور اس کے نام سے ہمدردی کرنا صریح لغو بات ہے۔ جس اسلام کا یہ لوگ نام لیتے ہیں اگر حقیقت میں وہ ان کے اندر زندہ ہو تو جونہی کہ ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسلامی جماعت کا کوئی شخص کوئی کام اسلامی نظریہ کے خلاف کر رہا ہے، یہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں اور اس سے توبہ کرا کے چھوڑیں۔ کسی کا مدد چاہنا اور کسی کا سفارش کرنا تو درکنار، ایک نری اسلامی سوسائٹی میں تو کوئی شخص اصول اسلام کی خلاف ورزی کا نام تک زبان پر نہیں لا سکتا۔ لیکن آپ کی اس سوسائٹی میں رات دن یہی معاملہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے اندر جاہلی قومیت آگئی ہے۔ جس چیز کو آپ اسلامی اخوت کہہ رہے ہیں یہ دراصل جاہلی قومیت کا رشتہ ہے جو آپ نے غیر مسلموں سے لے لیا ہے۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد یا قومی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس دولت آئے، ان کی عزت بڑھے، ان کو اقتدار نصیب ہو، اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا بن جائے بلا لحاظ اس کے کہ یہ سب فائدے

اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرزِ عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نام نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفت اسلام سے قطع نظر کرکے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسم ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت، ان کی ترقی کو آپ اسلام کی ترقی، ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں، خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اسلام کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح جرمنیت کسی اصول کا نام نہیں، محض ایک قومیت کا نام ہے اور جس طرح ایک جرمن قوم پرست صرف جرمنوں کی سر بلندی چاہتا ہے خواہ کسی طریقہ سے ہو، اسی طرح آپ نے بھی "مسلمانیت" کو محض ایک قومیت بنا لیا ہے۔ اور آپ کے مسلمان قوم پرست محض اپنی قوم کی سر بلندی چاہتے ہیں خواہ یہ سر بلندی اصولاً اور عملاً اسلام کے بالکل برعکس طریقوں کی پیروی کا نتیجہ ہو۔ کیا یہ جاہلیت نہیں ہے؟ کیا درحقیقت آپ اس بات کو بھول نہیں گئے ہیں کہ مسلمان صرف اس بین الاقوامی پارٹی کا نام تھا جو دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایک خاص نظریہ اور ایک عملی پروگرام لے کر اٹھی تھی؟ اس نظریہ اور پروگرام کو الگ کر دینے کے بعد محض اپنی شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو لوگ کسی دوسرے نظریہ اور پروگرام پر کام کرتے ہیں ان کے کاموں کو آپ "اسلامی" کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ جو شخص سرمایہ داری کے اصول پر کام کرتا ہو اسے اشتراکی کے نام سے یاد کیا جائے؟ کیا سرمایہ دارانہ حکومت کو کبھی آپ اشتراکی حکومت کہتے ہیں؟ کیا فاشستی طرزِ ادارہ کو آپ جمہوری طرزِ ادارہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اس طرح اصطلاحوں کو بے جا استعمال کرے تو آپ شاید اسے جاہل اور بے وقوف کہنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ مگر یہاں ہم

دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کو بالکل بے جا استعمال کیا جا رہا ہے اور اس میں کسی کو جاہلیت کی بو تک محسوس نہیں ہوتی۔

مسلمان لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ "اسم صفت" ہی ہو سکتا ہے، اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے لہٰذا آپ اس لفظ کو شخص مسلمان کے لیے اس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا چینی کے الفاظ شخص ہندو یا شخص جاپانی یا شخص چینی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جونہی اصولِ اسلام سے ہٹا اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت میں کرتا ہے، اسلام کا نام اسے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طور پر "مسلمان کا مفاد"، "مسلمان کی ترقی"، "مسلمان کی حکومت و ریاست"، "مسلمان کی وزارت"، "مسلمانوں کی تنظیم" اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آپ صرف ان مواقع پر بول سکتے ہیں جبکہ یہ چیزیں اسلامی نظریہ اور اصول کے مطابق ہوں اور اس مشن کو پورا کرنے سے متعلق ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی لفظ مسلمان کا استعمال درست نہیں، آپ ان کو جس دوسرے نام سے چاہیں موسوم کریں، بہر حال مسلمان کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے، کیونکہ صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا قوم کا نام اشتراکی ہو اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد یا کسی حکومت کو اشتراکی حکومت یا کسی تنظیم کو اشتراکیوں کی تنظیم یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جا سکے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملہ میں آپ نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جا سکتا ہے۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی تاریخ کے

متعلق آپ کے رویہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہوئی تھیں آپ ان کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں محض اس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا آپ اسے "اسلامی تمدن" کہتے ہیں، حالانکہ اس کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرہ کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہی نہیں کہ ایک میت کو سپردِ خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تیار کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصہ آبِ زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے، بلکہ آپ اسے "تاریخ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں، گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن کو اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر اپنی گزشتہ تاریخ کا احتساب کریں اور پورے انصاف کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کر کے دیکھیں اور دکھائیں، اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویۂ نظر میں یہ کجی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا یہ گمان ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جا سکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویۂ نظر آپ نے اپنی ملی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کر کے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس قوم کی طرف سے، یا اس کے نام سے، یا اس کے لیے

ہر شخص اور ہر گروہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ، بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں کی قوم" سے تعلق رکھتا ہو، خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اس پارٹی کے ساتھ لگ چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آتے خواہ اس کا مشن اسلام کے مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جاتے، خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں سماتے جب کسی جگہ مسلمان آپ کو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے، خواہ وہ اس اقتدار کو بالکل اسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اکثر ان چیزوں کا نام اسلامی مفاد رکھتے ہیں جو حقیقتہً غیر اسلامی ہیں، ان اداروں کی حمایت اور حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصولِ اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوتے ہیں، اور ان مقاصد کے پیچھے اپنا روپیہ اور اپنی قومی طاقت ضائع کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک قوم سمجھ رکھا ہے اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بین الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مفاد اور کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمران بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جبتک آپ اپنے اندر قوم کے بجاتے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو زندہ تصور نہ بنائیں گے، زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویہ درست نہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن صفر ۱۳۵۸ھ۔ اپریل ۱۹۳۹ء)

اِستدراک اس مضمون کی اشاعت کے بعد متعدد اصحاب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ "اسلامی جماعت" کو "قوم" کے بجاتے "پارٹی" کہنے میں اس امر کی گنجائش نکلتی ہے کہ وہ کسی وطنی قومیت کی جزبن کر رہے۔ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ

مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو "قوم" کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر مسلمان ایک پارٹی ہیں تو وہ بھی اپنے وطن کی قوم کا جز بن کر رہ سکتے ہیں۔

چونکہ جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی جماعت یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں اس وجہ سے وہ غلط فہمی پیدا ہوتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت مستعمل ہونے سے پیدا ہو گیا ہے۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے، نظریے، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں۔ اسی معنی میں قرآن نے "حزب" اور "امت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسی معنی میں "جماعت" کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے اور یہی مفہوم "پارٹی" کا بھی ہے۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جز بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ او جہانی تصور (World Idea) لے کر اٹھتی ہے، جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے (بلا لحاظ قوم و وطن) ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے، جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے جس کا نظریہ و مسلک عقائد و افکار اور اصول و اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جز بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ ان نسلی و روایتی تعصبات کو

توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنی ہیں، پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کی بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding Nationality) بناتی ہے، یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی اور اصولی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں بلکہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدن (Civilization) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار تمدن یا باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماعی (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود یہ حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (mere Accident of Birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قومیت میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے اگر

مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے ۔ اس کی قومی حیثیت اس کی جماعتی حیثیت کی فرع ہے ۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے ۔ اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے ۔ بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب تو کیا تھا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش بھی کی تھی مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے ۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brother hood) بنا کر رہ گئے ۔ بعد میں مغرب کی سائنٹفک تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا ، مگر اول یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی ۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدود کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو ۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے ، اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے[1] ۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر

---

[1] بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں ۔ اسٹالین اور اس کی جماعت کے طرز عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے ۔ روسی اشتراکیت کے لٹریچر میں ، حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء کے جدید روسی دستور حکومت میں بھی جگہ جگہ "فادرلینڈ" (آبائی وطن) کا ذکر ملتا ہے ۔ مگر اسلام کو دیکھیے یہ ہر جگہ "دارالاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ فادرلینڈ یا مدرلینڈ کا ۔

تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قوم کا رکن ہے اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا اِدّعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی ناسمجھی غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے اندر "تاریخی قومیت" کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصل حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفۂ اجتماعی کی بنیاد پر ایک عالمگیر اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں، ان کی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں، ان کے اخباروں اور رسالوں میں کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی کے اس مشن کا ذکر نہیں آتا جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی

تمام بات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ "مسلمانوں کا مفاد" ہے ـــــ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوتے ہوں، اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجۂ آخر اس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے ـــــ اس مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا وہ پابند نہ تھا نہ یہ ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے، یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ "مسلمانوں" کے لیے مفید ہو وہ حق ہے یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں۔ اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party sense) پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے بُرے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر رہرو کے پیچھے چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، خواہ وہ اسلام کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنلسٹ بھی بنتا ہے، کمیونسٹ بھی بنتا ہے۔ فاشستی اصول تسلیم کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی اور مابعد الطبیعی افکار اور علمی نظریات میں سے قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی، اجتماعی یا تمدنی تحریک ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ "مسلمان" کوئی پیدائشی

لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت ہے۔ جو شخص اسلام کی راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلے اس کو "مسلمان" کہنا اس لفظ کا بالکل غلط استعمال ہے مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی طرح کی متناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح "کمیونسٹ مہاجن" اور "جینی قصائی" کی اصطلاحیں متناقض ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ہر چیز کے لیے اپنی صفت کے لحاظ سے کمال کے دو درجے ہوا کرتے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ جس صفت سے متصف ہے اس میں اتصاف کی انتہا کو پہنچ جائے۔ اور دوسرا درجہ یہ کہ اس کی ذات میں وہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسری چیزوں تک متعدی ہو اور دوسروں کو بھی اپنی صفت کے رنگ میں رنگ دے۔ برف کا کمالِ اوّل یہ ہے کہ وہ انتہا درجہ کی سرد ہے اور کمالِ ثانی یہ ہے کہ وہ دوسری چیزوں کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ آگ کا کمالِ اوّل یہ ہے کہ وہ خود انتہا درجہ کی گرم ہے۔ اور کمالِ ثانی یہ کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی اسی گرمی سے گرم کر دیتی ہے۔ بالکل یہی حال نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ نیک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا مجسمہ بن جاتے اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ اسی طرح بُرے آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود بدی کی صفت سے بدرجۂ اتم متصف ہو اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنی اس بدی کو دوسروں تک متعدی کر دے۔

اس قاعدۂ کلیّہ کے مطابق کافر اور مومن کے لیے بھی کمال کے دو مرتبے ہیں۔ کافر اگر بجائے خود اپنے عقیدۂ کفر میں راسخ اور مضبوط ہو تو وہ کمالِ کفر کے پہلے مرتبے میں ہے اور اگر وہ کفر کی تبلیغ کرے، لوگوں کو راہِ حق سے روک کر باطل کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرے، اور اپنے زورِ بیان، یا زورِ مال یا زورِ شمشیر یا کسی دوسرے زور سے کفر کی اشاعت کرے تو وہ کمالِ کفر کے دوسرے مرتبہ کی بھی تحصیل کر لیتا ہے۔ اور ان دونوں کو جمع کرنے کے بعد اس کے لیے کمال کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح مومن اگر خود اپنے عقیدۂ ایمان میں راسخ اور اطاعتِ حق میں کامل ہو تو وہ کمالِ ایمان کے پہلے مرتبے پر فائز ہو گا، اور اگر اس میں یہ صفت اتنی

شدید ہو جاتے کہ وہ دوسروں میں بھی ایمان واطاعتِ حق کی تبلیغ واشاعت کرنے لگے اور دوسروں میں بھی اپنی زبان وقلم اور اپنے کیرکٹر اور اپنے برتاؤ کے اثر سے اور اپنے دست وبازو کی جدوجہد سے اسلام اور اطاعتِ حق کی صفت پیدا کر دے تو اس کو کمالِ ایمان کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ پورا مومن کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس مضمون کو سورۂ آلِ عمران کے دسویں اور گیارہویں رکوع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا:

قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۔ (آل عمران:۹۸)	(اے محمد ان سے) کہو کہ اے اہلِ کتاب تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟

پھر فرمایا:

قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۔ (آل عمران:۹۹)	کہو کہ اے اہلِ کتاب تم کیوں ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو؟

یہ دونوں آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر کا پہلا کمال آیاتِ الٰہی کا خود منکر ہونا ہے، اور دوسرا کمال اس کی اشاعت کرنا، اور لوگوں کو خدا کے سیدھے رستے سے روکنا اور اعتقاد و عمل کے ٹیڑھے راستے ان کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد مومنوں سے خطاب شروع ہوتا ہے، اور ان سے بھی دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے

(آل عمران: ۱۰۳) رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔

دوسرے یہ کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(آل عمران: ۱۰۴)

اور تم میں سے ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بلاتی ہو، اچھے کام کا حکم دیتی ہو اور بُرے کام سے روکتی ہو۔ اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں۔

یہاں ایمان کے بھی دو درجے بتا دیئے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مومن اللہ سے ڈرنے والا ہو، اور مرتے دم تک اوامرِ الٰہی کا مطیع رہے، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رکھے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے دوسرے ابنائے نوع کو بھی نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔

پھر کمالِ ثانی کے اندر بھی بہت سے مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موم بتی، بجلی کا قمقمہ، چاند اور سورج، سب پر مُنیر اور روشن گر ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر روشن گری میں ان کے مدارج متفاوت ہیں۔ موم بتی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے۔ بجلی کے قمقمے کی روشنی ایک بڑے مکان کی حد تک پھیل سکتی ہے۔ چاند کی روشنی زمین اور اس کے اردگرد کی فضا تک محدود ہے۔ مگر سورج ایک عالم کو اپنی روشنی سے چمکا رہا ہے اور ہمارا پورا انتظامِ شمسی اس کی روشنیوں سے منور ہے۔ اسی طرح مومن اگر اپنے جیسے ایک انسان کے دل میں بھی ایمان کی شمع روشن کر دے تو وہ کمالِ ثانی کے مرتبہ میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن یہ اس کمال کا پہلا درجہ ہوگا۔ پھر ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک میں دعوت الی الخیر کے مدارج ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت الی الخیر تمام عالمِ انسانی کے لیے عام ہو، وہ ساری دنیا کو نیکی کی طرف بلائے، پورے رُبع مسکوں میں اللہ کا فوجدار بن جائے، بدی اور منکر جہاں بھی ہو اس کے استیصال کے لیے آستین چڑھائے اور اپنے آپ کو کسی خاص

برادری، کسی خاص قوم، کسی خاص ملک اور کسی خاص نسلی یا جغرافی حد کے اندر محدود نہ سمجھے۔ یہ کمالِ ایمان کا سب سے بڑا اور اونچا درجہ ہے اور چونکہ حضرت حق جل مجدہ نے ہر معاملہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک بلند مطمح نظر پیش فرمایا ہے اور کسی جگہ پست حوصلگی کی تعلیم نہیں دی ہے، اس لیے آگے چل کر بارہویں رکوع میں صاف فرما دیا کہ مسلمان کا شخصی اور قومی نصب العین و مقصدِ حیات یہی ہے کہ وہ تمام عالم کو خدا کی شریعت کا محکوم بنانے کی کوشش کرے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ ...... الخ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے اور اختلاف کا منشا لفظ مِنْكُمْ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ مِنْ یہاں تبعیض کے لیے نہیں بلکہ تبیین کے لیے آیا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں وہ تبعیض ہی کے لیے آیا ہے۔

پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا ہے، جیسا کہ فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ... الخ اور حقیقت میں ہر مکلف ہستی پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی کو دفع کرے خواہ ہاتھ سے کرے یا زبان سے کرے یا اور کچھ نہ ہو سکے تو قلب ہی سے کرے۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ "تم ایسی امت ہو جاؤ جو خیر کی طرف بلاتی اور بُرائی سے روکتی ہو" کیونکہ مِنْ یہاں تبیین کے لیے ہے اور اس کی مثال یہ آیت ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (الحج: ۳۰) (یعنی بتوں کی گندگی سے بچو، نہ یہ کہ بتوں میں سے اس چیز سے بچو جو گندگی ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مِنْ یہاں تبعیض کے لیے آیا ہے اور اس کے دو وجوہ

ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں ایک بڑا حصّہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں پر مشتمل ہے جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ امر بالمعروف و نہی المنکر کے لیے کچھ شرائط ہیں جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے لیے خیر اور معروف کا صحیح علم درکار ہے۔ اس کے لیے حکمت اور عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آدمی پہلے خود کمال درجہ کا متقی اور پرہیزگار ہو، تب لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دے۔

مگر کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں تامّل کرنے سے یہ اختلاف بآسانی دُور ہو سکتا ہے۔

ہم نے اُوپر کلام اللہ سے مومن کے لیے دو کمال ثابت کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا کمال یعنی خوفِ خدا اور اوامرِ الٰہیہ کے آگے سر جھکا دینا، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا تو ذاتِ مومن کے ساتھ صفتِ ایمان کے نفسِ قیام کے لیے ضروری ہے لہٰذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی مرتبہ کا متحقق ہونا لابد ہے کہ اگر وہ اس میں نہ ہو تو وہ مومن ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہ ہوگا۔ اگر برف میں سردی نہ ہو تو وہ برف ہی نہ ہوگی۔ اگر آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو خطاب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اور وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۲، ۱۰۳) اس آیت میں تبعیض کا نام و نشان تک نہیں بلکہ عموم کے ساتھ تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہییں۔

رہا دوسرا کمال تو وہ کمالِ زائد ہے جس کا متحقق ہونا، مومن کے مومن ہونے کے لیے نہیں اس کے کامل و مکمل اور بلند و عالیشان مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اب اس کمال کے اعتبار سے ایک قوم کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ قوم کے کم از کم ایک حصّہ میں کمالِ ایمان کا یہ اعلیٰ مرتبہ متحقق ہو اور باقی افراد

صرف کمالِ اول سے متصف رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم پہلی حالت میں ہو یعنی اگر تمہاری پوری قوم دنیا میں آفتاب ہدایت بن جائے اور تمام اقوام عالم کو نیکی کا حکم دینے والی اور بدی سے روکنے والی ہو، تو تم دنیا کی بہترین امت ہوگے کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ وَتُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ (آل عمران: ۱۱۰) لیکن اگر تم میں اس اعلیٰ مرتبہ کی ہمت نہ ہو اور پوری قوم اس صفت سے متصف نہ ہو سکے، تو تمہارے اندر کم از کم ایک گروہ تو ایسا رہنا ہی چاہیے جو خیر کی طرف بلاتا رہے اور بدی سے روکتا رہے۔ وَلتَکُن مِّنکُم اُمَّۃٌ یَّدعُونَ اِلَی الخَیرِ (آل عمران: ۱۰۴) اسی لیے پہلی آیت میں عموم ہے مگر تاکید نہیں اور دوسری آیت میں تاکید ہے مگر عموم نہیں۔

کمالِ ایمان کے یہ دو درجے، جن کا بار بار ذکر آرہا ہے، صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں تو دونوں ایک ہی ہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہو گا، اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہو گا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اس کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور راہِ حق کی طرف دعوت نہ دے، کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعتِ مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک کہ رائحۂ ایمان اس کے جرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلتی ہے جہاں تک پھیلنے کا اس کو موقع ملے۔ یا چراغ کہ نورِ ایمان سے جہاں وہ منور ہوا اور اس نے آس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں۔ مشک میں جب تک خوشبو رہے گی وہ مشامِ جاں کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا روشن کرتا رہے گا۔ مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک مشک نہیں رہا اور چراغ نے اپنی چراغیت کھو دی۔ یہی حال مومن کا ہے کہ اگر وہ خیر کی طرف دعوت نہ دے، نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرلے اور اس سے روکے نہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خوفِ خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مدھم ہوگئی ہے۔ اسی لیے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے سہی - اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو بُرا سمجھے اور اس کو مٹانے کی خواہش رکھے۔ کیونکہ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے"۔ "جس دل میں بدی سے نفرت تک نہ ہو اس میں رائی برابر بھی ایمان نہیں"۔ اسی لیے قرآن مجید میں مومنوں کی عام صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ - يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱)

مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ - (التوبہ:۱۱۲)

وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کی حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ - (الحج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو زمین میں طاقت بخش دی تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

پھر جبکہ مومن کی ضروری صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کی حیثیت فرض کفایہ کی سی رکھی گئی اور اس معاملہ میں اتنی نرمی کی گئی کہ مسلمانوں کی پوری قوم میں سے صرف ایک جماعت کا آمر بالمعروف

اور ناہی عن المنکر ہونا کافی سمجھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدائے علیم وخبیر کو معلوم تھا کہ عہدِ رسالت کے گزر جانے کے بعد مسلمانوں کے ایمان ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جُوں جُوں زمانہ گزرتا چلا جائے گا یہ قوم مائلِ تنزل ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہوں گے مگر ان کی شمعِ ایمان میں اتنی روشنی بھی نہ ہوگی کہ اپنے قریبی ماحول کو ہی منوّر کر سکیں۔ بلکہ ظلمتِ کفر کے غلبہ سے خود ان کے اپنے نور بجھ جانے کا خوف ہوگا۔ لہٰذا ایسی حالتوں کے لیے اس نے فرمایا کہ تمہارے اندر کم از کم ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی موجود رہنی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دینے والی اور بدی کا مقابلہ کرنے والی ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایسی ایک جماعت بھی نہ رہے تو پھر تم کو عذابِ الٰہی اور قطعی ہلاکت وتباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا تھا ان پر داؤد اور عیسٰی بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی اس لیے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے نہ روکتے تھے اور یہ بہت بُری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔
(المائدہ: ۷۸، ۷۹)	

دوسری جگہ فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا	تم سے پہلے کی قوموں میں کچھ لوگ ایسے کیوں نہ ہوتے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ان میں ایسے لوگ اگر تھے

مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۔

(ہود : ۱۱۶، ۱۱۷)

بھی تو وہ بہت کم تھے سو ان کو ہم نے نجات دیدی۔ باقی رہے ظالم لوگ تو وہ مجرم تھے اور وہ ان دنیوی لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں۔ تو اے نبی تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو یوں ہی ظلم سے ہلاک کردے، دراں حالیکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ حَتّٰى يَرَوُا الْمُنْكَرَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ وَهُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰى أَنْ يُّنْكِرُوْهُ فَلَا يُنْكِرُوْهُ فَإِذَا فَعَلُوْا ذَالِكَ عَذَّبَ اللّٰهُ الْخَاصَّةَ وَالْعَامَّةَ ۔

(رواہ احمد)

اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے بُرے اعمال کی سزا نہیں دیتا جب تک کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور ان کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو اللہ خاص اور عام سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الْمُسِيْءِ وَلَتَأْطُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ إِطْرًا أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ أَوْ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ باختلاف قلیل)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کردے گا، یا تم پر اسی طرح لعنت کریگا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ...... الخ میں جو تبعیض ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہی ایسی جماعت مطلوب ہے جو داعی الی الخیر اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو، اور باقی مسلمانوں کے لیے اس خدمت کا بجا لانا واجب ہی نہیں۔ بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی رہنی چاہیے، جو خیر کی شمع روشن رکھے اور شر کی ظلمت کو دفع کرتی رہے۔ اگر ایسی ایک جماعت بھی ان میں موجود نہ رہی تو خیرِ امت ہونا تو درکنار اس قوم کا عذابِ الٰہی اور لعنتِ خداوندی سے بچ جانا بھی محال ہے۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ۔ ستمبر ۱۹۳۳ء)

نزولِ عذابِ الٰہی کا قانون

قرآن مجید میں جگہ جگہ ان قوموں کا ذکر آیا ہے جن پر گزشتہ زمانہ میں خدا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ ہر قوم پر نزولِ عذاب کی صورت مختلف رہی ہے۔ عاد پر کسی طرح کا عذاب اترا۔ ثمود پر کسی اور طرح کا۔ اہلِ مدین پر کسی دوسری صورت میں۔ آلِ فرعون پر ایک نئے انداز میں۔ مگر عذاب کی شکلیں اور صورتیں خواہ کتنی ہی مختلف ہوں، وہ قانون جس کے تحت یہ عذاب نازل ہوا کرتا ہے ایک ہی ہے اور ہرگز بدلنے والا نہیں۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (احزاب: ۶۲)

نزولِ عذاب کے اس قانون کی تمام دفعات پوری تشریح کے ساتھ قرآن مجید میں درج کی گئی ہیں۔ اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خوشحالی بڑھ جاتی ہے تو وہ غلط کاری اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور خود اس کی عملی قوتوں کا رُخ صلاح سے فساد کی طرف پھر جایا کرتا ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۶)

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم[1] دیتے ہیں اور وہ لوگ اس بستی میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں پھر وہ بستی عذاب کے حکم کی مستحق ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔

دوسرا قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا۔ بدکار قوم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتی ہے۔ خدا کسی قوم کو نعمت دے کر اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ ظالم قوم خود اپنی

[1] یہاں حکم سے مراد حکم طبیعی ہے۔ قانونِ فطرت کی ہر دفعہ کو قرآن حکمِ الٰہی اور اذنِ الٰہی کہتا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو ہمارے رسالہ "جبر و قدر" میں ملے گی۔

نعمت کے درپے استیصال ہو جاتی ہے اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (انفال: ۵۳)

یہ اس لیے کہ اللہ کبھی اس نعمت کو بدلنے والا نہیں ہے جو اس نے کسی قوم کو بخشی ہو تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنے آپ کو نہ بدل دے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (توبہ: ۷۰)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرتا۔ وہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

پھر یہ بھی اسی قانون کی ایک دفعہ ہے کہ خدا ظلم و بدنفسی پر مواخذہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے اور تنبیہیں کرتا رہتا ہے کہ نصیحت حاصل کریں اور سنبھل جائیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (النحل: ۶۱)

اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کے بدلے میں پکڑتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس باقی نہ رہتا۔ مگر وہ لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیا کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (انعام: ۴۲، ۴۳)

ہم نے تم سے پہلے کی قوموں میں بھی اسی طرح پیغمبر بھیجے اور ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ شاید وہ ہماری طرف عاجزانہ جھکیں پس جب ان پر ہماری طرف سے مصیبت آئی تو کیوں نہ وہ ہمارے آگے گڑگڑائے، مگر ان کے دل تو سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا۔

اس ڈھیل کے زمانہ میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظالم قوموں کو خوشحالی کے فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ وہ اس سے دھوکا کھا جاتی ہیں اور واقعی یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ ہم ضرور

نیکوکار ہیں ورنہ ہم پر نعمتوں کی بارش کیوں ہوتی ؟

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔

(مومنون : ۵۵، ۵۶)

کیا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو مال اولاد سے ان کی امداد کیے چلے جا رہے ہیں (تو اس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم ان کو فائدہ پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں ؟ (حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے اصلی بات جو کچھ ہے) اسے یہ نہیں سمجھتے[1]۔

آخر کار جب وہ قوم کسی طرح کی تنبیہ سے بھی نہیں سنبھلتی اور ظلم کیے ہی جاتی ہے تو خدا اس کے حق میں نزولِ عذاب کا فیصلہ کر دیتا ہے اور جب اس پر عذاب کا حکم ہو جاتا ہے تو کوئی قوت اس کو نہیں بچا سکتی۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا

(الکہف : ۵۹)

یہ بستیاں (جن کے آثار تم دیکھ رہے ہو) ان کو ہم نے اس وقت تباہ کیا کہ جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۔ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔

(ہود : ۱۰۲)

اور جب تیرا رب ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے تو وہ ایسی ہی بُری طرح پکڑتا ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوا کرتی ہے۔

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا

اور جب خدا کسی قوم کے حق میں برائی کا

---

[1] بعض نادان لوگ جو خدا کی سنت کو نہیں سمجھتے ان کی خوشحالی کو دیکھ کر اس احمقانہ غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ ضرور یہ لوگ مومن اور صالح اور خلیفۂ الٰہی ہیں ورنہ ان کو زمین کی وراثت کیسے مل جاتی۔ لیکن دیکھیے کہ قرآن ان لوگوں کی تردید کس طرح کرتا ہے جو محض دنیوی خوشحالی کو بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔

فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔ (رعد: ۱۱)

ارادہ کرتا ہے تو کوئی قوت اس کی شامت کو دفع کرنے والی نہیں ہوتی، اور پھر خدا کے مقابلہ میں ان کا کوئی مددگار نہیں نکلتا۔

یہ عذاب الٰہی کا اٹل قانون جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوتا رہا ہے اسی طرح آج بھی اس کا عمل جاری ہے۔ اور اگر بصیرت ہو تو آج آپ خود اپنی آنکھوں سے اس کے نفاذ کی کیفیت ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ مغرب کی وہ عظیم الشان قومیں جن کی دولتمندی و خوشحالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر کو دیکھ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جن پر انعامات کی پیہم بارشوں کے مشاہدے سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چہیتے بندے اور خیر و صلاح کے مجسمے ہیں، ان کی اندرونی حالت پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اس عذاب الٰہی کے قانون کی گرفت میں آچکی ہیں۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب و اختیار سے اس دیوِ ظلم (ظلم برنفسِ خود) کے چنگل میں پوری طرح پھنسا دیا ہے جو تیزی کے ساتھ انہیں تباہی و ہلاکت کی طرف لیے چلا جا رہا ہے۔

وہی صنعت و حرفت کی فراوانی، وہی تجارت کی گرم بازاری، وہی دہائے سیاست کی کامیابی، وہی علوم حکمیہ و فنونِ عقلیہ کی ترقی، وہی نظام معاشرت کی سرفلک بلندی، جس نے ان قوموں کو دنیا پر غالب کیا، اور روئے زمین پر ان کی دھاک بٹھائی، آج ایک ایسا خطرناک جال بن کر ان کو لپٹ گئی ہے جس کے ہزاروں پھندے ہیں اور ہر پھندے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقلی تدبیروں سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے، اور رہائی کی ہر تدبیر مزید گرفتاری کا سبب ہو جاتی ہے۔ ع

از سر گرہ زند گرہِ ناکشودہ را

یہاں ان تمام معاشی اور سیاسی اور تمدنی مصائب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے جن میں مغربی قومیں اس وقت گرفتار ہیں۔ بیانِ مدعا کے لیے اس تصویر کا ایک پہلو

پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قومیں کس طرح اپنے اوپر ظلم کر رہی ہیں اور کس طرح اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان مہیا کیے جا رہی ہیں۔

اپنے معاشی، تمدنی اور سیاسی احوال کی خرابی کے اسباب تشخیص کرنے اور ان کا علاج تجویز کرنے میں اہلِ فرنگ سے عجیب عجیب غلطیاں ہو رہی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا بڑا بلکہ اصلی سبب آبادی کی کثرت کو سمجھنے لگے، اور ان کو اس کا صحیح علاج یہ نظر آیا کہ افزائشِ نسل کو روکا جائے۔ معاشی مشکلات کے ساتھ ساتھ یہ خیال نہایت تیزی کے ساتھ مغربی ممالک میں پھیلنا شروع ہوا اور دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھا کہ لوگ اپنی نسل کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے، یا بالفاظِ دیگر اپنی نسل کے سب سے بڑے دشمن بن گئے، چنانچہ ضبطِ ولادت کے نئے نئے طریقے جو پہلے کسی کے ذہن میں بھی نہ آتے تھے عام طور پر رائج ہونے شروع ہوئے۔ اس تحریک کو ترقی دینے کے لیے نہایت وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت کی گئی۔ کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور جرائد خاص اسی موضوع پر شائع ہونے لگے۔ انجمنیں اور جمعیتیں قائم ہوئیں۔ ہر عورت اور مرد کو اس کے متعلق معلومات بہم پہنچانے، اور عملی آسانیاں فراہم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ غرض یورپ اور امریکہ کے عراقی "مصلحین" نے اپنی نسلوں کے خلاف ایک زبردست جنگ چھیڑ دی اور جوشِ اصلاح میں ان کو یہ سوچنے کا ہوش بھی نہ آیا کہ آخر یہ جنگ کہاں جا کر رُکے گی۔

توالد و تناسل سے مغربی قوموں کی نفرت کا حال یہ ہو گیا کہ ضبطِ ولادت کے متعدد طریقوں سے بچ بچا کر جو حمل ٹھہر جاتے ان کو بھی اکثر و بیشتر گرایا جانے لگا۔ روس میں تو یہ فعل قانوناً جائز قرار دے دیا گیا اور ہر عورت کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ تین مہینے کا حمل ساقط[1] کر دے۔ لیکن انگلستان اور دوسرے فرنگی ممالک میں بھی جہاں

---

[1] کئی سال کے تجربات کے بعد حال ہی میں انقلابی بحران کچھ کم ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اسقاطِ حمل کے جواز عام کا قاعدہ منسوخ کر دیا گیا، اور اب روس کی حکومت دوسری جنگِ عظیم میں کئی ملین آدمی کھو دینے کے بعد اپنی قوم کے لوگوں کو طرح طرح سے افزائشِ نسل کی ترغیب دے رہی ہے۔

استقاط حمل قانوناً ممنوع ہے خفیہ طور پر اسقاط کی کثرت وبا کی حد تک پہنچ گئی فرانس میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جتنے بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں قریب قریب اتنے ہی حمل ہر سال ساقط کیے جاتے ہیں، بلکہ بعض ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اسقاط کی تعداد پیدائش سے زیادہ ہے تیس اور چالیس برس کے درمیان شاید ہی کوئی عورت ہو جس نے اسقاط کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ گو قانوناً یہ فعل جرم ہے لیکن دواخانوں میں علانیہ اس کا ارتکاب ہوتا ہے اور فرضی بیماریاں رجسٹروں میں درج کر دی جاتی ہیں۔ انگلستان میں بہت سی دایاں ہیں جن کا کاروبار اسقاط ہی سے چلتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا اندازہ ہے کہ ہر پانچ عورتوں میں سے چار ایسی ضرور نکلیں گی جنہوں نے کبھی نہ کبھی اسقاط کیا ہوگا۔ جرمنی میں تقریباً دس لاکھ حمل ہر سال ساقط کیے جاتے ہیں[1] اور اتنی ہی تعداد زندہ پیدا ہونے والے بچوں کی ہے۔ بعض جرمن شہروں میں تو اندازہ کیا گیا ہے کہ گزشتہ بیس سال کے اندر جتنے بچے پیدا ہوئے اس سے دوگنے حمل ساقط کر دیئے گئے۔

عورت جس کے اندر فطرت نے ایک زبردست جذبۂ مادری رکھا تھا، مغربی ممالک میں اب اتنی شقی القلب ہو گئی ہے کہ وہ اپنے پیٹ کی اولاد کو ہلاک کرنے کے لیے خود اپنی جان تک کو خطرہ میں ڈالنے سے نہیں چوکتی۔ ڈاکٹر نارمن ہیر (Dr. Norman Haire) اپنی ایک تقریر میں بیان کرتا ہے کہ ایک حاملہ عورت اس کے ہاں آئی اور اس نے اسقاط کی خواہش ظاہر کی۔ جب قانونی مجبوری کی بنا پر عذر کیا گیا تو اس نے طرح طرح کی زہریلی دوائیں کھا کر پیٹ گرانے کی کوشش کی۔ سیڑھیوں پر سے قصداً اپنے آپ کو لڑھکایا۔ اونچے اونچے مقامات سے کودگئی، بھاری بھاری بوجھ اٹھائے۔ اور جب اس سے بھی اسقاط نہ ہوا تو آخر کار ایک اناڑی قابلہ کی دوا استعمال کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ مادام البرشیت (Madame Albrecht)

---

[1] بعد میں نازی تحریک نے اس وبا کو سختی کے ساتھ دبانے کی کوشش کی اور اس کے مہلک نتائج کو محسوس کر کے افزائش نسل کے لیے ایک زبردست مہم شروع کی۔

کا بیان ہے کہ عورتیں حمل ساقط کرنے کے لیے، وہ وہ حرکتیں کر گزرتی ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں۔ مثلاً پیٹ پر سخت آلات سے ضربیں لگانا۔ رحم کو مختلف آلات سے صدمہ پہنچانا، وحشیانہ طریقوں سے ناچنا، اپنے آپ کو قصداً اونچی جگہ سے گرا دینا، سخت سے سخت زہریلی چیزیں حتیٰ کہ بارود تک کھا جانا۔ وہ ایک فرانسیسی عورت کا قصہ بیان کرتی ہے کہ اس نے حمل سے تنگ آکر ایک لمبی پن لی اور رحم میں چبھو چبھو کر اسے اتنا زخمی کر لیا کہ خون جاری ہو گیا۔ اس قسم کی مجنونانہ حرکات سے بکثرت عورتیں ہر سال اپنی جان دے دیتی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انگلستان کے شفاخانہائے نسواں میں جتنی عورتیں ہر سال مرتی ہیں ان میں سے نصف کا سبب اسقاط حمل ہے اور یہی کیفیت دوسرے ممالک کی بھی ہے۔

ایم پال بیورو اپنی کتاب "اخلاقی دیوالہ کی راہ پر" (Towards Moral Bankruptcy) میں پیرس کی ایک رقاصہ کا حال لکھتا ہے کہ اس نے اپنے نومولود بچے کو نہایت بے رحمی کے ساتھ سر میں کیل ٹھونک کر قتل کیا اور جب وہ عدالت میں پیش ہوئی تو اس نے اپنے بیان میں صاف کہا کہ اس بچے کی پیدائش نے میری زندگی کے عیش کو کرکرا کر دیا تھا اس لیے میں نے اسے قتل کر دیا۔ طبی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ اس میں قطعاً کسی جنون کے آثار نہ تھے بلکہ اس نے پورے شعور کے ساتھ اس فعل کا ارتکاب کیا تھا۔

اس زبردست نسل کشی کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی شرح پیدائش میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ ۱۸۷۶ء اور ۱۹۳۰ء[1] کے اعداد کا مقابلہ کیجیے۔ انگلستان اور ویلز میں شرح پیدائش ۳۶ء۲ فی ہزار سے گھٹ کر ۱۶ء۳ (اور ۱۹۳۱ء میں ۱۵ء۸) رہ گئی ہے۔ جرمنی میں ۴۰ء۹ سے ۱۷ء۵۔ اٹلی میں ۳۹ء۲ سے ۲۶ء۷۔ سویڈن میں ۳۰ء۸ سے ۱۵ء۴۔ اور نیوزی لینڈ میں ۴۱ء۰ سے ۱۸ء۰ تک گھٹ گئی ہے

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد کی حالت ہم نے اپنے مضمون "اسلام اور ضبط ولادت" میں بیان کی ہے۔

سردست چونکہ ان ممالک میں شرح اموات بھی قریب قریب اسی نسبت سے کم ہوتی ہے اس لیے آبادی ایک حالت پر ٹھیری ہوئی ہے۔ لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر شرح پیدائش اسی رفتار سے گھٹتی رہی تو دس سال گزرنے کے بعد یہ ٹھیری ہوئی حالت قائم نہ رہے گی بلکہ آبادی گھٹنی شروع ہو جائے گی۔

سب سے زیادہ خطرناک حالت فرانس کی ہے تمام دنیا کے ممالک میں صرف یہی ملک ایسا ہے جہاں کی آبادی روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ ۱۸۸۰ء میں وہاں کی شرح پیدائش ۲۵ء۲ فی ہزار تھی، ۱۹۳۱ء میں ۱۷ء۱ رہ گئی مگر شرح اموات میں اس تناسب سے کمی نہیں ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں شرح اموات ۲۲ء۶ تھی۔ ۱۹۳۱ء میں صرف ۱۶ء۳ تک آ گری۔ فرانس کے ہمسایہ اور حریف ممالک جرمنی اور اٹلی میں ۱۲۵ اور ۱۳۰ آدمی فی مربع کیلو میٹر آباد ہیں۔ مگر فرانس میں صرف ۷۶ فی مربع کیلومیٹر آبادی کا اوسط ہے۔ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی سرزمین پر ۷۳۰۲۴۹ بچے پیدا ہوئے اور اس کے حریف جرمنی میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد ۱۰۳۱۵۰۸ تھی۔

مس سسلی ہیلٹن اپنی کتاب "جدید فرانس" (Modern France) میں لکھتی ہے کہ اس حالت نے فرانس کے مدبرین سیاست میں ایک گہری پریشانی پیدا کر رکھی ہے جس کا برا اثر نہ صرف فرانس بلکہ تمام دنیا کی سیاست پر مترتب ہو رہا ہے۔ فرانس کی عیش پسند آبادی دیہات کو چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے۔ اٹلی اور پولینڈ وغیرہ ممالک کے باشندے ہجرت کر کر کے فرانس میں آ رہے ہیں اور زمینوں پر قبضہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فی ہفتہ ۶ ہزار مہاجرین کا اوسط اندازہ لگایا گیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں فرانسیسی سرزمین پر جتنے بچے پیدا ہوئے ان میں تقریباً ۹ فی صدی غیر قوموں کے تھے۔ اس سے فرانسیسی سیاسیین کو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر ایک وقت ایسا آئے گا جب فرانسیسی قوم خود اپنے گھر میں غیر قوموں کی اکثریت سے مغلوب ہو جائے گی تاہم یہ خطرہ بعید ہے۔ بالکل قریبی خطرہ یہ ہے کہ فرانس کے حریف اٹلی اور جرمنی کی آبادی اس سے بہت زیادہ ہے۔ اگر تخفیف اسلحہ کی تجاویز کو منظور کر کے فرانس اپنے

آلاتِ جنگ کم کر دے تو آئندہ لڑائی میں کامیابی کا انحصار فوج کی کثرت پر ہوگا۔ اور اس میدان میں اکیلا جرمنی اور اکیلا اٹلی، فرانس پر در رہے گا۔ یہی خطرات ہیں جن کی وجہ سے فرانس کا طرزِ عمل بین الملّی مسائل میں دوسری اقوام کے خلاف ہے۔

یہ نتائج ہیں اس "عاقلانہ تدبیر" کے جو یورپ نے اپنی معاشی اور تمدنی مشکلات کو دُور کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس وقت فرانس کے سوا تمام فرنگی ممالک کی آبادی صرف اس وجہ سے ایک ٹھیری ہوئی حالت پر قائم ہے کہ شرح اموات سے شرح پیدائش ابھی تک زیادہ ہے، اس لیے شرح پیدائش کے گھٹنے کا اثر آبادی پر مترتب نہیں ہوا ہے۔ لیکن اہلِ فرنگ کے پاس یہ یقین کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے کہ شرح اموات اور شرح پیدائش کا یہی تناسب ہمیشہ برقرار رہے گا؟ کیا انہوں نے اس کا اطمینان کر لیا ہے کہ کسی روز مغربی افریقہ کے مچھر زرد بخار کے جراثیم لیے ہوئے خود انہی کے ہوائی جہازوں پر بیٹھ کر یورپ نہ پہنچ جائیں گے؟ کیا انہوں نے اس کی کوئی ضمانت لے لی ہے کہ کبھی یورپ میں اچانک انفلوانزا، طاعون، ہیضہ اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض میں سے کوئی مرض نہ پھیل جائے گا؟ کیا وہ اس سے بے خوف ہو چکے ہیں کہ ایک دن یکایک فرنگی سیاست کے بارود خانوں میں سے کسی ایک میں ویسی ہی کوئی چنگاری نہ آپڑے گی جیسی ۱۹۱۴ء میں سراجیفو میں گری تھی۔ اور پھر فرنگی قومیں خود اپنے ہاتھوں سے وہ سب کچھ نہ کر گزریں گی جو کوئی وبا اور کوئی بیماری نہیں کر سکتی[2]؟ اگر ان میں سے کوئی صورت بھی پیش آگئی اور دفعتہً یورپ کی آبادی سے چند کروڑ آدمی قتل یا ہلاک یا ناکارہ ہو گئے تو اس وقت یورپ کے باشندوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خود کس طرح تباہ کیا۔

---

[1] اس حالت کا بُرا انجام آخرکار دوسری جنگ عظیم میں فرانس نے دیکھ لیا۔

[2] بالآخر ستمبر ۱۹۳۹ء میں وہ چنگاری آ ہی پڑی۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ؟ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ؟ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ؟ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ - (اعراف: ۹۷تا۹۹)

کیا بستیوں کے لوگ مطمئن ہیں کہ ہمارا عذاب
ان پر راتوں رات نہ آجائے گا جبکہ وہ سوتے
ہوں گے؟ اور کیا ان بستیوں کے لوگوں نے
اس امر کا اطمینان کرلیا ہے کہ ہمارا عذاب
کبھی دن دہاڑے ان پر نہ آئے گا جبکہ وہ
کھیلتے ہوں گے؟ اور کیا وہ اللہ کی چال سے
بے خوف ہو گئے ہیں؟ سو اللہ کی چال سے
تو وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جن کو برباد ہونا ہے۔

ایسی ہی ایک قوم اب سے تین ہزار برس پہلے عرب کے جنوبی ساحل پر آباد
تھی جس کا ذکر قرآن میں سبا کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس قوم کی گھنی آبادی کا سلسلہ
سواحلِ بحرِ ہند سے سواحلِ بحرِ احمر تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان
اور یورپ کے درمیان جتنی تجارت اس زمانہ میں ہوتی تھی وہ سب اسی قوم کے ہاتھوں
میں تھی۔ اس کے تجارتی قافلے جنوبی ساحل سے مال لے کر چلتے تو مغربی ساحل تک
مسلسل بستیوں اور باغوں کی چھاؤں میں چلے جاتے تھے، وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ
وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ،
سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ (سبا: ۱۸) مگر انہوں نے اللہ کی اس
نعمت کو مصیبت سمجھا اور چاہا کہ ان کی یہ گھنی، متصل، مسلسل بستیاں کم ہو جائیں
اور ان کا باہمی فصل بڑھ جائے، فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا
أَنفُسَهُمْ (سبا: ۱۹) یہاں لفظ بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا سے پتہ چلتا ہے کہ تجارتی خوشحالی کی
وجہ سے جب آبادی بڑھی اور بستیاں گنجان ہو گئیں تو وہاں بھی یہی سوال
پیدا ہوا تھا جو آج یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ اور ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ سے
اشارہ ملتا ہے کہ شاید انہوں نے بھی مصنوعی تدبیروں سے آبادی گھٹانے
کی کوشش کی ہوگی۔ پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَ

مَزَّقْنٰھُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ۔
(سبا: ۱۹) خدا نے ان کو منتشر اور پارہ پارہ کر کے ایسا تباہ و برباد کیا کہ بس
ان کا وجود افسانوں ہی میں رہ گیا۔"

(ترجمان القرآن ۔ صفر ۱۳۵۲ھ ۔ جون ۱۹۳۳ء)

ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات

"امید واثق ہے کہ ایک محقق اور طالبِ حقیقت کے ذیل کے استفسارات پر ترجمان القرآن کے توسط سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف مستفسر کو ہی بلکہ تمام ناظرین کو تشکر و امتنان کا موقع دیں گے۔

(۱) قرآن نے مسیح کی نسبت چار وعدے ذکر کیے ہیں۔ چوتھا وعدہ ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آلِ عمران: ۵۵)

مسیح کے متبعین اور مسیح کے کافر دونوں کے وجود کا قیام قیامت تک پایا جانا اس بات کو مستلزم ہے کہ مسیح کے متبعین مسیح کے اتباع پر قائم رہیں اور اتباع کے لیے مسیح کی ہدایت اور تعلیم کا قائم اور محفوظ رہنا اور پھر قیامت تک محفوظ رہنا ضروری ہے، جس سے لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو درمیان میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے وجود کو گھسیٹرنے کے کیا معنی؟ دوسرے اسلام کا تخالف پہلی صورتِ مسلمہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اہلِ اسلام کے نزدیک اگر مسیح آسمان پر زندہ ہیں اور وہی آنے والے ہیں، پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے پہلے بھی وہی اور بعد میں بھی وہی، تو اس صورت میں درمیان میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور کا کیا مطلب؟ جبکہ غلبہ متبعینِ مسیح کا وعدہ استمرار بلا فصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا جا چکا ہے۔

(۳) آیت اِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاۗءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا

تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ (یونس: ۹۴) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب خود پیغمبرِ اسلام بھی قرآن کی وحی کے متعلق شک میں پڑ جاتے تھے تو اس صورت میں شک کو نکالنے کے لیے آپ کو حکم ہوا کہ اہلِ کتاب سے آپ اپنے شک کو نکلوا لیجیے، جس سے واضح ہے کہ یہ قرآن پیغمبرِ اسلام کو بھی شک میں ڈالنے والی چیز ہے اور اہلِ کتاب کی کتاب اور تعلیم ایسی چیز ہے کہ قرآن کے متعلق شک رکھنے والے کو بھی وہی دُور کرتی ہے، تو اس صورت میں بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے اور مسیح کے بعد آنے سے کیا فائدہ ہوا؟ اور قرآن کریم کی نسبت تو یہ ہے، مگر تورات کی نسبت لکھا ہے قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (آل عمران: ۹۳) جس سے ظاہر ہے کہ تورات قابلِ استشہاد ہے اور وہ اس صورت میں کہ محفوظ ہو اور محرّف و مبدل نہ ہو۔ اور یہ صورت بھی پہلی صورت پیش کردہ کی مؤید ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے کہ آپ ان ہر سہ سوالات پر جن کا مآل معنی واحد ہے ایمانداری کے ساتھ خوب روشنی ڈالیں گے ورنہ آپ کی خاموشی یا غلط اور ناقابلِ تسلی جواب سے کئی مسلمان کہلانے والے معزز اور اہلِ علم عیسائی ہونے والے ہیں۔ اور سات اشخاص تو عیسائی ہو چکے ہیں۔ شاید آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں۔ حیدر آباد میں اندر ہی اندر آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور قدرت شاہ خاں مبشر مسیحی کے ٹریکٹ "خط بنام مسلمانانِ حیدر آباد" نے کیا کچھ تہلکہ مچا دیا ہے کہ کئی خاندانوں کے خاندان عیسائی ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔"

(آپ کا مخلص ایک محقق)

کاتبِ خط کوئی مسیحی پادری معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے مسلمان بن کر سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ ایک سچے عیسائی کی طرح سامنے آ کر اعتراضات کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور اس صورت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب اسی محبت سے دیا جاتا جس کے ساتھ ایک بھٹکے ہوئے مسلمان کو دیا جا سکتا ہے۔ خیر طریق

اعتراض کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں۔ ہمارا کام بہرحال ان کے اعتراض کو رفع کرنا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

(۱) سب سے پہلے میں آپ کو اس بڑی اور بنیادی غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو نہ صرف آپ نے کی ہے بلکہ مسیحی معترضین بالعموم اس میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ غلطی یہ ہے کہ آپ لوگ جب اسلام اور پیغمبر اسلام کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے آپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نئے مذہب کا نام ہے جس کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بانی تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر توراۃ و انجیل برحق تھیں اور موسیٰ و مسیح برحق تھے تو ان کے بعد "اسلام" کیوں آیا اور "پیغمبر اسلام" کے ظہور کی کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن قاعدے کی بات ہے کہ اگر آپ کسی پر گرفت کرنا چاہتے ہوں تو اسے اس دعویٰ پر پکڑیے جو اس نے خود کیا ہو نہ کہ اس الزام پر جو آپ زبردستی اس کے سر منڈھ دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کب کہا تھا کہ میں ایک نئے مذہب کی بنا ڈال رہا ہوں اور میرے اس نو ایجاد مذہب کا نام اسلام ہے؟ وہ تو اس بات کے سرے سے مدعی ہی نہیں ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں اسی مذہب کو لے کر آیا ہوں جسے مجھ سے پہلے عیسیٰ اور موسیٰ اور ابراہیم اور نوح علیہم السلام لے کر آتے تھے اور اس مذہب کا نام ہمیشہ سے اسلام (خدا کی فرمانبرداری) ہی تھا نہ کہ یہودیت یا عیسویت۔ پھر وہ ان گذشتہ پیغمبروں کے بعد اپنے آنے کی وجہ جو بیان کرتے ہیں اس میں بھی کہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ موسیٰ اور مسیح علیہما السلام کی تعلیمات دنیا سے بالکل مٹ گئی تھیں، یا بالکل مسخ ہو گئی تھیں اس لیے بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اول تو توراۃ و انجیل میں تحریف ہو گئی ہے، دوسرے اس تحریف کے باوجود جو خدائی تعلیمات ان دونوں میں صاف صاف پائی جاتی ہیں ان سے ہٹ کر پیروانِ موسیٰ نے ایک نیا نظام "یہودیت" کے نام سے اور پیروانِ عیسیٰ نے ایک دوسرا نظام "مسیحیت" کے نام سے بنا لیا ہے، اور ان دونوں مذہبوں میں بہت

سی ایسی باتیں بنا کے دین بنالی گئی ہیں جو اس اسلام کے خلاف ہیں جسے موسیٰ اور عیسیٰ لے کر آئے تھے۔ اس لیے ضرورت پیش آئی کہ پھر اسلام کی اصل تعلیم کو اس کی خالص صورت میں، آمیزشوں سے چھانٹ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں بھیجا گیا ہوں۔ یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ۔ اب اگر آپ گرفت کرنا چاہتے ہیں تو اس دعویٰ پر کیجئے۔ یہ آخر بحث و تحقیق کا کونسا طریقہ ہے کہ ایک شخص کی طرف آپ بطور خود ایک دعوے خواہ مخواہ منسوب کرتے ہیں ——— جس سے وہ بشدت انکاری ہے ——— اور پھر اس کے دعوے پر نہیں، بلکہ اپنے منسوب کیے ہوئے دعوے پر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔ اس غلطی کا ارتکاب آج سے نہیں، ایک مدت سے مسیحی علماء کر رہے ہیں اور یہی غلطی ہے جس پر ان کے اکثر و بیشتر اعتراضات کی بنا قائم ہے۔ اگر آپ واقعی ایک محقق ہیں تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ پہلے آپ ٹھنڈے دل سے اس امر کی تحقیق فرمائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ وہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں یا وہ جو آپ ان کی طرف منسوب کر رہے ہیں؟ پھر اگر ثابت ہو کہ ان کا واقعی دعویٰ وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے تو یہ دیکھیں کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب "اسلام" (خدا کی فرمانبرداری) تھا؟ کیا وہ ازلی و ابدی حقیقتیں جن کو ماننے اور جن کے مطابق اخلاق و اعمال کو ڈھالنے پر انسان کی نجات کا مدار ہے ہمیشہ سے وہی نہیں رہی ہیں جن کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے؟ کیا خدا کے ہاں انسان کی نجات کا مدار ابراہیم اور اسحٰق کے زمانے میں کچھ اور اصولوں پر، موسیٰ اور عیسیٰ کے زمانے میں کچھ دوسرے اصولوں پر اور بعد کے زمانے میں ان سے مختلف اصولوں پر ہو سکتا ہے؟ اگر آپ مانتے ہیں کہ یہ اصول ازلی و ابدی ہیں تو کیا اصل مذہب یہودیت اور مسیحیت قرار پاتے ہیں یا اسلام؟ یہودیت اور مسیحیت میں تو آپ متعدد ایسی چیزیں پائیں گے جن کو اصول (یعنی مدار نجات) کا مرتبہ دیا گیا ہے حالانکہ وہ

ایک خاص نسل یا ایک خاص زمانے تک محدود ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں آپ قطعاً کوئی چیز ایسی نہیں پا سکتے جو نوعِ انسانی کی نجات کے عالمگیر ازلی وابدی اصولوں سے زائد یا ان سے مختلف ہو۔ اس نقطۂ نظر سے آپ دیکھیں گے تو سوال کی نوعیت ہی بدل جائے گی پھر تو سوال یہ نہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں کہاں آگئے بلکہ یہ ہوگا کہ آدم و نوح اور ابراہیم و اسحٰق کے وقتوں سے جو اصل دین (اسلام) چلا آرہا تھا اس کے سلسلہ میں یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں آداخل ہوئیں؟

(۲) آپ نے اپنے پہلے اعتراض میں جو آیت نقل کی ہے اس میں مسیح کا انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں اور مسیح کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اور اگر اتباع سے مراد اتباعِ کامل یعنی ٹھیک قدم بقدم چلنا مراد لیا جاتے تب تو نصاریٰ اس کے مصداق نہیں رہتے بلکہ صرف مسلمان ہی اس کے مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے اصل الاصول کو چھوڑ دیا اور یہودیوں کے بالمقابل ایک دوسرے طور پر ان کے ساتھ کفر کیا۔ بخلاف اس کے مسلمان اسی تعلیم پر قائم رہے جو حضرت عیسیٰ نے اور ان سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام نے دی تھی۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں آئے ہوں، ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی، اور وہ یہ تھی کہ خدائے واحد کی بندگی کرو۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجھ کو خدا مان لو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔ (آل عمران: ۷۹)	کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے، اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم خدا پرست بن جاؤ۔

اسی مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسیٰ بھی تھے اور انہوں نے بھی کبھی عبدیت کے مقام سے بال برابر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔ (النساء: ۱۷۲)
مسیح نے کبھی اس کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو۔

پس نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث اور عیسیٰ علیہ السّلام کی طرف الوہیّت کی نسبت کرنا اور ان کو خدا کا بیٹا کہنا دراصل حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے، اور جو لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی کفر کرتے ہیں جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ . . . لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ: ۷۲، ۷۳)
یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے، درانحالیکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔

اس لحاظ سے اِتَّبَعُوْكَ کے اصل مصداق مسلمان اور وہ عیسائی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا رسول مانتے ہیں، ان کی طرف کسی درجہ میں الوہیّت کو منسوب نہیں کرتے، اور اس عقیدۂ صالحہ کے قائل ہیں، اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ[۱]۔ (النساء: ۱۷۱) اور اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ[۲] (النساء: ۱۷۱) البتہ اگر اتباع سے مراد اتباعِ کامل نہ لیا جائے تو اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی متبعین مسیح میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اللہ کا یہ وعدہ دونوں سے متعلق ہو جاتا ہے کہ ان کو

---

[۱] مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور وہ کلمہ ہے جو اللہ نے مریم پر اتارا اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہے۔

[۲] اللہ تو اکیلا ہی الٰہ ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

یہودیوں پر غلبہ عطا فرماتے جنہوں نے مسیح کا قطعی اور کلی انکار کیا۔

(۳) مسیح کی، اور صرف انہی کی نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے قائم و محفوظ ہے، اور قیامت تک رہے گی جیسا کہ ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم و ہدایت کو مٹانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کو ثابت اور مستحکم کرنے اور ان آمیزشوں سے پاک کرنے آئے تھے جو انسانی خواہشات اور بشری وساوس کی بدولت اس میں گھل مل گئی تھیں نصاریٰ سے ان کی جنگ اس بات پر نہ تھی کہ وہ مسیح اور ان کی تعلیم و ہدایت کو کیوں مانتے ہیں، بلکہ اس بات پر تھی کہ وہ اس کو کیوں نہیں مانتے۔ انہوں نے بار بار اپنے خدا کی طرف سے فرمایا کہ یَاۤ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ[1] (النساء: ۱۷۱) اور یَاۤ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ[2] (المائدہ: ۶۸) اور وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ[3] (المائدہ: ۶۶) اور وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ[4] (المائدہ: ۴۷)۔ مگر جب دیکھا کہ مسیح کے متبعین سرے سے انجیل ہی کھو بیٹھے ہیں اور انجیل کے نام سے مسیح کی چند سوانح عمریاں لیے پھرتے ہیں جن میں مسیح کی تعلیم و ہدایت کا ایک بہت ہی خفیف حصہ اور وہ بھی آمیزشوں سے آلودہ پایا جاتا ہے تو انہوں نے نصاریٰ کے سامنے قرآن پیش کیا، اور کہا

---

[1] اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو (یعنی حد سے نہ بڑھو)

[2] اے اہل کتاب تم کسی طرح حق پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان کتابوں کو قائم نہ رکھو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہیں۔

[3] اور اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان کتابوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کی طرف نازل کی گئی تھیں قائم رکھتے تو اوپر سے اور نیچے سے (ہر طرف سے) ان کو رزق ملتا۔

[4] اہل انجیل کو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے انجیل میں نازل کیے تھے۔

کہ جو کچھ تم نے کھو دیا تھا، وہ پہلے سے بھی زیادہ مکمل صورت میں پھر تمہارے پاس آ گیا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جو مسیح نے دی اور ان سے پہلے موسیٰ اور ابراہیم اور نوح دے چکے ہیں، تم نے اور تم سے پہلے کی امتوں نے اس ہدایت کو بار بار گم کیا، مگر اب یہ ہدایت تم کو ایسی مستحکم صورت میں دی جاتی ہے کہ قیامت تک اس کو کوئی گم نہ کر سکے گا۔ پس درحقیقت متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی کتابوں میں نہیں بلکہ قرآن میں مسیح کی اصلی تعلیم قائم اور محفوظ ہے اور وہی انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

(۴) آپ کا یہ قول بھی محلِ نظر ہے کہ آیت زیر بحث سے لازم آتا ہے کہ "مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے"۔ یہ مفہوم آپ کے تخیل کا پیدا کردہ ہے۔ آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے۔ وہاں تو صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ جو تیرا انکار کرتے ہیں، ان پر ہم تیرا اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ معنی کیونکر نکالے جا سکتے ہیں کہ اب تو ہی دائمی ہادی ہے اور تیرے بعد ہی ہدایت پیش کرنے کے لیے کوئی اور نبی نہ بھیجا جائے گا۔ افسوس کہ آیات کتاب میں لفظی و معنوی تحریفات کرنے کی پرانی عادت ہمارے مسیحی بھائیوں میں سے ابھی تک نہیں گئی۔

(۵) مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا مطلب آپ ہم سے پوچھنے کے بجائے خود مسیح علیہ السلام سے پوچھیے۔ جن کا یہ ارشاد تمام تحریفات کے باوجود کتاب یوحنا میں اب تک موجود ہے:

> "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (تسلی دہندہ، یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھیرائے گا۔"
>
> (یوحنا ۱۶: ۷-۸)

اور یہ کہ:

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا" (یوحنا ۱۵: ۲۶)

اور یہ کہ:

"لیکن مددگار یعنی سچائی کی روح جسے باپ میرے نام سے بھیجے وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" (یوحنا ۱۴: ۲۶)

اور یہ کہ:

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" (یوحنا ۱۴: ۳۰)

اور یہ کہ:

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا" (۱۶: ۱۲-۱۳)

مسیح کے ان ارشادات سے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ظہور کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ "غلبۂ متبعین مسیح کا وعدہ، جو آپ کے نزدیک "استمرار بلا فصل" کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا ہے آنحضرت کے ظہور سے ٹوٹتا نہیں اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نے آکر مسیح کی گواہی دی (اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (المائدہ) اور وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ) (آل عمران: ۴۵) اور اس بہتانِ عظیم پر یہودیوں کو توبیخ کی جو وہ مسیح اور اس کی ماں پر رکھتے تھے۔ (وَبِکُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُهْتَانًا عَظِیْمًا) (النساء: ۱۵۶) اور وہ سب باتیں مسیحیوں کو

یاد دلائیں جو مسیح نے ان سے کہی تھیں دَ لْیَحْکُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ (مائدہ: ۴۷) ... مسیح اسی لیے گئے تھے کہ اس دوسرے آنے والے کے لیے جگہ خالی کر دیں جو ان کے بعد آکر اس کام کو پورا کرنے والا تھا جسے وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے۔

(۶) آیت اِنْ کُنْتَ فِیْ شَکٍّ (یونس ۹۴) الخ میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو قرآن پڑھے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ناظر یا سامع اگر تجھے قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو جن لوگوں کے پاس قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابیں موجود ہیں ان سے دریافت کرلے، ان کی گواہی سے تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ اشارہ ہے ان پیشگوئیوں کی طرف جو انبیائے سابقین کی کتابوں میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق موجود ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ	جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو ایسا
یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ	پہچانتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود اپنی اولاد کو
وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ	پہچانتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ
وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۴۶)	جانتے بوجھتے سچی بات کو چھپاتا ہے۔
وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ	اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے
یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ	ہیں کہ یہ قرآن درحقیقت تیرے پروردگار
بِالْحَقِّ۔ (انعام: ۱۱۵)	کی طرف سے اترا ہوا ہے۔

قرآن نے اپنی صداقت پر منجملہ بہت سی شہادتوں کے ایک شہادت انبیائے سابقین کی کتابوں سے بھی پیش کی ہے اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ بالخصوص ان لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو انبیائے سابقین کی کتابوں کو تو مانتے ہیں مگر قرآن کی صداقت میں شک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کتبِ سابقہ کی گواہی انہیں کے لیے معتبر ہو سکتی ہے۔ اس طلبِ شہادت میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے

یہ مطلب نکالا جاسکتا ہو کہ قرآن شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ بات کو اس کے صاف اور واضح مفہوم سے پھیر کر پیچیدہ مطالب نکالنے کی کوشش کرنا کسی طالب حق کا کام نہیں۔ ان طریقوں کو ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو نزاع وجدال کی الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

(۷) قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران: ۹۳) سے پہلے ایک اور فقرہ تھا جس کو آپ نے دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا۔ پوری آیت یہ ہے:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ	تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز
اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى	ان کے جنہیں اسرائیل نے توراۃ کے نزول سے
نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ	پہلے اپنے لیے حرام کر لیا تھا اے محمد کہو کہ توراۃ
قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ	لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (آل عمران: ۹۳)	

اس آیت میں یہود کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ تم توراۃ کے احکام کو چھپاتے ہو۔ اور یہ الزام ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے:

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ	وہ تجھ کو اپنے معاملہ میں کیسے حکم بنائیں جبکہ
التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ	خود ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ وَمَآ اُولٰٓئِكَ	کا حکم ہے اور پھر وہ اس سے روگردانی کرتے
بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (المائدہ: ۴۳)	ہیں وہ دراصل توراۃ پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔

قرآن میں یہودیوں کے دو جرم بتائے گئے ہیں۔ ایک جرم یہ ہے کہ وہ کتاب میں تحریف کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تحریفات کے باوجود جو کچھ کتاب میں سچی خدائی تعلیم باقی ہے اس کو بھی اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں چھپاتے اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ یہاں اگر توراۃ سے استشہاد ہے تو وہ یہودیوں کے جرم پر ہے اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ۔ اگست ۱۹۳۵ء)

کیا نجات کیلئے صرف کلمۂ توحید کافی ہے؟

"مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ اس حدیث میں اول تو ایمان بالرسل کے بغیر جنت کی بشارت دی گئی ہے، حالانکہ قرآن میں ایمان بالرسل پر جس شدت سے تاکید ہے ظاہر ہے، حتیٰ کہ کوئی ایمان بالرسل کے بغیر نہ راہِ ہدایت پا سکتا ہے نہ فوز و فلاح، نہ آخرت کی زندگی میں اس کے لیے کوئی حصہ ہے۔ نیز اس حدیث میں عملِ صالح کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ اعمالِ صالحہ جزوِ ایمان نہیں ہیں مگر قرآنِ کریم میں تو آخرت کی کامیابی و کامرانی، انعام و اکرام اور جنت کی بشارت اپنے صاحبِ ایمان اور صالح بندوں ہی کو دی گئی ہے۔

جیسا کہ آیاتِ ذیل سے واضح ہوتا ہے:۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ ... جَزَاؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ الآیہ (البینہ) ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ الآیہ (النساء: ۵۷)

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ الآیہ (التغابن: ۸)

ہماری سطح بیں نظروں میں یہ حدیث قرآن کے خلاف واقع ہو رہی ہے۔ براہِ کرم اپنے شغفِ علمی اور محققانہ نظر سے مستفید فرما کر مطلع فرما دیں تو موجبِ صد ممنونیت۔"

(ایک طالبِ حق از نظام آباد)

سب سے پہلے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ — بیشک جن لوگوں نے کہا کہ خدا ہی ہمارا رب ہے

ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ - (حٰم السجدہ: ۳۰)

پھر اس قول پر جم گئے ان پر ملائکہ اترتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) نہ خوف کھاؤ اور نہ رنج کرو اور اس جنت کی خوشخبری سے شادکام ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

دیکھیے یہاں بھی وہی بات دوسرے لفظوں میں کہی گئی ہے جو آپ کی نقل کردہ حدیث میں پائی جاتی ہے۔ جس طرح اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نجات اور بخشش اور دخولِ جنت کے لیے توحید کا اعتقاد کافی ہے، اور ایمان بالرسل اور عملِ صالح کی ضرورت نہیں، اسی طرح مذکورۂ بالا حدیث سے بھی ایسا نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح قرآن مجید کی یہ آیت ان آیات سے معارض نہیں ہے جو آپ نے پیش فرمائی ہیں، اسی طرح یہ حدیث بھی ان آیات سے معارض نہیں۔

حدیث اور قرآن دونوں کو سمجھنے میں ایک غلطی عام طور پر پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور کتبِ حدیث دونوں کو لوگ عام تصنیفات کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دوسری کتابوں میں ایک ایک مضمون ایک ایک جگہ تمام و کمال بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی کی گئی ہوگی لیکن دراصل معاملہ یہ نہیں ہے۔ قرآن ۲۲ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث میں حضورؐ کے وہ اقوال جمع کیے گئے ہیں جو ۲۲ سال کے طویل زمانے میں آپؐ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسبِ ضرورت ارشاد فرمائے ہیں۔ ان دونوں میں ایک چیز تو اسلام کی مرکزی تعلیم ہے جسے بار بار مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلامی ہدایت کی تفصیلات ہیں جن کو کہیں یکجا اور کہیں جُدا جُدا مختلف حالتوں اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سب پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے۔ ورنہ اگر کسی ٹکڑے کو کہیں سے لے لیا گیا اور دوسرے متعلق اجزا سے صرفِ نظر کر کے

اسی کو ایک مستقل چیز سمجھ لیا گیا تو یقیناً غلط فہمی پیدا ہوگی۔

مثال کے طور پر قرآن میں کہیں تو صرف ایمان باللہ پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اوپر منقول ہوا۔ کہیں صرف یوم آخر کے اقرار کی تاکید ہے (الانعام ۱۴) کہیں خدا کے ساتھ یوم آخر کا ذکر ہے (سورۂ بقرہ: ۸)، کہیں خدا کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے (آل عمران: ۱۸) کہیں خدا کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی تعلیم ہے (النور: ۹) کہیں یوم آخر اور کتب الٰہی پر اعتقاد رکھنے کی شدید تاکید ہے (النساء: ۱) کہیں خدا اور انبیاء اور ملائکہ کے انکار کو کفر و فسق قرار دیا گیا ہے (بقرہ: ۱۲) کہیں ایمان کے پانچ اجزاء بیان کیے گئے ہیں، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر (بقرہ: ۲۲) ان مختلف مقامات میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ایک مقام پر ایمانیات کو یکجا بیان کر کے دوسرے مقامات پر ان میں سے ایک ایک دو دو کو حسب موقع و ضرورت زیادہ زور دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس اصل سے قطع نظر کر کے اور کسی ایک آیت کو لیکر یہ دعویٰ کر دے کہ مومن ہونے کے لیے صرف خدا کی توحید پر، یا محض خدا اور یوم آخر پر، یا فقط خدا اور رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے، اور یہ گمان کرے کہ اجزائے ایمانی میں سے بعض کا انکار کر کے بھی بعض کا اقرار انسان کے لیے نافع ہو سکتا ہے، تو دراصل یہ قرآن کی زبان اور اس کے انداز بیان سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن میں کہیں صرف ایمان پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ہے، اور کہیں ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تقویٰ کو نجات کے لیے شرط ٹھیرایا گیا ہے، مثلاً وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَکُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (آل عمران: ۱۸) اور وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (پ) پھر اعمال صالحہ میں سے بھی کسی جگہ ایک کی تاکید ہے اور کسی جگہ دوسرے کی۔ کہیں نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا جا رہا ہے، کہیں راستبازی اور حسن معاملہ پر، کہیں عفت و عصمت پر، کہیں صلہ رحمی

اور قرابت داروں کے حقوق پر، کہیں اکلِ حلال اور ترکِ حرام پر۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا فلاح و نجات کا مدار اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص ان احکام اور ہدایات کے پورے مجموعہ سے قطع نظر کر کے محض کسی ایک آیت کو لے اور اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن مجید محض ایمان پر نجات کی بشارت دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ عملِ صالح ہو، یا اعمالِ صالحہ میں سے صرف نماز یا زکوٰۃ یا عفت یا صلۂ رحمی یا کسی اور چیز کو کافی سمجھتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ دوسرے حسنات بھی ہوں، تو یہ اس کی قلتِ تدبّر کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن تو اپنی مجموعی تعلیم میں فکری و عملی زندگی کے لیے ایک مکمل اسکیم پیش کرتا ہے جس میں ایمانیات، اخلاقیات اور عملی قوانین سب اپنی اپنی مناسب جگہ پر ہیں۔ مگر اس نے ان چیزوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک خاص حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک ایک ہدایت کو وہ الگ الگ مناسب مواقع پر دلوں میں اتارتا جاتا ہے۔ کبھی کوئی خاص واقعہ پیش آگیا، دیکھا کہ ذہن اس وقت ایک خاص ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار ہے، فوراً وہ ہدایت نازل کر دی گئی اور اس قوت کے ساتھ نازل کی گئی کہ قلب و روح میں پیوست ہو گئی۔ کبھی کسی خاص گروہ کی تعلیم پر حضورؐ کو مامور کیا گیا اور اس گروہ کے خاص حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اسی قسم کی ہدایات دی گئیں جو اس کی اصلاح کے لیے ضروری تھیں۔ کبھی کوئی خاص تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے تمثیلوں سے، اقوامِ گذشتہ کی نظیروں سے، انبیائے کرام کے حالات سے، آفاق و انفس کے شواہد سے دلوں کو اس کی قبولیت کے لیے تیار کیا گیا پھر وہ تعلیم دی گئی تاکہ اس کا اثر ہو اور وہ روح میں جذب ہو جائے۔ یہ انتہا درجہ کا حکیمانہ طریقِ تعلیم و تربیت اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد محض ایک اسکیم اور ایک ہدایت نامہ مرتب کر دینا نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اپنی اسکیم کو نافذ کرنا اور ایک جماعت کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا تھا جس کے لیے تدریج اور ترتیب اور موقع و محل کی مناسبت اور نفسیاتِ انسانی کی رعایت ناگزیر تھی۔

ٹھیک ٹھیک اسی حکیمانہ طریقہ کی پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ہر وقت تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے۔ ہر ایک کی ذہنیت، ہر ایک کی استعداد، ہر ایک کی اخلاقی، اعتقادی اور عملی حالت جداگانہ تھی۔ اگر آپ ہر وقت ہر شخص سے ایک ہی لگی بندھی بات کہتے اور ایک ہی قسم کی ہدایات دے کر رخصت کر دیا کرتے تو آپ کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوتی جس نے تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ حکیم مطلق کے شاگرد تھے اور اس حکیم نے جو طریق ہدایت اپنی کتاب میں اختیار کیا تھا اسی کی پیروی آپ بھی کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم موقع و محل کی رعایت کے ساتھ ہوتی تھی۔ جس وقت جس بات کا موقع ہوتا تھا اس وقت وہی بات آپ کی زبان سے نکلتی تھی، اور سیدھی دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ یہ چیزیں جو منتشر طور پر حدیثوں میں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھیے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعلیم کیا تھی اور آپ کس طرح اس کو ذہن نشین کراتے تھے۔ اگر آپ ان اکائیوں کو جوڑ کر ایک منظم عدد نہ بنائیں گے اور ایک ایک فرد کو الگ الگ لے کر اس سے جداگانہ نتائج اخذ کرنے لگیں گے تو ویسی ہی غلطی پیش آئے گی جیسی آیاتِ قرآنی کو متفرق طور پر دیکھنے سے پیش آسکتی ہے۔

اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر آپ ان احادیث پر نظر ڈالیے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات مختلف طریقوں سے بیان فرمائی ہیں۔

ایک مرتبہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اعرابی نے آکر آپ کے اونٹ کی نکیل تھام لی اور عرض کیا یا رسول اللہ، مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے جو مجھ کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دُور کر دے۔ فرمایا تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَّ تُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ۔ "اللہ کی بندگی کر اور اس کے ساتھ خداوندی میں کسی کو شریک نہ کر، نماز کا پابند رہ، زکوٰۃ دے اور قرابت داروں کے حقوق ادا کر" دیکھیے یہاں ایک ایسا شخص سامنے ہے جو آپ کی رسالت کا قائل ہے،

حیاتِ اُخروی کا قائل ہے، اسلام قبول کر چکا ہے، اس کو تمام ایمانیات اور اخلاقیات کی تفصیل مطلوب نہیں۔ وہ صرف خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہدایت مانگ رہا ہے۔ آپ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو تعلیم دیتے ہیں کہ جس عقیدہ پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اس میں مضبوط ہو جا، اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کیے جا۔

ایک دوسرے موقع پر ایک اعرابی حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔ آپؐ نے فرمایا تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ " وہ عمل یہ ہے کہ تو صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، جو نماز فرض کی گئی ہے اس کا پابند رہے، جو زکوٰۃ مقرر کر دی گئی ہے وہ ادا کرتا رہے اور رمضان کے روزے رکھے" اس نے کہا بخدا میں نہ اس سے زیادہ کچھ کروں گا نہ کم۔ جب وہ چلا گیا تو حضورؐ نے فرمایا جو شخص اہل جنت میں سے کسی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتا ہو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ اب حضورؐ کی تعلیم اور اس شخص کے جواب اور پھر آپ کے آخری ارشاد پر غور کیجیے۔ ایک سچا مسلمان سامنے تھا۔ نبی کی ہر ہدایت کو صدق دل سے قبول کرنے کو تیار تھا۔ اس کو صرف یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ خدا کی جنت میں داخل ہونے کے لیے بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کی ضرورت نہیں، چلے کھینچنے اور رات بھر وظیفے پڑھنے کی ضرورت نہیں، اسی دنیاداری کی زندگی میں اگر تو اپنے اعتقاد کو شرک سے پاک رکھے اور خدا کے عاید کیے ہوئے فرائض ادا کرتا رہے تو جنت تجھے مل سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسری قسم کی حدیث ملاحظہ کیجیے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے ایک مشن پر بھیجا تو فرمایا تم اہل کتاب کی ایک قوم میں پہنچو گے۔ سب سے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیں اور یہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ جب اس کو مان لیں تو ان سے

کہنا کہ اللہ نے تم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو تمہارے مالداروں سے لی جائیگی اور تمہارے غریبوں کو دے دی جائے گی۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو خبردار ان کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ اسی نوعیت کی دوسری احادیث میں ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْهُ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔	مجھے حکم دیا گیا کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کا رسول ہے اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ پھر جب انہوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيُؤْمِنُوْا بِيْ وَبِمَا جِئْتُ بِهٖ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور مجھ پر اور ان سب باتوں پر ایمان لائیں جو میں لایا ہوں۔ پھر جب انہوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں

اور مالوں کو بچا لیا، الا یہ کہ ان کے خلاف کوئی حق قائم ہو جائے، اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ان احادیث میں حضورؐ نے اسلام کا دستوری قانون (Constitutional Law) بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کو ماننے کا اقرار کرے تو وہ دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے اور اسلامی اسٹیٹ کا شہری (Citizen) بن جاتا ہے۔ یہ بات کہ وہ حقیقی مومن ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اللہ

کرنے والا ہے۔ ہم اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں کیونکہ لَمْ اُؤْمَرْ اَنْ اَنْقُبَ عَنْ قُلُوْبِ النَّاسِ وَلَا اَشُقَّ بُطُوْنَهُمْ جان ومال کی عصمت (Security) صرف کلمۂ توحید اور اعتقاد رسالت کے اقرار سے قائم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد کسی دست درازی کا حق نہیں رہتا۔ البتہ اگر کوئی شخص خدا کا حق یا بندوں کا حق ادا کرنے سے انکار کرے تو اس کو جرم کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے۔

دیکھیے یہاں کوئی شخص پیش نظر نہیں تھا بلکہ ایک علاقہ کے گورنر کو قانونی ہدایات دی جا رہی تھیں، اس لیے صرف قانون کے حدود بیان کرنے پر اکتفا کی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اقرار توحید ورسالت اور ادائے فرائض سے ہر شخص کے لیے جنت واجب ہو جائے گی نیز اس موقع پر آپ نے ہر شخص کو تمام ایمانیات اور عملی قوانین سے آگاہ کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، کیونکہ یہاں صرف یہ سمجھانا مقصود تھا کہ اسلام اور غیر اسلام کی سرحد کیا ہے، اور اسلام کی سرحد میں داخل ہوتے ہی انسان کو کیا آئینی حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس آیت کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (توبہ:۱) و اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو) پس کسی شخص کو ان قانونی ہدایات سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید ورسالت کے اقرار اور ادائے نماز و زکوٰۃ میں اسلام کو محدود رکھتے تھے اور ان کے سوا کسی اور چیز کی کوئی اہمیت آپ کی نگاہ میں نہ تھی۔

اوپر آپ نے دو قسم کی حدیثیں دیکھیں۔ ایک وہ احادیث جن کے مخاطب خاص لوگ تھے۔ ان میں آنحضرت نے ان لوگوں کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دی ہے۔ دوسری وہ احادیث جن میں مخصوص افراد سے بحث نہ تھی بلکہ دستوری قانون کی رو سے مسلم اور غیر مسلم کا اصولی فرق اور مسلم کے آئینی حقوق بیان کرنا مقصود

مجھ کو لوگوں کے دل چیرنے اور ان کے باطن ٹٹولنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ (حدیث)

تھا۔ ان دونوں قسم کی حدیثوں کے اندازِ بیان میں آپ کو نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ایک جگہ آپؐ عوام کے روحانی رہنما کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں، دوسری جگہ آپؐ کی حیثیت ایک مقنن اور ایک نئے نظامِ سیاسی کے مؤسس کی ہے۔

اب ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالیے جن میں آپ کے مخاطب عرب کے وہ بہترین چیدہ اشخاص تھے جن کو اپنے عہد کی عرب سوسائٹی میں سے چھانٹ کر آپ نے اپنی صحبت میں رکھا تھا اور بطورِ خاص ان کو تعلیم و تربیت دے رہے تھے تاکہ وہ اسلام کی اسپرٹ کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر آپ کے مشن کی توسیع میں مددگار ہوں۔

ایک مرتبہ حضورؐ سواری پر چلے جا رہے تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے۔ آپؐ نے تین مرتبہ ٹھیر ٹھیر کر آواز دی "یا معاذ بن جبل"! حضرت معاذؓ نے ہر مرتبہ عرض کیا لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ۔ اس طرح تین مرتبہ پکار کر جب آپؐ نے مخاطب کو اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کر لیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ جو بات آپؐ فرمانا چاہتے ہیں سننے والا اس کو خاص اہمیت کے ساتھ سنے گا تب فرمایا "جانتے ہو بندوں پر خدا کا کیا حق ہے"؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں"۔ تھوڑی دور آگے چل کر پھر آواز دی "یا معاذ بن جبل"! انہوں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ فرمایا "پھر جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جبکہ وہ ایسا کریں"؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "ان کا حق یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے"۔ حضرت معاذؓ نے یہ سن کر پوچھا "کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں"؟ فرمایا "نہیں ان کو بشارت نہ دو کیونکہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے"۔ یعنی عام لوگ اس کی اسپرٹ کو نہ سمجھیں گے اور اس غلط فہمی میں پڑ جائیں گے کہ محض زبانی کلمۂ شہادت پڑھ لینے سے نجات لازم ہو جاتی ہے۔

ایک اور موقع پر حضورؐ اپنے خاص صحابیوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ یکایک

آپ اٹھے اور تشریف لے گئے۔ جب بہت دیر گزر گئی تو صحابہ کو تشویش ہوئی کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آجائے۔ ڈھونڈنے نکلے، سب سے پہلے جو صاحب گئے وہ حضرت ابوہریرہؓ تھے۔ یہ سرکار کو تلاش کرتے ہوئے انصار کے ایک باغ پر پہنچے جس کا دروازہ تلاش کے باوجود نہ ملا۔ آخر ایک چھوٹی سی نہر کے رستے سے اندر پہنچے دیکھا کہ حضورؐ تشریف فرما ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیسے آئے؟ انہوں نے ماجرا عرض کیا آپ نے اپنی دونوں جوتیاں اٹھا کر انہیں دے دیں اور فرمایا انہیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص ایسا ملے جو لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہو اسے جنت کی بشارت دے دو۔ یہ اس حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے۔ انہوں نے پوچھا یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین ہیں اور آپ نے مجھے ایسا اور ایسا کہنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ان کے ایک زور کا دھپ رسید کیا اور کہا کہ واپس جاؤ۔ یہ گرتے پڑتے بھاگے اور جا کر حضورؐ سے سارا معاملہ بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ عمرؓ! کس چیز نے تم کو اس حرکت پر آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا آپ نے ابوہریرہ کو ایسا اور ایسا کہنے کے لیے بھیجا تھا؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا ایسا نہ کیجیے، مجھے خوف ہے کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے، انہیں عمل کے لیے چھوڑ دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا تو انہیں عمل کے لیے چھوڑ دو۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں۔ یہ واپس ہو گئے۔ دوبارہ حاضر ہوئے تو آپ اٹھ چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذَالِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ جس بندے نے کہہ دیا کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اسی عقیدہ پر جان دی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔" انہوں نے پوچھا وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ۔ اگرچہ اس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ۔

انہوں نے پھر یہی پوچھا اور آپؐ نے پھر یہی جواب دیا۔ انہوں نے سہ بارہ پوچھا آپؐ نے فرمایا وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِی ذَرٍّ۔

ان تینوں حدیثوں پر غور کیجیے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے کامل الاسلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ تعلیماتِ قرآنی اور قوانینِ اسلامی سے نہ صرف خوب واقف بلکہ ان پر پورے عامل بھی ہیں۔ ان کے سامنے حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس سے یہ اندیشہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ وہ توحید کے سوا اسلام کے دوسرے اصولی عقاید اور حقوق و فرائض کو غیر ضروری سمجھ لیں گے۔ اس لیے ان کو آپؐ نے یہ حقیقت بتا دی کہ اسلام میں اصل اور بنیادی چیز عقیدۂ توحید ہے۔ انبیاء کی آمد کا اصلی مقصد یہی ہے کہ انسان کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالیں اور صرف خدا کا بندہ بنائیں۔ دنیا اور آخرت میں انسان کی فلاح و کامیابی کا انحصار بھی اسی پر ہے کہ وہ غیر اللہ کی بندگی سے نکلے اور بس ایک خدا کا بندہ بن کر رہے۔ یہ حقیقت جس نے سمجھ لی اور جس کے دل میں یہ بات خوب بیٹھ گئی کہ خدائے واحد کے سوا دنیا کی کسی چیز کو قطعاً کسی قسم کی اُلوہیت حاصل نہیں ہے۔ اور صرف ایک خدا ہی ہے جس کی اطاعت، فرمانبرداری، غلامی اور بندگی اس کو کرنی ہے، وہ یقیناً اپنی زندگی میں سیدھا راستہ اختیار کرے گا اور ٹیڑھے راستوں سے بچ کر چلے گا۔ اس کے مزاج میں راستی ہوگی۔ صداقت کو قبول کرے گا۔ متقی اور پرہیزگار ہوگا۔ تمام وہ حقوق ادا کریگا جن کو خدا نے حق ٹھیرایا ہے اور تمام وہ فرائض بجالائے گا جن کو خدا نے فرض قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہی ایک چیز اس کو صحیح الخیال بھی بنائے گی اور طاہر الاخلاق اور صالح الاعمال بھی۔ رہی یہ بات کہ بشری کمزوری کی بنا پر کبھی اس سے گناہ سرزد ہو جائے، تو خدا پر ایمان اسے مجبور کرے گا کہ اس گناہ سے توبہ کرے۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ یہ ناممکن ہے کہ وہ گناہ اور بدکاری پر جما رہے۔

مذکورہ بالا احادیث اور ان کی ہم معنی دوسری احادیث کا یہی مفہوم صحابہ کرام نے سمجھا تھا اور یہی ان کا حقیقی مفہوم تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال نہ کیا کہ بس عقیدۂ توحید ہی کافی ہے، اس کے بعد نہ رسالت کو ماننے کی ضرورت ہے، نہ کلام اللہ کو

اور نہ پاکیزگیٔ اخلاق مطلوب ہے نہ صلاحیتِ اعمال۔ ایسا غلط مفہوم وہ کس طرح سمجھ سکتے تھے جبکہ ان کو پوری طرح بتادیا گیا تھا کہ اسلام کیا ہے اور اس میں کن چیزوں کا اعتقاد، کن عبادات کی پابندی، کن حدود کی حفاظت، کن قوانین کی اطاعت اور کن طریقوں سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے یہ تعلیم صرف کاملین کو دی اور عوام کے سامنے اس کو بیان کرنے سے منع فرمادیا۔ معاذ بن جبل والی حدیث میں آپ نے اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمادی ہے کہ عام لوگ اس کو سن کر غلط فہمی میں پڑ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ والی حدیث میں ایک شخص کو شبہ ہوسکتا ہے کہ آپ نے شاید عوام تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی۔ خود حضرت عمرؓ کو بھی ایسا ہی شبہ ہوا تھا لیکن دراصل حضورؐ کا مقصد کامل الاسلام لوگوں کو بشارت دینا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے اپنا اندیشہ بیان کیا تو آپؐ نے ان کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابوذرؓ والی حدیث میں بھی کوئی شخص یہ شبہ نہیں کرسکتا کہ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے مراد مجرد زبانی قول ہے۔ اس لیے کہ حضورؐ نے دوسرے مواقع پر تصریح فرمائی ہے کہ دخولِ جنت کے لیے توحید پر کامل ایمان کی ضرورت ہے۔ کہیں مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ فرمایا کہیں عَبْدٌ غَیْرُ شَاکٍّ فرمایا۔ اور کہیں دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے، جو اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن احادیث میں توحید کی اہمیت بیان کی گئی ہے ان کا خطاب دراصل ان لوگوں سے ہے جو تمام شرائط کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے ہیں، نہ کہ ان لوگوں سے جو مسلمان ہی نہ ہوں۔ پھر مسلمانوں کو بھی اعتقادِ توحید پر دخولِ جنت کی بشارت دینے سے یہ مراد نہیں کہ بس خدا کی وحدانیت مان لو، پھر جس قسم کی بدعقیدگی اور فسق و فجور اور بدعت و معصیت میں چاہو مبتلا رہو۔ بلکہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمان کی کامیابی کا مدار سب سے بڑھ کر اعتقادِ توحید کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اس میں اگر خرابی آگئی تو پھر کوئی چیز

نافع نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ صحیح و مضبوط ہو تو آخری کامیابی حاصل ہو کر رہے گی۔
اسی جہت سے اس معنی کی احادیث اس آیتِ قرآنی سے مطابق ہوتی ہیں جس میں
فرمایا گیا ہے کہ:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۔ (حم سجدہ : ۳۰)

(ترجمان القرآن، صفر ۱۳۵۶ھ۔ مئی ۱۹۳۷ء)

کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟

ایک صاحب نے میرے مضمون "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی" میں ایمان کی بحث پڑھ کر ایک شبہ پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:

"اسلام کا مقصود بالذات توحید و عبادتِ الٰہی ہے۔ انبیاء محض ذریعہ ہیں اور ان پر ایمان مقصودِ اصلی نہیں ہے۔ ہر شخص ایمان کے لیے وسعتِ علم و فکر تک مکلف ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم توحید پر ایمان رکھے اور اپنے طریق پر عبادتِ الٰہی کرے مگر اپنے علم اور فکر سے کام لینے کے باوجود رسالت کے متعلق نیک نیتی سے شکوک رکھتا ہو ایسے شخص کو ناجی قرار نہ دینے کی معقول وجوہ کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں ذیل کی آیات توجہ کے قابل ہیں:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ (آل عمران)

• وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (۱۱۰)... لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ (آل عمران: ۱۱۰ تا ۱۱۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ ۔ (الحدید: ۲۸)

آیت مؤخر الذکر کے متعلق یہ بھی بتائیے کہ کفلین سے کیا مراد ہے اور کفل

تشنیہ کیوں ہے؟"

آپ نے اپنے پہلے فقرے میں اسلام کا جو مقصد بیان فرمایا ہے وہ دراصل اسلام کے مقصد کا پورا پورا بیان نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے۔ لیکن میں بخوفِ طوالت اس بحث میں نہ پڑوں گا۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا جو ادھورا مقصد آپ نے متعین کیا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے بھی انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی ناگزیر ہے۔

سب سے پہلا سوال جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ اسلام کا جو مقصد آپ قرار دیتے ہیں اس کے حصول کا یقینی ذریعہ کیا ہے؟ "توحید" جس چیز کا نام ہے وہ صرف "خدا کو ایک کہنا" ہی نہیں ہے بلکہ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت ہے۔ اسی طرح "عبادتِ الٰہی" کا مفہوم بھی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی پرستش کی جائے، بلکہ صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت یہ ہے کہ انسان شرک کے تمام شائبوں سے بچ کر اپنی زندگی کو اس ذات پاک کی بندگی کے لیے خالص کر دے۔ یہ دونوں چیزیں (یعنی علم و معرفت کی صحت، اور عبادت کا خلوص) اسلام کی اصطلاح میں "ہدایت" کے جامع نام سے موسوم ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ہدایت جس شے کا نام ہے وہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہو۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (آل عمران: ۷۳)

خدا کی طرف سے ہدایت پانے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو کسی کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے ہدایت آئے، یا کسی ایسے شخص کا اتباع کیا جائے جس کے پاس خدا کی طرف سے براہِ راست ہدایت آئی ہو۔ پہلا شخص اسلام کی اصطلاح میں رسول یا نبی ہے۔ اور دوسرے شخص کے لیے اصطلاحی نام "مومن" یا "مسلم" ہے۔ پس اگر کوئی شخص توحید کا صحیح علم رکھتا ہے اور اپنی بندگی و عبادت کو خدائے واحد کے لیے مخصوص کر چکا ہے، تو لامحالہ یا تو وہ خود نبی ہے یا کسی نبی کا متبع۔ لیکن اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو اس کے پاس علم نہیں ہے محض گمان اور اٹکل ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ

مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ اور جب اس کے پاس "علم" نہیں ہے تو اس کی عبادت بھی خالص نہیں ہو سکتی، کیونکہ عبادت (نجم: ۲۸) کا خالصتہً اللہ کے لیے ہونا اس پر موقوف ہے کہ آدمی کو اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہو۔

آپ کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ قرآن کے اس دعویٰ پر عقلی دلیل پیش کی جائے۔ مَیں اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے حاضر ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت کا جوہر موجود ہے اور یہ بات بھی اس کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ صرف خدا کی بندگی کرے جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم: ۳۰) اور حدیث نبوی میں آیا ہے کہ كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ۔[1] لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لیے چند شرائط ہیں، اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں۔

پہلی شرط قوتِ مشاہدہ کا استعمال اور صحیح استعمال ہے، تاکہ انسان آنکھیں کھول کر آفاق و انفس میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھے اور صفاتِ الٰہی کے ان نشانات کو پہچانے جو ہر ذرے اور خود انسان کے اپنے وجود میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن نوعِ انسانی کی ایک بڑی اکثریت ایسی ہے جو اس طرح کا مشاہدہ نہیں کرتی۔ وہ آثار و مظاہر کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے باطن کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ قرآن اس کی شکایت کرتا ہے کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف: ۱۰۵) "آسمانوں اور زمین میں اللہ کی کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے لوگ یونہی گزر جاتے ہیں اور غور و فکر نہیں کرتے"۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس: ۹۲) "لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سرے سے مشاہدہ کی قوت ہی استعمال نہیں کرتے ان کے لیے معرفت کا دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔

---

[1] ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اسلام کی فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان میں غور و فکر کا مادّہ موجود ہو، اور وہ بھی صحیح و سلیم ہو، تاکہ انسان اپنے مشاہدات کو صحیح طریقے سے ترتیب دے کر ان سے صحیح نتائج اخذ کر سکے یہ شرط پہلی شرط سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔ اوّل تو غور و فکر کرنے والے افراد ہی نوعِ انسانی میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں ان میں بھی صحیح الفکر افراد کم پائے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اور وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ یہ غور و فکر کا فقدان اور صحتِ فکر کی کمیابی ان موانع میں سے ہے جو انسان کو علمِ حق تک پہنچنے سے روکتے اور اسے ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ راہِ راست کے نشانات ہر طرف موجود ہیں مگر جو شخص ان نشانات کو دیکھتا ہی نہ ہو، یا دیکھتا تو ان سے ٹھیک نتیجہ نہ نکالتا ہو وہ کیونکر صحیح راستہ پا سکتا ہے؟ یہی بات قرآن مجید میں کہی گئی ہے کہ ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں مگر ان کے لیے جو عقل رکھتے ہوں۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (الروم: ۲۸) اور دیکھیے کہ یہی بات دوسرے موقع پر کتنے زور کے ساتھ کہی گئی ہے :-

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (اعراف: ۱۷۹)

ہم نے جنّوں اور انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے جن کا حال یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سمجھنے بوجھنے کی خدمت نہیں لیتے آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، یہ وہی لوگ ہیں جو غفلت برتنے والے ہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس کی طبیعت ایسی سلیم ہو کہ وہ سوسائٹی کے اثرات، باپ دادا کی تربیت اور خاندانی و قومی روایات سے متاثر نہ ہو اور ان سب پردوں کو چاک کر کے اور حقیقت کو صاف صاف دیکھ لے۔ یہ شرط پہلی دونوں شرطوں سے زیادہ کمیاب ہے۔ بڑے بڑے ذی علم، عاقل اور ذکی و فطین لوگوں کو دیکھا ہے کہ سوسائٹی اور خاندان کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جس ڈگر پر ماحول نے ان کو ڈال دیا ہے، اسی پر چلے جا رہے ہیں

اور اسی کو حق سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس کو بھی گمراہی کا اہم سبب بتاتا ہے۔ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (مائدہ ۱۰۴)

چوتھی شرط یہ ہے کہ انسان میں حق پسندی اور اس کے ساتھ قوتِ ارادی اتنی زبردست ہو کہ وہ خود اپنے نفس کی خواہشات اور رجحانات کا مقابلہ کر سکے۔ کیونکہ خواہشِ نفس اول تو معرفتِ حق ہی میں مانع ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص حق کو پہچان بھی لے تو یہ اس کو اپنے علم کے مطابق عمل کرنے سے روکتی ہے، قدم قدم پر مزاحمت کرتی ہے۔ انسان کے نفس میں یہ ایسی زبردست قوت ہے جو اکثر اس کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے اور بسا اوقات اس کو جانتے بوجھتے غلط راستوں پر بھٹکا دیتی ہے۔ معمولی آدمی تو درکنار بڑے بڑے لوگ بھی جو اپنے علم و فضل اور اپنی عقل و بصیرت اور فہم و فراست کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہوتے ہیں، اس رہزن کی شرارتوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی گمراہی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص: ۵۰) اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی۔" اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (جاثیہ ۲۳) "تو کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ باوجودیکہ وہ علم رکھتا تھا مگر (جب اس نے ایسا کیا تو) اللہ نے اسے بھٹکا دیا اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔" اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفسِ شریر کی رہزنی کے خطرے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص: ۲۶) (ہوائے نفس کی پیروی نہ کرنا ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی)

آخری شرط یہ ہے کہ انسان کی وجدانی قوتیں بیدار ہوں، اس کے ذہن کا سانچہ ایسا ہو کہ صحیح اور حق بات سوچنے اور سمجھنے کے لیے غور و فکر اور استدلال عقلی کا زیادہ محتاج نہ ہو، بلکہ فطرتاً وہ غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہو اور قیاس و

استدلال کے بغیر محض (Intitution) کی قوت سے سچی اور حق بات تک پہنچ جانے۔ یہ شرط سب سے زیادہ کڑی مگر معرفت کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ انسان کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی صحیح ہو، غور و فکر اور تعقل و تدبر کی قوت سے وہ کتنا ہی بہرہ مند ہو، اور تقلید غیر وبندگیٔ نفس کی زنجیروں سے کتنا ہی آزاد ہو، لیکن جو حقیقتیں اس کے حواس سے ماوراء ہیں اور جن کی کنہ پر اس کی عقل پوری طرح حاوی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، ان کا علم اور یقینی علم انسان کو محض آثار کے مشاہدے اور محض آزادانہ تفکر کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ان حقیقتوں کے قریب تک پہنچ سکتا ہے، مگر ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ عقل کے زور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید ایسا ہو، اغلب ہے کہ ایسا ہو، یا حد سے حد یہ کہ ایسا ہونا چاہیے۔ لیکن محض تعقل اس کو اتنی قوت بہم نہیں پہنچا سکتا کہ وہ جزم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ فی الواقع ایسا ہے اور یہی حقیقت اور صداقت ہے، اور اس کے سوا جو کچھ ہے قطعاً باطل اور غلط ہے۔ یہ جزم اور یقین اور ایمانِ کامل کی کیفیت صرف "حدس" سے پیدا ہوتی ہے۔ عرفان کی آخری منزل میں پہنچ کر قیاس و استدلال کام نہیں دیتا۔ وہاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ذہن میں ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور وہ آن کی آن میں حقیقت کا مشاہدہ کرا دیتی ہے، ویسا ہی مشاہدہ جیسا کہ ہم اپنی آنکھوں سے کوئی مرئی چیز دیکھ رہے ہیں۔ اسی مشاہدہ پر جزم و یقین کی بنا قائم ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا اعتقاد گمان اور اندازے اور ظن جیسی کمزور اور متزلزل بنیادوں پر نہیں ہوتا بلکہ وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ایک ایسی دیکھی بھالی بات پر ایمان لاتا ہے جس کی صداقت میں شک اور شبہ اور جانبِ مخالف کے امکان کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی کا نام معرفتِ کامل ہے۔ اور جب تک معرفت کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، انسان نہ پورا پورا خداشناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کے لیے اس کی بندگی خالص ہو سکتی ہے۔ لیکن حدس کی یہ روشنی جس پر معرفت کی تکمیل موقوف ہے، انسان کے اپنے بس کی نہیں۔ نہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہے، نہ اس کو پیدا کرنے پر قادر ہے، اور نہ کسب و کوشش سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ محض خداداد ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں "نورِ خداداد" اور "برہانِ رب"

اور "ہدایتِ الٰہی" اور "تعلیم خداوندی" وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور: ۴۰) "جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لیے پھر کوئی روشنی نہیں"۔ حضرت یوسف کے متعلق فرمایا ہے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (یوسف: ۲۴) "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا تو وہ بھی بھٹک جاتا"۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الانعام: ۱۶۱) "لوگوں سے کہدو کہ مجھ کو میرے رب نے راہ راست کی طرف ہدایت بخشی ہے"۔ حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (قصص: ۱۴) "اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اس کو قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا"۔

اب ان پانچ شرطوں پر غور کیجیے۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی شرط کی ضرورت سے انکار ہے تو وجہ انکار ارشاد ہو، اگر کسی شرط کے بغیر انسان صداقت اور حقیقت تک پہنچ سکتا ہو تو دلیل پیش فرمائی جائے اور اگر حقیقت تک پہنچنے کے لیے ان پانچوں شرطوں کا پورا ہونا آپ کی رائے میں لازم ہے تو بتائیے کہ کتنے لاکھ، نہیں کتنے کروڑ، بلکہ کتنے ارب انسانوں میں سے ایک میں یہ شرطیں اس کمال کے ساتھ پوری ہوتی ہیں کہ وہ خداوند جل وعلا جیسی سرحدِ ادراک سے وراء الورا ہستی کی معرفتِ کامل حاصل کر سکے؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنس گراں کمیاب ہے، تو پھر فرمائیے کہ ان کروڑوں بندگانِ خدا کا کیا حشر ہو جو اس سے محروم ہیں یا اگر بہرہ مند بھی ہیں تو اس درجہ میں نہیں ہیں؟ کیا ہر شخص کو اس کے ناقص ذرائع کے ساتھ چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود اپنی اندھی آنکھوں اور مفلوج پاؤں کے ساتھ خود ہی راستہ ٹٹول کر چلے، جس چیز کو چاہے نیک نیتی کے ساتھ خدا سمجھ لے، اور جس طرح چاہے اس کی پوجا کرے؟ اگر آپ کا یہی خیال ہے تو آپ کیوں نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اپنے مرض کا علاج آپ کرنا چاہیے، کسی طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، ہر شخص کو اپنا راستہ آپ تلاش کرنا چاہیے، کسی سے راستہ پوچھنے اور کسی کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو خود ہی علم حاصل کرنا چاہیے، کسی استاد اور معلم کی حاجت نہیں — کیا اس

دنیا کا پورا انتظام یونہی چل رہا ہے؟

انسان کے محدود ذہن میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ تمام جہان کی قابلیتیں بیک وقت ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں حتیٰ کہ وہ اپنے ہر کام میں دوسروں کی مدد سے بے نیاز ہے۔

دوسری طرف انسان کی ضروریات اتنی وسیع اور گوناگوں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے خاص قسم کی قابلیت درکار ہے اور زندگی کا ہر شعبہ اپنے لیے مناسب حال قابلیتیں چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف لوگوں کو مختلف قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کو طب سے لگاؤ ہے اور وہ لوگوں کی طبی ضروریات کو پورا کر رہا ہے۔ کسی کو قانون سے لگاؤ ہے۔ کسی کو تجارت سے، کسی کو کاشتکاری سے، کسی کو صنعت و حرفت سے، کسی کو حکومت و سیاست سے۔ اور یہ سب اپنے اپنے شعبے میں نوعِ انسانی کے محتاج الیہ ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی کے مخصوص معاملات میں دوسرے تمام شعبوں کے لوگ اسی خاص شعبے کے آدمیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو شخص اس نظام کو توڑ کر آپ ہی اپنا طبیب، اپنا وکیل، اپنا مزارع، اپنا بیوپاری اور اپنا صناع بننے کی کوشش کرے گا، وہ خواہ کتنی ہی "نیک نیتی" کے ساتھ اس حماقت کا مرتکب ہو، فطرت کے نظام کو توڑنے کا نتیجہ بہرحال ظاہر ہو کر رہے گا اور وہ یقیناً ناکام زندگی بسر کرے گا۔

یہ نظام جس طرح زندگی کے تمام معاملات میں درست ہے، اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی درست ہے۔ یہاں بھی ہر شخص اس خاص قابلیت سے بہرہ مند نہیں ہے جو معبود کو پہچاننے اور صحیح طریقے سے اس کی عبادت کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ قابلیت بھی خاص خاص لوگوں کو عطا کی گئی ہے۔ انہوں نے معبود کو پہچانا ہے اور اس کی نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اس کی عبادت و بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کیا ہے اور اس کو بتا بھی گئے ہیں۔ عقلمند انسان کا کام ہے کہ اس شعبے میں اسی شعبہ کے ماہروں پر اعتماد کرے، جیسی تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو قلب و روح میں جگہ دے، اور جو طریق بندگی انہوں نے قول اور عمل سے بتا دیا ہے اسی کا اتباع

کرے۔ وہ بلاشبہ اس معاملہ میں بھی اپنی عقل کو استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں عقل کے استعمال کی صحیح صورت یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ناقص قوتوں اور اپنے محدود ذرائع پر اعتماد کر کے راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور جو راستہ اپنے نزدیک صحیح معلوم ہو اس پر چلنے لگے۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح رہنما تلاش کرے اور جو لوگ مذہب کے میدان میں رہنمائی کے مدعی ہیں ان سب کی سیرتوں اور ان کی تعلیمات پر اپنی حد تک ایک تحقیقی نظر ڈال کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون زیادہ بہتر اور صحیح راہ دکھانے والا ہے، کس کی ذات میں وہ پانچوں شرطیں بدرجۂ اتم پوری ہو گئی ہیں جو ہدایت یافتہ ہونے کے لیے ضروری ہیں، اور کس کی تعلیم سب سے زیادہ قابلِ عمل ہے۔ اس امتحان پر جو شخص پورا اترے اس کی تعلیم کو مان لینا چاہیے اور اس کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر جو شخص غیر معقول طریقہ اختیار کریگا وہ خواہ کتنا ہی "نیک نیت" ہو بہر حال وہ اپنی غلطی کے بُرے نتائج ضرور دیکھے گا۔ غلطی خواہ نیک نیتی سے کی جائے یا بدنیتی سے، اس کی ذمہ داری اور اس کے وبال سے انسان بچ نہیں سکتا۔ جو شخص بیمار ہو اور فنِ طب کے ماہر کو تلاش کرنے اور اس پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے ناقص علم پر اعتماد کر کے خود اپنا علاج کرنے لگے وہ اپنی اس غلطی کا نتیجہ ضرور بھگتے گا خواہ اس نے یہ غلطی کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہے۔ جو شخص قانون کے معاملہ میں ماہرِ قانون کو چھوڑ کر خود اپنی ناقص رائے پر عمل کرے گا وہ اپنی حماقت کے نتائج سے نہ بچ سکیگا چاہے اس نے یہ حرکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ کی ہو۔ غلطی بہر حال غلطی ہے اور ہر غلطی کے جو فطری نتائج مقرر ہیں وہ ہر حال میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ البتہ بدنیتی سے ایک جُرم کا اضافہ اور ہو جاتا ہے۔

اب میں ان آیات کی طرف توجہ کرتا ہوں جو آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش فرمائی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس قاعدۂ کلیہ کو سمجھ لیجیے کہ کسی مسئلہ میں قرآن مجید سے استدلال کرنے کے لیے ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر نکال لینا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے،

بلکہ اس کے لیے پورے قرآن پر نظر ڈالنی ضروری ہے تاکہ مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں ہے جس میں ترتیب کے ساتھ ہر ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو، بلکہ یہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضروریات کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے جتنے بنیادی مسائل ہیں وہ سب کسی ایک جگہ اپنی پوری پوری تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں کر دیئے گئے ہیں، بلکہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف آیات میں موقع و محل کے لحاظ سے ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پس اگر آپ رسالت کے مسئلہ میں قرآن کی تعلیم ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پورے قرآن پر مجموعی نظر ڈالیے۔ ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر سلسلہ سے الگ کر لیں تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس قاعدے کے مطابق جب آپ قرآن کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر شخص آپ اپنا راستہ تلاش کرنے کے لیے آزاد ہے اور ہر راستہ جس کو وہ نیک نیتی کے ساتھ درست سمجھتا ہے وہی حقیقت میں بھی صحیح ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت بنی آدم کو زمین پر اُتارا تھا اسی وقت اس نے ان کو سیدھا راستہ بتانے کا کام خود اپنے ذمہ لے لیا تھا اور ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ تمہارے لیے نجات کی صورت بس یہی ہے کہ میری طرف سے جو ہدایت تمہیں پہنچے اس کی پیروی کرو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ: ۳۸، ۳۹)

پھر اس نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ یہ ہدایت ہر شخص کے پاس فرداً فرداً نہیں بھیجی جائے گی بلکہ میں خود تم ہی میں سے کچھ لوگوں کا انتخاب کروں گا اور ان پر اپنی ہدایات نازل کروں گا اور ان کو تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجوں گا۔ ہر شخص جو میرے رسول کو اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو سچے دل سے مانے گا وہی ہدایت پائے گا۔ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِىْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (اعراف: ۳۵) جو میرے پیغامبروں کو نہ مانے گا وہ اس کی سزا پائے گا
إِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (ص: ۱۴) اور جب قیامت کے روز اس کو عذاب
دیا جائے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آتے تھے اور انہوں نے
تم کو خدا کی آیات نہیں سنا دی تھیں اور اس دن کے انجام سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟ أَلَمْ
يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ
هٰذَا (الزمر: ۷۱)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ جو شخص اللہ کے رسولوں کو نہ مانے اس
کے لیے اللہ کو ماننا ہرگز نافع نہیں ہے:-

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ (النساء: ۱۵۰)

یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔

قرآن کے نزدیک مومن وہی ہے جو اللہ کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لائے

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (حجرات: ۱۵، نور: ۶۲)

مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اور جو شخص رسول کے ذریعہ سے ہدایت کا راستہ واضح ہو جانے کے بعد بھی اس کو

لہ واضح رہے کہ رسولوں کی تکذیب یہی ہے کہ ان کے دعوائے رسالت کو ماننے سے انکار کیا جائے۔ یہ انکار خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے بہرحال انکار ہے۔ البتہ بدنیتی کی صورت میں انکار کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جو شخص غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے وہ گمراہ ہے۔ اور جو صحیح جانتے ہوئے غلط راستہ پر چلے وہ گمراہی کے ساتھ مغضوب بھی ہے۔

اختیار کرنے سے انکار کرے وہ جہنم سے بچ نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں نیک نیتی اور بدنیتی کا کوئی سوال نہیں ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا (النساء: ۱۱۵)

اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول سے جھگڑا کرے اور مومنوں کے رستے پر نہ چلے اس کو ہم اسی طرف پھیر دیں گے جس کی طرف وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے اصول سے ہے اور قرآن میں آپ کہیں ایسی بات نہیں پا سکتے جو اس کے خلاف ہو۔ آپ نے جن آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش فرمایا ہے وہ بظاہر آپ کو اس سے متناقض معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر آپ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک مسلسل پڑھیں تو تناقض کا شائبہ تک نہ رہے گا۔ چھٹے رکوع میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا ..... ثُمَّ نَبْتَهِلْ۔ (آل عمران: ۶۰، ۶۱)

یہ علمِ حق تیرے رب کی طرف سے ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیو۔ پھر جو کوئی اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے جبکہ تیرے پاس علم آ چکا ہے تو کہہ کہ آؤ ..... پھر ہم مباہلہ کریں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کو ایک سیدھی اور صاف بات یعنی توحید خالص کی طرف دعوت دو اور ان سے کہو کہ ابراہیم جس کے بارے میں تم جھگڑتے ہو وہ یہودی یا نصرانی نہ تھا، بلکہ وہ خالص موحد تھا، اور اس کے ساتھ اصلی تعلق وہی لوگ رکھتے ہیں جو اس کا اتباع کرتے ہیں پھر فرمایا جاتا ہے کہ تمام پیغمبروں سے (اور بالتبع ان کی امتوں سے)، ہمیشہ یہ عہد لیا جاتا رہا ہے کہ ہر نبی جو

خدا کی طرف سے تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے کے لیے آئے، اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ اس عہد سے جو لوگ پھر جائیں وہ فاسق ہیں۔ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر جو کچھ اترا ہے اس سب پر ایمان لا دینی اسلام ہے اور جو شخص اس اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو اس کا وہ دین ہرگز مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران: ۸۵) آخر میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (آل عمران: ۱۱۰) "اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا"۔ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ "ان میں سے تھوڑے سے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ایمان سے مراد رسول عربی پر ایمان ہے۔ کیونکہ جو لوگ "اہل کتاب" ہیں وہ موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو یا دونوں کو اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مانتے ہیں، اور خدا کے بھی قائل ہیں۔

آخری آیت جو سورۂ حدید سے آپ نے نقل فرمائی ہے، اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں، دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں، دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ پھر فرمایا کہ اگر تم یہ دونوں باتیں اختیار کرو گے تو تم کو خدا کی رحمت کے دو حصے ملیں گے، یعنی ایک حصہ انبیائے سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے اجر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا کچھ نہ کچھ حصہ ملے گا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (اعراف: ۱۷۰) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (المائدہ: ۶۸) لیکن ایک دوسرے موقع پر یہ بھی تو فرمایا ہے:-

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمٰى۔ (الرعد: ۱۹)

کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کتاب تیرے اوپر اتاری گئی ہے وہ حق ہے، اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔

اور یہ بھی تو ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ پچھلی کتابوں کا صحیح علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے آیا ہے اور برحق ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (انعام: ۱۱۴)

لہٰذا ان دونوں مضمونوں کی آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو لوگ جہالت اور نابینائی کے باعث رسولِ عربی کی صداقت کے قائل نہیں ہیں، مگر انبیائے سابقین پر ایمان رکھتے ہیں اور صلاح و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو اللہ کی رحمت کا اتنا حصہ ملے گا کہ ان کی سزا میں تخفیف ہو جائے گی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ۔ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ایمان بالرسالت

پچھلے مضمون کو دیکھ کر وہی صاحب جن کے استفسار پر وہ مضمون لکھا گیا تھا، پھر لکھتے ہیں :-

" ایمان بالرسالۃ کے متعلق آپ کا عالمانہ تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے خیال ناقص میں ایک دو پہلو ابھی حل طلب ہیں جو مختصراً معروض ذیل ہیں:

(ا) آپ فرماتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لیے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے ... لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لیے چند شرائط ہیں اور بادنیٰ تامّل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں" اس کے بعد ان شرائط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ فرمودۂ الٰہی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (البقرہ: ۲۸۶) کے مطابق ہر شخص اپنی وسعتِ علم و فکر تک مکلف ہے جیسا کہ شروع سوال تک مذکور ہے۔ اگر تربیت، ماحول اور استعداد ذاتی تکمیل شرائط میں حائل ہیں تو اس کی کی ذمہ داری اس متجسس پر کیوں عائد ہو؟ انتخاب طریق میں اس نے اپنی لیاقت کے مطابق تفکر اور تعقل سے کام لیا اور اسی حد تک وہ مکلف تھا۔ اس کو موردِ عذاب و الزام کرنا بظاہر تکلیف مالا یطاق ہے۔

(ب) جناب فرماتے ہیں کہ " قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں جس میں ترتیب کے ساتھ ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی ہیں" مگر پھر بھی ارشاد ہوتا ہے کہ " سورۂ آل عمران کو پچھلے

رکوع سے بارھویں رکوع تک مسلسل پڑھا جائے تاکہ تناقض کا شائبہ تک نہ رہے سوال بھیجنے سے پہلے بھی پڑھا تھا اور دوبارہ بھی ان سب آیات کو پڑھا ہے مگر شکل رفع نہیں ہوتی۔ اہل کتاب کے جھگڑوں ضد، شرک، وغیرہ کو دیکھ کر ایک معتدل روش کی طرف دعوت دی گئی تھی کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم۔ (آل عمران ۶۴) ان کلمات اور اس دعوت کا کیا مفہوم اور مقصد تھا؟ بظاہر تو یہی ہے کہ تم اگر اپنی سچی تعلیم پر عمل کرو گے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں تم اور ہم یکساں ہوں گے۔ دل نہیں مانتا کہ یہ الفاظ یونہی رسمی طور پر دفع الوقتی یا رفع الزام کے لیے کہے گئے اور کہ فی الحقیقت اشتراک فی العمل اور دعوت مقصود نہ تھا۔

(ج) سوال لکھتے وقت فی الذہن اہل کتاب ہی تھے اور آیات مرقومہ اسی لیے استشہاداً پیش کی گئی تھیں۔ جہاں کہیں اہل کتاب کے اس گروہ کی تعریف کی گئی ہے جو دیانت دار تھے، خدا ترس تھے، امین تھے، شب گزار تھے بعض مفسرین نے اس کی وہی تفسیر کی ہے جس کی طرف آپ گئے ہیں کہ یہ وہ گروہ ہے جو مسلمان ہو چکا تھا جیسے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ، نصاریٰ نجران وغیرہم مگر افسوس کہ اس سے تسلی نہیں ہوتی اور نہ ہی الفاظ قرآن اس کے حامل ہیں۔ مثلاً ولو آمن اھل الکتٰب لکان خیراً لھم منھم المؤمنون و اکثرھم الفاسقون (آل عمران: ۱۱۰) کے ترجمہ میں آپ فرماتے ہیں کہ ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں۔ مومنون اور فاسقون دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں اور دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں۔ ان میں سے ایک کے معنی ماضی کے لینے اور دوسرے کے حال کے اور پھر الفاظ منھم اور اکثرھم کے مفہوم کو متعین نہ کرنا تسلی بخش نہیں کما لایخفیٰ علی المتأمل۔ مگر دوسری آیت واضح ترین ہے جس میں ایسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں اور جس کا ترجمہ جناب نے نہیں فرمایا یعنی لیسوا سواءً من اھل الکتٰب امۃ قائمۃ

يَتْلُونَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ - يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ - وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (آل عمران ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵) "سب کے سب برابر نہیں، اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کی آیتیں راتوں کھڑے پڑھتے رہتے ہیں۔ اور سجدے کرتے ہیں، اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور روزِ آخرت پر، نیک کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔ وہ کسی طرح کی بھی نیکی کریں گے اس کی ہرگز ناقدری نہ ہوگی اور متقین کو اللہ خوب جانتا ہے۔" اس کی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں نصاریٰ کی تعریف کی ہے کہ ان میں دیندار طبقہ ہے اور وہ متکبر نہیں ہیں۔ اگر آیات مذکورہ میں وہی لوگ مراد ہوتے جو جناب لے رہے ہیں تو فصاحت اور بلاغت قرآنی کو مدنظر رکھتے ہوئے الفاظ مختلف ہوتے۔

(د) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (حدید ۲۸) کے متعلق جناب فرماتے ہیں کہ "اس میں تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر تم یہ دونوں باتیں اختیار کرو گے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملے گا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ

بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ" (اعراف: ۱۷۰) مگر ان سب آیات کو ملا کر جو نتیجہ آپ نے آخر مضمون میں نکالا ہے وہ تعجب انگیز ہے یعنی " ان کو اللہ کی رحمت کا صرف اتنا حصہ ملے گا کہ ان کی سزا میں تخفیف ہو گی۔ تیلی بھی کیا اور روکھا بھی کھایا۔

کم علمی کی وجہ سے یہ شکوک سوجھے ہیں اگر جناب و دیگر علماء کرام مزید توجہ فرما کر ان کو رفع کریں گے تو انشاء اللہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔"

آپ نے جو اعتراضات پیش فرمائے ہیں ان کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں:

(۱) آپ کا استدلال اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف منکرِ رسالت کو برسرِ حق تسلیم کرنا لازم آئے گا بلکہ ہر شخص کے مسلک کو اس کی حد تک صحیح مان لینا لازم آ جائے گا، خواہ وہ مشرک ہو یا دہریہ یا کوئی اور۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنی وسعتِ علم و فکر کی حد تک مکلف ہے اور تلاشِ حق میں غلطی یا کوتاہی کی ذمہ داری اس پر کچھ نہیں ہے تو جس طرح وہ موحد مورد الزام و مستحق عذاب نہیں ہے جو غور و فکر کے باوجود رسالت میں "نیک نیتی" کے ساتھ شک رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ مشرک بھی کسی عقوبت کا مستحق نہ ہونا چاہیے جو "نیک نیتی" کے ساتھ کسی پتھر یا درخت یا جانور کو خدا سمجھتا ہے، اور وہ دہریہ بھی کسی سزا کا مستوجب نہ ہونا چاہیے جو سرے سے خدا ہی کے وجود میں "نیک نیتی" کے ساتھ شکوک رکھتا ہے اس لیے کہ یہ سب بھی تو اپنی وسعتِ علم و فکر تک ہی مکلف ہیں اور ان کے علم و فکر کی رسائی بھی تو وہیں تک ہے جہاں تک یہ پہنچے ہیں۔ اس قاعدہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو مومن اور کافر اور مشرک کا امتیاز سراسر لغو قرار پائے گا اور تبلیغ دین کے لیے سرے سے کوئی عقلی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ دین جن باتوں کی طرف بلاتا ہے ان کو اگر کوئی شخص اپنی کوتاہیٔ فکر کی بنا پر، مگر "نیک نیتی" کے ساتھ رد کر دے، تب بھی وہ برسرِ حق ہی رہے گا اور اپنے اس فعل کے لیے کسی الزام یا کسی سزا کا مستحق نہ ہو گا۔

آپ اس قاعدہ کی بنا آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: ۲۸۶) پر رکھتے ہیں۔ لیکن

میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اس کا وہی مفہوم ہے جو آپ نے سمجھا ہے تو یہ آیت قرآن مجید کی پوری تعلیم کے خلاف ہے، اور اس صورت میں یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ قرآن نے دو بالکل متعارض اصول پیش کیے ہیں۔ ایک طرف تو وہ انسان کو خدا اور اس کے ملائکہ اور کتابوں اور رسولوں اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کو نہ مانو گے تو کافر ہو گے اور تم کو آخرت میں سزا دی جائے گی۔ دوسری طرف وہی قرآن (آپ کے زعم کے مطابق) کہتا ہے کہ تم صرف اپنی وسعتِ علم و فکر تک مکلف ہو، اگر تمہاری فکر کی رسائی ان پانچوں ایمانیات، یا ان میں سے کسی ایک تک نہ ہو، اور اس نارسائی فکر کی بنا پر تم ایک کو یا سب کو ماننے سے انکار بھی کر دو، اور ان کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ رکھو، تب بھی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور تم کسی الزام یا سزا کے مستحق نہیں ہو۔ یقین مانیے کہ اگر قرآن مجید کی تعلیم میں حقیقتاً اتنا صریح تناقض موجود ہوتا تو کوئی صاحبِ عقل انسان اس کو خدا کی کتاب نہ مانتا۔

اس اشکال کا وہی حل ہے جو میں اپنے سابق مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تکلیف ہی نہیں دی ہے کہ وہ اپنی محدود قوتوں سے اس کی معرفت تک پہنچے اور اس کی بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جس خدا نے انسان کو بنایا ہے وہ جانتا ہے کہ انسان کی وسعتِ علم و فکر کہاں تک ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ عام انسانوں کی قوتِ فکر اور صلاحیتِ اکتسابِ علم اتنی ہے ہی نہیں کہ وہ اس بلند مقام تک پرواز کر سکیں جہاں اس جیسی ماوراے سرحدِ ادراک ہستی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ عام انسان اپنی پیدائشی کمزوریوں اور ماحول کے اثرات سے اس قدر پاک اور منزہ نہیں ہو سکتے کہ محض اپنے اجتہاد سے صرف خداوندِ عالم کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر دیں۔ اس لیے اس نے ان کی وسعت و طاقت سے زیادہ ان پر تکلیف کا بار ڈالا ہی نہیں۔ اس نے تو خود انسانوں ہی میں سے بعض خاص اشخاص کو منتخب کر کے انہیں راہِ راست کا علم دیا اور ان کو اس بات پر مامور کیا کہ اپنے ابناے نوع کو اس کی نشانیاں کھول کھول کر بتائیں اور ان کی

عقل وفہم کے مطابق انہیں تعلیم دیں۔ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (الاعراف: ۳۵) پس تکلیف جو کچھ بھی دی گئی ہے وہ اس امر کی ہے کہ انسان خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی سیرت اور ان کی تعلیم پر غور کرے، اور جب دیکھے کہ وہ جس راستے کی طرف بلا رہے ہیں اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، نہ وہ جھوٹ بولنے والے اور دھوکہ دینے والے لوگ ہیں، نہ کسی ایسی بات کی طرف بلا رہے ہیں جو تقوے اور صلاح کے خلاف ہو، تو ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کرے۔ اس تکلیف کو ما لا یطاق نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہدایت کو انسان کے علم و عقل سے اتنا قریب کر دینے کے بعد بھی کوئی شخص نیک نیتی یا بدنیتی کے ساتھ اس کو قبول نہیں کرتا اور اس کے خلاف چلتا ہے تو اس کو اپنی اس کوتاہی کا انجام ضرور دیکھنا پڑے گا۔

آپ پھر پلٹ کر کہیں گے کہ اگر کوئی شخص اپنی وسعتِ علم و فکر کی حد تک رسولوں کی سیرت اور ان کی تعلیم پر غور کرنے کے باوجود ان کی رسالت پر مطمئن نہ ہو سکے تو اس کوتاہیٔ فہم و نارسائیٔ فکر کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں اور اس کو موردِ الزام و مستحقِ عذاب نہ ہونا چاہیے۔ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی شے انسان بحیثیت انسان کی حدِ عقل وفہم سے باہر ہو اور کوئی انسان اس تک نہ پہنچے تو البتہ وہ معذور ہے کیونکہ اس شے کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ انسان اس تک پہنچ سکے لیکن اگر کوئی چیز اس حد کے اندر ہو، اور اس کی شان یہ ہو کہ انسان بحیثیت انسان ہونے کے اپنی بشری قوتوں کے ساتھ اس حد تک پہنچ سکتا ہو اور پھر کوئی شخص اس تک نہ پہنچے تو یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا، یا تو اس نارسائی میں ان کی ہوائے نفس کا دخل ہوگا، یا یہ نارسائی خالصۃً اس کی کوتاہیٔ فہم پر مبنی ہوگی۔ پہلی صورت میں تو اس کے مجرم ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ رہی دوسری صورت، تو آپ کو خواہ اس کم عقل انسان پر کتنا ہی رحم آئے، بہر حال اس سے آپ انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی کوتاہ فہمی

ے جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ حق نہیں ہے اور یہ کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں کہ جو حق تک نہیں پہنچا ہے وہ انجام کار میں ان لوگوں کے برابر ہو جو حق تک پہنچ گئے ہیں۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہر شخص جو کچھ سوچے اور سمجھے گا اپنی وسعتِ علم و فکر کی حد تک ہی سوچے اور سمجھے گا۔ اس حد سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا حق اور صداقت ہر شخص کی انفرادی سمجھ بوجھ کے مطابق بدلنے والی چیز ہے، یا ایک متعیّن شے ہے خواہ کوئی شخص اسے سمجھے یا نہ سمجھے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ کوئی مخصوص عدد نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنی حد تک غور و فکر کرنے کے بعد "نیک نیتی" کے ساتھ جس عدد پر بھی پہنچ جائے وہی صحیح مجموعہ ہے خواہ وہ ۷۹ ہو یا ۸۱ یا ۸۰، مگر یہ ایسی غیر معقول بات ہے کہ مجھے امید نہیں کہ آپ اس کے قائل ہوں۔ لہٰذا آپ کو لامحالہ دوسری شق ماننی پڑے گی، یعنی یہ کہ ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ بہرحال ۸۰ ہے خواہ کسی کی حدِ علم و فکر وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۳۰ اور ۵۰ کے مجموعہ کو ۷۹ یا ۸۱ یا کچھ اور کہتا ہے خواہ کوتاہ فہمی کی بنا پر "نیک نیتی" کے ساتھ ایسا کہے یا جان بوجھ کر بدنیتی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اس کا حساب غلط ہوگا، اس کی فردِ حساب اس غلطی کی وجہ سے آخر تک غلط ہو جائے گی اور اس کی تمام محنت جو اس نے فرد تیار کرنے میں صرف کی ہے ضائع ہو جائے گی۔ "نیک نیتی" اور "بدنیتی" کا کوئی دخل حساب کی صحت و عدمِ صحت میں نہیں ہے، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ غلط حساب لگانے والے کو اس شخص کے برابر کر دیا جائے جس نے صحیح حساب لگایا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ نیک نیت احمق کو اتنی سزا نہ دی جائے گی جتنی بدنیت شریر کو دی جائے گی۔

(۲) قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس سے یہ کہنا مقصود نہ تھا کہ آیاتِ قرآنی میں کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ قرآن مجید میں ایک ایک مسئلہ پر تسلسل کے ساتھ یکجا بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں جیسا موقع پیش آیا ہے مسائل کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یا چند پہلوؤں کو بیان کر

دیا گیا ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والے کو لازم ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کرنا چاہے تو مجموعی طور پر قرآن کی پوری تعلیم پیش نظر رکھے۔ ورنہ اگر وہ محض کسی ایک آیت یا چند آیات پر حصر کرے گا اور دوسری آیات کو جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں نظر انداز کر دے گا تو صحیح رائے قائم نہ کر سکے گا۔

(۳) تعجب ہے کہ آپ نے سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک بارہا پڑھا اور پھر بھی مشکل رفع نہ ہوئی۔ حالانکہ چھٹے رکوع کے آغاز ہی میں آپ دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ حضرت ابراہیم اور یعقوب اور موسیٰ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے ان کو اس بنا پر دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی گئی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لائے تھے۔ غور کیجیے کہ یہ لوگ مطلقاً رسالت کے منکر نہ تھے۔ صرف ایک رسول کا دعوائے رسالت سن کر انہوں نے اپنی وسعتِ علم و فکر تک غور کیا اور جب ان کا دل اس پر نہ ٹھکا تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس پر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (بقرہ:۲۸۶) کا قاعدہ جو آپ تجویز فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جاری نہ کیا بلکہ فرمایا کہ فَاُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (آل عمران:۵۶) نہ صرف اس مقام پر بلکہ قرآن مجید میں کسی دوسری جگہ بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس عذاب کی وعید سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اگرچہ حضرت عیسیٰ کی رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتے ہیں مگر شرک سے مجتنب اور توحید و تقویٰ کے طریقہ پر قائم ہیں۔

(۴) الجھن کی بڑی وجہ وہ آیت ہے جس میں اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء کی طرف بلایا گیا ہے، اور اس میں رسالتِ محمدی پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ آیت پر بحث کی جائے، آیت کے اصل الفاظ سن لیجیے:

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا	اے محمدؐ، کہو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے
اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ	کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ	یکساں ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا

شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (آل عمران : ۶۴)

کسی کی عبادت نہ کریں اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔ پھر اگر وہ اس دعوت سے روگردانی کریں تو کہدو کہ گواہ رہو ہم مسلم ہیں۔

اس آیت میں کونسا لفظ ہے جس سے آپ نے یہ معنی نکالے کہ اس کلام سے مقصد یہود و نصاریٰ کو دعوت الی اللہ کے کام میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت عمل کی دعوت دینا تھا؟ اور یہ کہاں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنی سچی تعلیم پر عمل کروگے اور شرک کو چھوڑ دوگے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں ہم اور تم یکساں ہونگے؟ اور اس معنی کی طرف کونسا اشارہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے والے ایمان لانے والوں کی طرح حق پر ہیں اور ان کے برابر درجہ رکھتے ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے سامنے اپنا دعوائے رسالت پیش کیا اور وہ آپ سے جھگڑا کرنے لگے (جیسا کہ آیتِ مباہلہ میں اس آیت سے اوپر ہی بیان کیا گیا ہے)، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ان کو اس بات کی طرف دعوت دو جو تمہارے اور ان کے درمیان مشترک ہے یعنی یہ کہ:

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔
اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب اور اپنا الٰہ اور حقیقی فرمانروا اور حاکم نہ بناؤ۔

یہ تینوں باتیں وہ تھیں جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات میں موجود تھیں، مگر یہود و نصاریٰ ان کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کو معبود بنا لیا تھا۔ یہودی اور نصرانی دونوں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگے تھے قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ

اللّٰہِ (التوبہ: ۳۰) یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنے علماء و مشائخ اور مذہبی عہدہ داروں کو خدا بنا رکھا تھا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (التوبہ: ۳۱) چونکہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا آغاز اسی سبب سے ہوا تھا کہ انہوں نے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی بنیادی تعلیم کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے حکم ہوا کہ پہلے ان کو اس چیز کی طرف بلاؤ جو ان کے اپنے تسلیم کردہ مذہب کی تعلیم بھی ہے اور تمہارے دین کی بنیاد بھی۔ اس دعوت سے دو فائدے مقصود تھے۔ ایک یہ کہ اہلِ کتاب میں سے جو اتنا حق پسند اور سلیم الطبع ہو گا کہ اپنے مذہب کے صدیوں کے متوارث عقائدِ باطلہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے گا، اس کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کر لینے میں کوئی مشکل حائل نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس کلمۂ سواء کی دعوت سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی چیز کی طرف بلانے والے ہیں جس کی طرف عیسیٰ اور موسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام بلاتے تھے۔ پھر ان کی تصدیق کرنے والے کے لیے ان کی تکذیب کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے؟

یہ اس آیت کا صاف اور واضح مفہوم ہے۔ اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ اہلِ کتاب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطالبہ نہ تھا؟ اور اس سے یہ بات کیسے نکالی جا سکتی ہے کہ اگر اہلِ کتاب صرف "اپنی سچی تعلیم" پر عمل کریں اور شرک چھوڑ دیں تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے یا آپ کی رسالت میں شک رکھنے کے باوجود ہدایت یافتہ اور مستحقِ نجات ہوں گے؟ کیا یہ آیت اس آیت کو منسوخ کرتی ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے؟ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا . . . فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ . . . لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (اعراف ۱۵۸) اور کیا یہ آیت اس آیت کی بھی ناسخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو اس نبی کی نبوت اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو نہ مانے گا وہ خسران میں رہے گا؟ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ: ۱۲۱) کیا قرآن میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ کسی قوم کے پاس رسول بھیجا جائے اور وہ اس کو نہ مانے اور

اور پھر بھی ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہی رہے ؟ اگر خدا کی طرف سے آتے ہوئے رسول کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوں اور نہ ماننے کی صورت میں بھی اسی طرح نجات نصیب ہو سکے جس طرح ماننے کی صورت میں ہوتی ہے، تو پیغمبروں کے بھیجنے سے بڑھ کر لغو اور عبث فعل اور کیا ہو گا ؟ بظاہر ایسا خیال کرنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف اس بات کو منسوب کرنا خدا کو معاذ اللہ نادان ثابت کرنا ہے۔

(۵) ضمن ج کے ماتحت آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے جواب میں وہ بات کافی ہے جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ مگر جن دو آیتوں کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے ان کی مزید تشریح ضروری ہے۔ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ میں امن سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟ (آل عمران: ۱۱۰) اس آیت میں جن کا ذکر اہل کتاب کے لفظ سے کیا گیا ہے ان کا اہل کتاب ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ پر، اپنی کتاب پر، اپنے رسول یا رسولوں پر، ملائکہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اور کس پر ایمان لانے کی کسر باقی رہ گئی ہے ؟ اسی طرح مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران: ۱۱۰) میں انہی اہل کتاب میں سے بعض کو جب مومن کہا گیا ہے تو اس کا مفہوم بھی بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مومنین وہ اہل کتاب ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ؟ اور معلوم ہے کہ وہ چند ہی تھے۔ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے اور انہی کو "فاسق" کہا گیا ہے۔ میں نے ترجمہ میں ماضی اور حال کا فرق محض مفہوم واضح کرنے کے لیے کر دیا تھا۔ ورنہ اگر آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ "ان میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق" تو اس سے بھی مفہوم نہیں بدلتا۔

رہی دوسری آیت، تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں بھی مدارج کا فرق ہے۔ ان میں سے جو گروہ راتوں کو عبادت کرتا اور کتاب پڑھتا ہے اور خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور نہ صرف خود نیکوکار ہے بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے، وہ اس گروہ سے تو بہر حال بہتر اور

بلند تر درجہ میں ہے جو آیاتِ الٰہی کا منکر اور حق سے تجاوز کرنے والا اور بدکار و نافرمان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کو یکساں سمجھا جائے اور ان کا انجام ایک ہی سا ہو تو یہ عقل کے خلاف ہوگا۔ ان بدکاروں کے مقابلہ میں ان نیکوکاروں کی قدر یقیناً ہونی چاہیے اور ہوگی بھی۔ مگر یہ پہلے ہی کہہ دیا کہ ان متقی اور نیک اہلِ کتاب کے حق میں بھی بہتر یہی تھا کہ وہ نبی امی پر ایمان لے آتے (وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ) (آل عمران: ۱۱۰) کیونکہ خدا نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی بات مانی جائے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) (نساء: ۶۴) جو شخص خدا کے رسول کی بات نہیں مانتا وہ دراصل خدا کی بات نہیں مانتا (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ) (نساء: ۸۰) اسی کا نام "فسق" ہے (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ) (آل عمران: ۱۱۰) اور فسق کرنے والے کو دار الفاسقین ضرور دکھایا جائے گا۔

(۶) آیت يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (حدید: ۲۸) کی تفسیر میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ کلمۂ شک کے ساتھ ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پرہیزگار اور نیک اہلِ کتاب کو اللہ کی رحمت میں سے کتنا حصہ ملے گا اور ان کے اعمال کی قدر کس صورت میں ہوگی؟ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں جب اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے تو مجھے اور کسی کو بھی اپنی رائے سے اس کی تعیین کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں یقین کے ساتھ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ بس اسی قدر ہے کہ نہ تو وہ اس ادنیٰ درجہ میں رکھے جائیں گے جو بدکار کافروں کے لیے ہے اور نہ ان کامل الایمان لوگوں کے ہم رتبہ کر دیئے جائیں گے جو تمام رسولوں کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام کتابوں کے ساتھ قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں۔[1]

(ترجمان القرآن۔ شعبان ۱۳۵۳ھ۔ نومبر ۱۹۳۴ء)

---

[1] اس مضمون کی اشاعت کے بعد ایک مدت تک نظرِ ثانی کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب جو اس مقام پر نگاہ پڑی تو دو حدیثیں یاد آگئیں جو آیت زیرِ بحث کی ٹھیک ٹھیک تفسیر کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ:

وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ — قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی

(باقی صفحہ ۲۱۷ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

فِیْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

جان ہے کہ اس امت کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی، جو میری رسالت کی خبر سنے اور اس پیغام کو جو میں لایا ہوں نہ مانے اور پھر دوزخیوں میں شامل نہ ہو۔

دوسری یہ کہ:

ثَلٰثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ، رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِیِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ .. الخ (بخاری و مسلم)

تین آدمی ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا، ایک وہ شخص جو اہل کتاب میں سے تھا، پہلے اپنے نبی کو تو مانتا ہی تھا اب محمد پر بھی ایمان لے آیا.....

بظاہر تو یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص پہلے نبی کو مانتا ہے اور پھر بعد والے نبی کو بھی ماننے لگا اسے تو دوہرا اجر ملے، مگر جس نے بعد والے نبی کو نہ مانا وہ پہلے نبی کو ماننے کے اجر سے بھی محروم ہو جائے۔ سطحی نظر میں سیدھا سا حساب تو یہی نظر آتا ہے کہ اگر دونوں نبیوں کو ماننے کے دو اجر ہیں تو ایک کے ماننے پر ایک اجر ہونا چاہیے۔ مگر یہ صرف ریاضی کا مغالطہ ہے جو تھوڑے سے تامل سے دُور ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص ہے جو حکومت کے مقرر کیے ہوئے پہلے گورنر کے تحت عمدہ خدمات بجا لاتا رہا، پھر حکومت نے اس کی جگہ دوسرا گورنر بھیجا تو وہ اس کی ماتحتی بھی اسی حُسنِ خدمت کے ساتھ کرتا رہا۔ حکومت کہتی ہے کہ ہم اس کی پچھلی خدمات کا صلہ بھی دینگے اور بعد کی خدمات کا بھی۔ اب کیا حکومت کے اس بیان سے آپ یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس شخص نے پہلے گورنر کو تو مانا اور اس کی خوب اطاعت کی مگر دوسرے گورنر کو اس نے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اسے حکومت ان خدمات کا اجر تو ضرور ہی دیگی جو اس نے پہلے گورنر کے ماتحت انجام دی تھیں؟ اس سوال کا جو کچھ بھی آپ جواب دیں گے وہی اس مسئلے کا جواب بھی ہے کہ دونوں پیغمبروں کے ماننے والے کا اجر دوہرا کیوں ہے اور بعد میں آنے والے پیغمبر کا انکار کرکے جو شخص پہلے پیغمبر ہی کے ساتھ وابستہ رہے وہ کس بنا پر سرے سے کسی اجر کا مستحق ہی نہیں رہتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اگر وہ بدکاریاں اور ظلم و ستم نہیں کرتا تو اس کا حشر ان لوگوں کا سا نہ ہوگا جو ظالم اور بدکار ہیں۔

قرآن پر سب سے بڑا بہتان

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ: ۶۲)

یوں تو قرآن مجید کی آیات میں معنوی تحریف کرنے کی ہر زمانے میں کوششیں کی گئی ہیں، اور ہر دور میں کج نظر لوگوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ کتاب الٰہی کے واضح ارشادات کو توڑ مروڑ کر اپنے نفس کی خواہشات یا اپنے دوستوں کے رجحانات و مطالبات کے مطابق ڈھالتے رہیں لیکن زمانہ حال میں جو معنوی تحریف آیت مندرجہ عنوان میں کی گئی ہے، اس سے بڑھ کر گمراہ کن تحریف شاید ہی کبھی کی گئی ہو۔ دوسری تحریفات تو زیادہ تر احکام کی قطع و برید پر مشتمل ہیں، یا تعلیمات اسلامی کے اجزاء میں سے کسی جزء پر ضرب لگاتی ہیں، مگر یہ تحریف سرے سے اس بنیاد ہی کو اکھیڑ پھینکتی ہے جس پر قرآن مجید تمام عالم کو ایک صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اس کی زد اس قاعدۂ کلیہ پر براہِ راست پڑتی ہے جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور جس کے تحت ابتدائے آفرینش سے بعثت محمدی صلعم تک تنزیلِ کتب اور ارسالِ رسل کا سلسلہ جاری رہا ہے حقیقت میں اس تحریف نے روحِ ضلالت کی وہ خدمت انجام دی ہے جس سے ائمۂ کفر و ضلال بھی عاجز رہ گئے تھے۔ یہ ایک طرف تو غیر مسلموں کو قرآن کی دعوتِ حق قبول نہ کرنے کے لیے خود قرآن ہی سے دلیل بہم پہنچاتی ہے، دوسری طرف مسلمانوں کی جماعت میں جو منافقینِ اسلام کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بے چین ہیں ان کو بہ کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دینے کی اجازت خود اسلام ہی کی زبان سے دلواتی ہے، اور تیسری طرف جو اچھے خاصے صاحبِ ایمان لوگ خدا کی کتاب اور

اس کے رسول کی پیروی پر قائم ہیں، ان کے ایمان کو بھی متزلزل کر دیتی ہے، حتیٰ کہ وہ بیچارے اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ جب قرآن اور رسالتِ محمدی سے انکار کر کے بھی انسان نجات پا سکتا ہے، اور جب نجات کے لیے سرے سے کتاب اور رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے تو پھر اسلام کی پابندی محض بے معنی ہے، اور ہمارا مسلمان ہونا یا ہندو، عیسائی، پارسی، یہودی وغیرہ ہونا یکساں ہے۔ غرض یہ ایک شاہ ضرب (Master Stroke) ہے جو ہر طرف سے، اندر سے بھی اور باہر سے بھی، اسلام کو نشانہ بناتی ہے۔ داد دینی چاہیے اس ذہانت کی جس نے کتاب ہدایت سے ضلالت کا یہ ہتھیار نکالا! ــــ شاید قرآن پر اس سے بڑا بہتان کبھی نہیں لگایا گیا۔

مجھے بکثرت مجلسوں میں اس تحریف کے کرشمے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ میں نے دیکھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بُری طرح اس کے شکار ہو رہے ہیں۔ ناظرینِ "ترجمان القرآن" میں سے بھی متعدد اصحاب نے مجھے لکھا کہ اس آیت کی "جدید تفسیر" سے سخت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں۔ بعض غیر مسلم مشاہیر کی تحریروں اور تقریروں سے بھی اندازہ ہوا کہ اس "تفسیرِ نو" سے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس فتنے کو دیکھ کر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم قرآنِ مجید سے متعین کیا جائے، اور جو معنی اس کو پہنائے گئے ہیں ان کی تردید خود قرآن ہی سے کر دی جائے۔ کیونکہ جب قائل خود اپنے قول کی تشریح کر دے تو کسی شخص کو اپنے طور پر اس کے قول کو کچھ دوسرے معنی پہنانے کا حق ہی نہیں رہتا۔

سب سے پہلے آیت کے اصل الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ	بے شک جو لوگ ایمان لاتے (یعنی مسلمان) اور جو یہود ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو کوئی بھی اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لایا اور جس نے بھی نیک عمل کیے ان سب کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں اجر ہے اور ان کے

لیے خوف اور رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ (البقرہ: ۶۲)

اسی مضمون کا اعادہ سورۂ مائدہ کے دسویں رکوع میں بھی تھوڑے سے تغیر لفظی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دونوں آیتوں کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کا تجزیہ کر کے ایک ایک لفظ کا مفہوم متعین کیا جائے اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو بات ان آیتوں میں مختصراً بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل خود قرآن میں دوسرے مقامات پر کس طرح کی گئی ہے۔

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اس کا لفظی ترجمہ صرف اس قدر ہے کہ "بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے"۔ مگر اس مبتدا کی خبر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (جو بھی اللہ پر ایمان لایا اور یوم آخر پر) میں دوبارہ ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان لانے والے کا ایمان لانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اَلَّذِیْنَ سے اگر وہی لوگ مراد ہوں جو خدا اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں تو ان کے لیے دوبارہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ کہنا فضول ہوگا۔ لہٰذا یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد محض گروہ اہلِ اسلام ہے، اور اس کے مقابلہ میں مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ سے وہ شخص مُراد ہے جو درحقیقت ایمانِ کامل کا حامل ہو، بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس گروہ سے انتساب رکھتا ہے۔

نزولِ قرآن کے عہد میں گروہ بندی کے جو تخیلات دماغوں پر مسلط تھے وہی آج بھی مسلط ہیں اور ان کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ قرآن مجید یہاں دراصل فرق کر رہا ہے ان لوگوں کے درمیان جو اہلِ ایمان کے گروہ سے انتساب رکھتے ہوں اور ان کے درمیان جو فی الواقع حقیقتِ ایمان کے حامل ہوں۔ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا فرقہ بندی کے نقطۂ نظر سے ہی اشخاص میں تمیز کرتی ہے۔ ایک شخص کو مومن یا مسلم کہا جاتا ہے، صرف اس لیے کہ جماعتوں کی تقسیم کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ درحقیقت بھی "مسلم" ہے یا نہیں۔ اسی طرح ایک عیسائی، ایک یہودی، ایک بودھی کو بھی اس کے ظاہری انتساب کا لحاظ کرتے

ہوئے عیسائی، یہودی وغیرہ کہا جاتا ہے قطع نظر اس سے کہ حقیقت میں وہ اپنے گروہ کے ایمانیات پر اعتقاد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اسی قسم کی صورت حال نزولِ قرآن کے عہد میں بھی تھی کہ حقیقت سے قطع نظر کرکے نوعِ انسانی کو ظاہر کے اعتبار سے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ لوگ اس لحاظ سے اشخاص اور جماعتوں کے درمیان امتیاز کرتے تھے کہ فلاں شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کا آدمی ہے، اور فلاں یہودیوں کے گروہ سے ہے، اور فلاں نصرانیوں کے فرقہ والا ہے۔ چنانچہ اسی جماعتی تقسیم کے لحاظ سے منافقین بھی گروہ اہلِ ایمان (اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا) میں شمار کیے جاتے تھے، حالانکہ فی الواقع وہ ایمان نہ رکھتے تھے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اسی نقطۂ نظر کی غلطی واضح کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ حقیقتِ نفس الامری کو بیان کرنے سے پہلے گروہوں کا ذکر ان کے جدا جدا ناموں سے کر رہا ہے اور ابتدا اس نے مسلمانوں کے گروہ سے کی ہے۔

(۲) وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا۔ لفظی ترجمہ: "وہ لوگ جو یہودی ہوئے"۔ مقصود یہاں بھی وہی ہے جس کی تصریح اوپر کی گئی ہے۔ "یہودی ہوتے" سے مراد یہ نہیں کہ جنہوں نے حقیقت میں یہودیوں کا عقیدہ اور مسلک اختیار کیا ہے ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے چل کر بیان ہونے والا ہے۔ بلکہ دراصل گروہ اہلِ یہود میں شمار ہونے والوں کو اَلَّذِیۡنَ هَادُوۡا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) وَالنَّصٰرٰی۔ سلسلۂ کلام کے تحت یہاں نصاریٰ سے مراد بھی "اعتقادی عیسائی" نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو عیسائیوں کی قوم میں شمار ہوتے ہیں۔

(۴) وَالصّٰبِئِیۡنَ۔ یہ لفظ اہلِ عرب کی زبان میں عراق والجزیرہ وغیرہ علاقوں کے اس گروہ کے لیے بولا جاتا تھا جس میں انبیائے متقدمین کی تعلیمات کے ساتھ کواکب پرستی اور ملائک پرستی کے عقاید خلط ملط ہو گئے تھے۔ یہاں بھی صابئین سے مراد محض اس گروہ کے لوگ ہیں، نہ کہ صابیت پر اعتقاد رکھنے والے۔

(۵) مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ

عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ لفظی ترجمہ یہ ہے "جو کوئی بھی ایمان لایا اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور جس نے بھی نیک عمل کیے ایسے لوگوں کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ رنج "

یہاں اللہ تعالیٰ نے دراصل اس خیال کی تردید کی ہے جو عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ انسانوں کی تقسیم نام و نسب اور ظاہری انتسابات کے اعتبار سے جو مختلف قوموں اور گروہوں میں ہو گئی ہے اسی کے مطابق ان کا حشر بھی ہو گا۔ یہودی یہ سمجھتا ہے کہ جو یہودیوں کے گروہ میں شامل ہے وہی نجات پانے والا ہے، اس گروہ کے باہر کسی کے لیے نجات نہیں ہے۔ نصرانی یہ گمان کرتا ہے کہ نصرانیوں کے گروہ میں شامل ہو جانا گویا اہلِ حق میں شامل ہو جانا ہے، اور اس گروہ سے باہر سب اہلِ باطل ہیں۔ مسلمان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ محض گروہ اہلِ اسلام میں نام اور خاندان اور چند ظاہری اشکال و مراسم کے اعتبار سے شامل ہو جانا ہی "مسلمان" ہونا ہے اور اس لحاظ سے جو لوگ اس گروہ میں شامل ہیں وہ ان لوگوں پر شرف رکھتے ہیں جو اس لحاظ سے ان میں شامل نہیں ہیں۔ ان غلط خیالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان اور انسان میں حقیقی فرق و امتیاز ظاہری گروہ بندی سے نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔ جو مومن کہلاتا ہے مگر حقیقت میں ایمان اور عمل صالح سے بہرہ ور نہیں وہ حقیقت میں مومن نہیں ہے اور اس کا انجام وہ نہیں ہو سکتا جو مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ اسی طرح جو یہودی یا نصرانی یا صابی گروہوں کی طرف منسوب ہے، اگر وہ ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف ہو جائے تو حقیقت میں یہودی یا صابی نہیں بلکہ مومن ہے، اور اس کا حشر وہ ہو گا جو مومنین و صالحین کے لیے مقرر کیا گیا ہے، لیکن اگر وہ ان صفات سے عاری ہو تو جس طرح مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونا کسی شخص کے لیے نافع نہیں ہے اسی طرح یہودی یا نصرانی یا صابی گروہوں میں شامل ہونا بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر یہود و نصاریٰ کی اس گروہ پرستی کا خصوصیت

کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ	انہوں نے کہا کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائیگا
كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ	تاوقتیکہ وہ یہودی نہ ہو یا نصرانی نہ ہو۔ یہ محض
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	ان کے من سمجھوتے ہیں۔ اَے محمد! ان سے کہدو
بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ	کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ ہاں جو بھی خدا کے آگے
مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا	سر تسلیم خم کردیگا اور نیکوکار ہوگا اس کے لیے
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔	اپنے پروردگار کے ہاں اجر ہے اور ایسے ہی لوگوں
(البقرہ: ۱۱۱، ۱۱۲)	کے لیے کوئی خوف اور رنج نہیں ہے۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى	یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔ قُلْ	اور اس کے پیارے ہیں۔ اَے محمد! ان سے پوچھو
فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ	کہ پھر اللہ تمہارے گناہوں کی تم کو سزا کیوں دیتا
بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۔	ہے؟ دراصل تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے خدا
(المائدہ: ۱۸)	نے اور انسان پیدا کیے ہیں۔
قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا	انہوں نے کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہ چھوئے گی اور
مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا	اگر چھوئے گی تو زیادہ سے زیادہ چند روز۔ جو
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ	باتیں انہوں نے خود گھڑ لی ہیں انہی نے ان کو اپنے
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ	دین کے بارے میں دھوکہ دے رکھا ہے۔ پھر
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ	اس وقت کیسی کچھ گزرے گی جب ہم ان کو اس
(آل عمران: ۲۴، ۲۵)	دن جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے

اور ہر شخص کو اپنے کیے کا بدلہ ملے گا اور لوگوں کے ساتھ ظلم نہ ہوگا بلکہ وہی کیا جائے گا جس کے وہ حقیقت میں مستحق ہوں گے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ	اَے محمد! ان سے کہو کہ اگر اللہ کے ہاں آخرت
عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	کا گھر بس تمہارے ہی لیے ہے اور دوسرے

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ: ۹۴)

لوگ اس میں حصہ دار نہیں ہیں، تب تو تمہیں موت کی تمنا کرنی چاہیے اگر تم سچے ہو۔

ان تمام آیات میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اللہ کا کسی گروہ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ نجات پر کسی قوم کا اجارہ ہے تم اس بنا پر کسی خاص برتاؤ کا حق نہیں رکھتے کہ فلاں قوم میں پیدا ہوئے ہو، یا فلاں جماعت سے منسوب ہو، خدا کی نگاہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کوئی قوم نہ بجائے خود چہیتی اور مقبول بارگاہ ہے اور نہ کوئی صرف اس لیے راندۂ درگاہ کہ وہ فلاں نام سے موسوم اور فلاں طبقہ سے منسوب ہے۔ خدا کے ہاں اصل وزن انتسابات اور قومیتوں کا نہیں ہے بلکہ اصول اور حقائق کا ہے۔ سچے دل سے ایمان لاؤ گے اور نیک عمل کرو گے تو اچھا بدلہ پاؤ گے اور اگر ایمان و عمل صالح سے خالی رہو گے تو کوئی چیز تمہیں بری جزا سے نہ بچا سکے گی خواہ تم کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اسی مضمون کو مسلمانوں اور اہلِ کتاب دونوں سے خطاب کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا - وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۤئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔ (النساء: ۱۲۳، ۱۲۴)

عاقبت کا مدار تمہاری خواہشات پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں پر۔ جو برا عمل کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا اور خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے اس کو کوئی حامی و مددگار نہ ملے گا اور جو نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ با ایمان ہو، تو وہ مرد ہو یا عورت، ایسے لوگ جنت میں جائیں گے۔ دونوں قسم کے آدمیوں کے ساتھ رتی برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

یہی بات ہے جس کو آیت زیر بحث میں ایک دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس میں بحث یہ تھی ہی نہیں کہ مومن ہونے کے لیے کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور صالح ہونے کے لیے عمل کا ضابطہ کیا

ہونا چاہیے۔ یہ تفصیلات قرآن میں دوسری جگہ بیان ہوئی ہیں۔ وہاں تو محض یہ قاعدہ کلیہ بیان کرنا مقصود تھا کہ خدا کے ہاں اصل اعتبار حقائق نفس الامری کا ہے نہ کہ ان خارجی مظاہر اور سطحی اشکال اور نمائشی انتسابات کا جن پر دنیا کے لوگ کٹے مرتے ہیں۔ اسی لیے وہاں حقائق نفس الامری کی طرف ایک مختصر اشارہ کر دیا گیا۔ اب اگر اس سے کوئی شخص یہ معنی نکالتا ہے کہ اس آیت میں چونکہ صرف خدا اور آخرت پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے بس یہی دو چیزیں انسان کی نجات کے لیے کافی ہیں، ان کے بعد کسی رسول یا کسی کتاب کو ماننے اور کسی شریعت کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں، یا یہ کہے کہ قرآن کی دعوت کا منشا اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے کہ ہندو پکا ہندو بن جائے اور یہودی سچا یہودی بن کر رہے اور ہر شخص اسی مذہب کا پورا اتباع کرے جس کا وہ معتقد ہے، باقی رہا قرآن اور رسالت محمدی پر ایمان تو وہ نجات کے لیے شرط نہیں، تو ایسے شخص کے متعلق ہم صاف کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تفسیر نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ اس کی بات تسلیم ہی نہیں کی جا سکتی جب تک کہ ان دو آیتوں کو مستثنیٰ کر کے سارے قرآن کا انکار نہ کر دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ دین کی اصل ایمان باللہ ہی ہے، اور اسی لیے آیات زیر بحث میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا گیا ہے، مگر ایمان باللہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس خدا کے وجود کا اور اس کی وحدانیت کا اقرار کر لیا جائے۔ قرآن واضح طور پر خود ہی ہم کو بتاتا ہے کہ ایمان باللہ سے اس کی مراد کیا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ	جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا اور نیکوکاری
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ	اختیار کی اس کے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ: ۱۱۲)	اور ایسے لوگوں کے لیے کوئی خوف اور رنج نہیں

یہاں ایمان باللہ کی تشریح کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد "اسلام" یعنی اپنے آپ کو خدا کی رضا کا مطیع بنا دینا ہے۔ اور اس کا اجر بھی ٹھیک وہی بیان کیا گیا ہے جو آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا (بقرہ: ۶۲) میں بیان کیا گیا تھا یعنی ایسا کرنے والے کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔

پھر دوسرے مقامات پر مزید تشریح کی گئی کہ ایسا ایمان یا "اسلام" آدمی کو صرف

انبیاء اور کتبِ آسمانی کی وساطت ہی سے مل سکتا ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ خود اپنی جگہ غور و فکر کر کے خدا اور آخرت کے متعلق ایک عقیدہ اور اخلاق ... ایک نظریہ قائم کرے، یا اپنے ذاتی انتخاب سے کام لے کر کچھ باتیں اس ... اور کچھ اس مذہب کی چن لے، اور وہ قرآن کی نظر میں مومن قرار پائے۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ	کہو کہ ہم ایمان لاتے اللہ پر اور اس ...
إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ ...	جو ہماری طرف آئی ہے اور ان ...
... وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ	ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب ...
رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ	یعقوب کی طرف اتاری گئی تھیں ...
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ - فَإِنْ آمَنُوا	کتابوں پر جو تمام انبیاء کو ان کے ...
بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا	طرف سے دی گئیں ہم ان میں سے ...
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ	الگ نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے ...
(البقرہ: ۱۳۶-۱۳۷)	(مسلم) ہیں اگر وہ ایمان لائیں اسی ...

تم ایمان لاتے ہو، تو انہوں نے ہدایت پائی۔ اور اگر وہ ایسے ایمان سے انکار کریں ... پر ہیں۔

آل عمران میں دوبارہ اسی مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے اور نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ بیان کرنے کے بعد صاف کہا گیا ہے کہ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ ... مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (آل عمران: ۸۵) یعنی جو شخص اس دین کو ... کوئی اور دین پسند کرے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نامراد رہے ...

پھر اسی سورت میں دوسری جگہ فرمایا:

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ	اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہو کہ میں نے ...
وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِينَ	پیروؤں نے تو اپنے آپ کو خدا کا ...
أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ	(مسلم) بنا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب ...
فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا -	اور ان پڑھ لوگوں (غیر اہل کتاب ...

(آل عمران: ۲۰) تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ اسلام لائیں تب وہ بے شک ہدایت یافتہ ہوں گے۔

ان آیات سے پوری صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت زیر تفسیر میں ایمان باللہ سے مراد محض خدا کو مان لینا نہیں ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی کی تعلیم کے مطابق ماننا ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ قرآن نہایت قطعی الفاظ میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ نبی اور کتاب کا واسطہ انسانی ہدایت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس واسطہ سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص ہدایت نہیں پا سکتا۔ اور اس بنا پر کوئی شخص صاحب ایمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ خدا کے ساتھ اس کے پیغمبروں پر بھی ایمان نہ لائے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (النور: ۶۲) مومن تو صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۔ (النساء: ۱۳۶) اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت سے کفر کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۔ (الطلاق: ۸-۹) اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے پروردگار اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت باز پرس کی اور ان کو بُری بُری سزا دی اور انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھا اور آخر کار وہ گھاٹے میں رہے۔

یہ ان بے شمار آیات میں سے چند ہیں جن میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسل کا تعلق غیر منفک ہے اور رسالت کا منکر کسی طرح خدا کا مومن نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی بیان کر دیا گیا کہ ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کے معنی یہی نہیں ہیں کہ رسولوں کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کر لیا جائے اور زبان سے کہہ دیا جائے کہ ہم ان کو بھی مانتے ہیں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو بھی۔ ایمان کے لیے محض اس طرح کا

ایک لفظی اعتراف کافی نہیں ہے جیسا کہ برہمو سماجی حضرات یا گاندھی جی کی قسم کے لوگ کرتے ہیں، بلکہ عملی اطاعت اور اتباع بھی ضروری ہے اور اس قاعدہ کلیہ کو تسلیم کرنا ایک ناگزیر شرط ہے کہ نبی کا قول آخری قول (Final Authority) ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حجت چلانے کا کسی مومن کو حق نہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ فرمانِ خداوندی کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ (النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (النساء: ۱۱۵)

جس شخص نے رسول سے جھگڑا کیا، درآں حالیکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو اور مومنوں کے طریقے (یعنی اطاعتِ رسول) کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا، تو جدھر وہ مڑ گیا ہم بھی اسے ادھر ہی موڑیں گے اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور اس کا بہت بُرا ٹھکانا ہوگا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔ (الاحزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو پھر وہ خود اپنے معاملہ میں اپنے اختیار سے کوئی فیصلہ کرے۔ اللہ اور اس کے رسول کی جس نے نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلاف میں (اے نبی) تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل

(النساء: ۶۵) میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بے چون چرا اس کو تسلیم کریں۔

اس کے ساتھ یہ تصریح کی گئی ہے کہ کسی ایک نبی یا ایک کتاب کو یا چند کتابوں کو مان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ تمام انبیاء اور تمام خدائی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے حتیٰ کہ اگر ایک نبی کا بھی انکار کیا جائے گا تو تمام انبیاء اور خود اللہ تعالیٰ سے بھی کفر لازم آئیگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ (النساء: ۱۵۰، ۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کریں (یعنی خدا کو مانیں اور رسولوں کو نہ مانیں)، اور جو لوگ کہتے ہیں ہم بعض رسولوں کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ درمیان کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ سب کے سب بالیقین کافر ہیں۔

یہ اس لیے کہ تمام انبیاء ایک ناقابلِ تفریق جماعت ہیں اور ایک ہی دین کی دعوت دیتے ہیں۔ لہٰذا ایک کا انکار سب کا انکار، بلکہ اصل دین کا انکار ہے۔ اگر دس آدمی ایک ہی بات کہتے ہوں تو تمہارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو سب کی تصدیق کرو یا سب کی تکذیب کرو۔ جو شخص ان میں سے نو کو سچا کہے گا اور ایک کو جھوٹا کہے گا وہ دراصل دسوں کی تکذیب بلکہ خود اس بات کی تکذیب کا مرتکب ہو گا جو انہوں نے بالاتفاق بیان کی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ ۔۔۔۔ وَاِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ (المومنون: ۵۱، ۵۲)

اے پیغمبرو ۔۔۔۔ اور بلاشبہ تمہاری یہ جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو۔

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا

اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ ٹھیرایا ہے جس پر چلنے کا نوح کو حکم دیا اور جس کی وحی اے محمد

وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (الشوریٰ: ۱۳)

تمہاری طرف بھیجی اور جس کا حکم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اس قاعدۂ کلیہ کے تحت یہ آپ سے آپ لازم آجاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی بھی تصدیق کی جائے، کیونکہ اگر کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان لاتے اور صرف آنحضرت پر ایمان لانے سے انکار کردے، یا تمام کتب آسمانی کو مانے اور صرف قرآن کو نہ مانے، تو درحقیقت وہ تمام انبیاء اور تمام کتب آسمانی، بلکہ اصل دینِ الٰہی کا منکر ہوگا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس بات کی تصریح قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بے شمار مقامات پر کی گئی ہے، اور اسی بنا پر انبیائے سابقین اور کتبِ سابقہ کے ماننے والوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ اگر تم ان پر ایمان نہ لاؤ گے تو کفر کے مجرم ہوگے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ۔ (بقرہ: ۸۹)

اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آئی جو انہی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھیں، تو باوجودیکہ اس کتاب کی آمد سے پہلے کفار کے مقابلے میں اسی کتاب کی توقع پر فتح کی دعائیں کرتے تھے، مگر اس کے آنے پر انہوں نے اس سے انکار کر دیا، حالانکہ وہ اسے خوب پہچانتے تھے پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔ . . . اور

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ۔ (البقرہ: ۹۱)

جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو خدا نے بھیجی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم تو صرف اسی کتاب کو مانیں گے جو ہمارے پاس آئی ہے۔ اس کے سوا دوسری کتاب کو ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں۔

نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ . . . . اِنَّ

اللہ نے تم پر یہ کتاب برحق اتاری ہے۔ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۔ (آل عمران: ۴)	پہلے آچکی ہیں .... بے شک جو لوگ خدا کی آیتوں سے منکر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْھًا فَنَرُدَّھَا عَلٰٓی اَدْبَارِھَآ اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۔ (النساء: ۴۷)	اے اہل کتاب ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو ہم نے اتاری ہے اور جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہیں قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ کر الٹا دیں یا ان کو اس طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح ہم نے اصحاب سبت کو لعنت زدہ کیا۔

ان سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ .... اُولٰٓئِکَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۔ (آل عمران: ۱۹۹)	اور اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ضرور ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی اور ان کتابوں پر جو ان کی طرف بھیجی جا چکی تھیں .... ایسے ہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔

یہ آخری آیت نہایت واضح طور پر آیت زیر بحث کی تفسیر کر رہی ہے۔ وہاں کہا گیا تھا کہ مسلمان یہودی، عیسائی، صابی، ان میں سے جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا وہ اس کا اجر اپنے پروردگار کے ہاں پائے گا یہاں اس کی تفسیر اس طرح کر دی گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے آجانے کے بعد صرف وہی اہل کتاب خدا کے ہاں اجر پا سکیں گے جو اللہ پر اور اس کی بھیجی ہوئی پچھلی کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ اس کتاب پر بھی ایمان لائیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی ہے۔ اس سے زیادہ کھلی ہوئی تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے باوجود جو شخص آیت زیر بحث سے یہ معنی نکالتا ہے کہ یہودی کا بس سچا یہودی بن جانا اور عیسائی کا محض سچا عیسائی بن جانا قرآن کی نظر میں ہدایت یافتہ اور مستحق اجر ہونے کے لیے کافی ہے، وہ خود قرآن کے صریح بیانات کے خلاف قرآن کی

تعفیر کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کو توراۃ اور انجیل کے اتباع کی دعوت دیتا ہے، مگر یہ بھی خبر ہے کہ اس دعوت کے معنی کیا ہیں؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر توراۃ و انجیل کا اتباع کریں، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ توراۃ و انجیل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کرنے کے لیے جو ہدایات دی گئی تھیں ان کا اتباع کیا جائے چنانچہ قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اب توراۃ و انجیل کا حقیقی اتباع، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ۔ (المائدہ:۶۸)

اے اہل کتاب تمہارا دعوائے حق پرستی ہیچ ہے جبتک کہ تم توراۃ اور انجیل اور اس کتاب کی پیروی پر قائم نہ ہو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ ۔۔۔۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (اعراف:۱۵۷)

جو لوگ اس پیغمبر نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر انہیں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ وہی درحقیقت فلاح پانے والے ہیں

یہ صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ قرآن اسی تعلیم خداوندی کو پیش کرتا ہے جس کو توراۃ اور انجیل پیش کرتی تھیں، بلکہ یہ اس وجہ سے بھی ناگزیر ہے کہ قرآن اس تعلیم ہدایت کا جدید ترین (Latest) بلکہ آخری ایڈیشن (Last Edition) ہے۔ اس میں بہت سی ان چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھیں، اور بہت سی وہ چیزیں حذف کر دی گئی ہیں جن کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا جو شخص اس ایڈیشن کو قبول نہ کرے گا وہ صرف خدا کی نافرمانی ہی کا مرتکب نہ ہوگا، بلکہ ان فوائد سے بھی محروم رہ جائے گا جو آخری اور جدید ترین ایڈیشن میں انسان کو عطا کیے گئے ہیں۔

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ (المائدہ: ۱۵)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آگیا ہے جو تم کو کتاب الٰہی کی بہت سی وہ باتیں کھول کر بتاتا ہے جن کو تم چھپاتے ہو اور بہت سی چیزوں سے معاف بھی کر دیتا ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف: ۱۵۷)

اور وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بھاری بوجھ اور وہ طوق و سلاسل اتار دیتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے۔

نیز یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اہل کتاب نے خدا کی پچھلی کتابوں میں قصداً تحریف کی اور بہت سی چیزوں کو بھلا دیا۔ اور بعض کتابوں (مثلاً اصل منزل من اللہ انجیل) کو کھو دیا، جس کی وجہ سے اب کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اتباع قرآن کے بغیر موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا اتباع کر سکے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ .... وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ۔ (المائدہ: ۱۳، ۱۴)

یہودی، الفاظ کو ان کے اصل معنوں سے پھیر دیتے ہیں، اور انہوں نے ان ہدایات کا ایک بڑا حصہ بھلا دیا جو ان کو دی گئی تھیں .... اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں ان سے ہم نے عہد لیا تھا مگر انہوں نے ان ہدایات کا ایک حصہ بھلا دیا تھا جو ان کو دی گئی تھیں۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جن قوموں کے متعلق خود قرآن نے تصدیق کی ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے کتاب دی گئی تھی، ان کے لیے بھی جب اتباع قرآن کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو پھر ان قوموں کو اتباع قرآن کے بغیر ہدایت کا راستہ کیسے مل سکتا ہے جن کا اہل کتاب ہونا محض قاعدہ کلیہ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد: ۷) کی بنا پر فرض کر لیا گیا ہے۔

بظاہر یہ کہنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے کہ "اسلام صرف اپنے آپ ہی کو برحق نہیں کہتا بلکہ دوسرے مذاہب کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اور اس کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ لوگ جب تک اپنے اپنے مذہبوں کو چھوڑ کر اسلام نہ لے آئیں ہدایت اور نجات سے بہرہ یاب نہ ہوں گے۔ بلکہ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ اپنے اپنے مذہبوں کی اصلی تعلیمات کا اتباع کرو"۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ سراسر ایک غیر معقول بات ہے۔ دو نقطوں کے درمیان جس طرح خط مستقیم ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح انسان سے خدا تک صراطِ مستقیم بھی ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اسلام جب اپنے آپ کو صراطِ مستقیم کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ لازم آجاتا ہے کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ ان سب کو غلط اور ٹیڑھے راستے قرار دے۔ کسی راستے کو صراطِ مستقیم بھی کہنا، اور پھر مختلف راستوں کو راہِ راست بھی قرار دینا کسی صاحبِ عقل کا کام نہیں ہے۔ یہ اگر رواداری ہے تو محض ایک جھوٹی رواداری ہے، اور قرآن ایسی رواداری سے صاف انکار کرتا ہے۔ قرآن مجید میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف صاف یہ اعلان کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ:-

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - (الانعام: ۱۵۳)	اور یہی میرا راستہ سیدھا ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ یہ ہدایت ہے جو خدا نے تم کو دی ہے شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کو کھینچ کر اپنی طرف لانے کے لیے آئے تھے، اس لیے کہ آپ کو اپنے برحق ہونے پر کمال درجہ کا وثوق تھا۔ آپ نہ مذبذب تھے اور نہ معاذ اللہ خوشامدی کہ تمام مختلف راہوں پر چلنے والوں کے ساتھ مصالحت اور مدارات (Compromise) کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔

رواداری جتنی مستحسن چیز ہے، اس سے بدرجہا زیادہ غیر مستحسن چیز جھوٹ ہے۔ جس شخص کو اس معاملہ میں اپنی رواداری کا مظاہرہ کرنا ہو وہ اپنی طرف سے ایسی بات کہہ سکتا ہے، مگر اسے قرآن کی طرف سے وہ بات کہنے کا کیا حق ہے جو اس نے نہیں کہی؟

قرآن تو اس کے مقابلہ میں علی الاعلان کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی پیروی کے سوا کوئی راستہ بھی صحیح نہیں ہے، تمام نوع انسانی کے لیے اور ہمیشہ کے لیے اب یہی ایک راستہ ہدایت اور نجات کا راستہ ہے، جو اس کو اختیار نہ کرے گا اس کا انجام دنیا میں گمراہی اور آخرت میں خسران کے سوا کچھ نہ ہوگا:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۔ (الاعراف: ۱۵۸)

کہدو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۔ (الانعام: ۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ تم کو اور ان سب لوگوں کو خبردار کردوں جن تک یہ پہنچے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۔ (السبا: ۲۸)

اے محمد! ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۔ (البقرہ: ۲۰۸)

اے ایمان والو تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۔ (النساء: ۱۷۰)

اے انسانو! یہ رسول تمہارے پاس خدا کی طرف سے حق لے کر آیا ہے۔ ایمان لاؤ کہ اسی میں تمہارے لیے بھلائی ہے اور اگر کفر کروگے تو جان رکھو کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک ہے

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ (البقرہ: ۹۹)

اے محمد! ہم نے تمہاری طرف کھلی کھلی آیتیں بھیجی ہیں اور ان کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو نافرمان ہیں۔

وَمَن يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۔ (البقرہ: ۱۲۱)

اور جو اس کا انکار کریں وہی نامراد ہوں گے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ... وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۔ (العنکبوت: ۴۷)

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی . . . . اور ہماری آیتوں کے ماننے سے صرف کافر ہی انکار کرتے ہیں ۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (النور: ۶۳)

پس خوف کریں وہ لوگ جو رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ کہیں وہ فتنے میں نہ پڑ جائیں یا انہیں کوئی سخت عذاب ان کو نہ آلے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔ (محمد: ۲، ۳)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اس ہدایت کو مان لیا جو محمد پر اتاری گئی ہے کہ وہی ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے، ان کے گناہ خدا نے معاف کر دیئے اور ان کا حال درست کیا۔ یہ اس لیے کہ جنہوں نے نہ مانا انہوں نے باطل کا اتباع کیا اور جنہوں نے مان لیا انہوں نے اس حق کا اتباع کیا جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے ۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ (الطلاق: ۱۰، ۱۱)

اللہ نے تمہاری طرف پیغمبر کو تمہاری آگاہی کے لیے بھیجا ہے سو تم کو اللہ کی کھلی کھلی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ . . . . فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (آل عمران: ۳۱، ۳۲)

اے محمد! کہہ دو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا . . . . اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو بے شک اللہ کافروں سے تو محبت نہیں کرتا ۔

یہ زور جو مذکورہ بالا آیات میں پایا جاتا ہے، یہ صرف اسی کلام میں ہو سکتا ہے

جس کے قائل کو اپنے صادق اور حق ہونے پر پورا پورا علم ہو اور جو اپنے علم کے مطابق نوعِ انسانی کی اصلاح کا محکم ارادہ رکھتا ہو۔ ایسے کلام کی قدر وہ فرد اخلاقی حافت رکھنے والے کس طرح کر سکتے ہیں جو صداقت کا یقینی علم بھی نہ رکھتے ہوں اور پھر دنیا میں ہر ایک کو خوش بھی رکھنے کے متمنی ہوں۔ وہ تو بڑی سے بڑی بات جو کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہوگی کہ بھائیو تم سب اچھے اور سب سچے!

" ترجمان القرآن " محرم ۱۳۵۸ھ - مارچ ۱۹۳۹ء)

نبوّتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی ؟ انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر تنگ تھے۔ اس پر وہم اور توحش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھیں۔ دنیا میں نہ تار تھا نہ ٹیلیفون تھا۔ نہ ریڈیو تھا نہ ریل اور ہوائی جہاز۔ نہ مطابع اور اشاعت خانے تھے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں، نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے عالم کی معلومات بھی بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانے کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اس زمانہ کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں وہ اس زمانہ میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بھی بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر بچے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں ان کے لیے اس زمانہ میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے اور عمریں ان کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے وہ اس زمانے کے "حقائق" تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے وہ اس زمانہ کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے وہ اس زمانہ کے اخلاقیات میں

نہ صرف جائز تھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی، کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا جب تک کہ وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلافِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو، حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا اور کسی خدا رسیدہ ہستی کا انسان ہونا اس کے تصوّر کی رسائی سے بہت دُور تھا۔

اس تاریک دَور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تصرف اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اس زمانے کے معیارِ تمدن کے لحاظ سے متمدن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ایران، روم، اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جُدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے اور صرف اموال کا مبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانہ کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا، ان پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، ان کے اخلاقی تصورات کتنے بھدے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی، کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا، ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اسے مار

ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جائے۔

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی، ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جوا، شراب، چوری، رہزنی اور قتل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانہ کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی "پرستیاں" پائی جاتی تھیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل ان کے باپ ہیں مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے، کہیں آپ کو صالح اور ہود کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں، مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور

خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

ایسے زمانہ میں، ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس گئی گزری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا سب کچھ انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا۔ تعلیم کا نام تک نہیں، حتیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ عالم کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اس زمانہ میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان اسفار کے دوران میں اس نے کچھ آثار علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ ان کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو ایک ان پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا، اور ایک زمانہ کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر کسی درجہ میں اس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی ہو تو جو معلومات اس وقت دنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں، مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جو تصورات اور اصول اس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اس وقت کہیں پائے ہی نہ جاتے تھے، ان کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

صرف عرب ہی کا نہیں دنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھیے

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا، جن میں بچپن گزارا، جن کے ساتھ پل کر جوان

ہوا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اس کے معاملات رہے، ابتدا ہی سے عادات میں، اخلاق میں وہ ان سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دشمن نے بھی کبھی اس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اس نے فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی زبان میں تلخی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقہ سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو امین کہتی ہے۔ دشمن تک اس کے پاس اپنے قیمتی مال رکھواتے ہیں اور وہ ان کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیادار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا، شراب اور جوئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں ستھرائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے، مسافروں کی میزبانی کرتا ہے، کسی کو اس سے دکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیت ہوتی ہے، اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی، کسی مخلوق کے آگے اس کا سر نہیں جھکتا، بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا، اس کا

دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک، صاف، شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کو ہر طرف سے محیط نظر آ رہی تھی۔ وہ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اس کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں کوئی چیز بھی اس کو اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دُور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے۔ سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، کوئی ایسی روشنی ڈھونڈتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دُور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

یکایک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بُت جن کے آگے تم جھکتے ہو، یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر، کوئی روح، کوئی ستارہ اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی بندگی و عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا اور ان سب کا پیدا کرنے والا۔ وہی مارنے اور جِلانے والا ہے۔ اسی کی بندگی کرو۔ اسی کا حکم مانو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم و ستم، یہ بدکاریاں

جو تم کرتے ہو، سب گناہ ہیں۔ انہیں چھوڑ دو، خدا انہیں پسند نہیں کرتا، سچ بولو، انصاف کرو، نہ کسی کی جان لو، نہ کسی کا مال چھینو۔ جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلت کا داغ لے کر پیدا ہوا اور نہ کوئی عزت کا تمغہ لے کر دنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں، صرف خدا پرستی اور نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے وہی اعلیٰ درجہ کا انسان ہے، اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ تم میں سے ہر ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہے، اس خدا کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اس سے چھپا نہیں سکتے۔ تمہاری زندگی کا کارنامہ اس کے سامنے بے کم و کاست پیش ہو گا اور اسی کارنامے کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کریگا۔ اس عادلِ حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہو گی۔ جس کے پاس یہ سامان ہو گا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہو گا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا وہ پیغام جسے لے کر وہ غار سے نکلا۔

جاہل قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ پتھر مارتی ہے۔ ایک دن دو دن نہیں اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے۔ اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف اُبھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ٹلتا۔

یہ قوم اس کی دشمن کیوں ہوئی؟ کیا زر اور زمین کا جھگڑا تھا؟ کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟ کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟ نہیں، ساری دشمنی صرف

اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی اور پرہیزگاری اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے، بت پرستی اور شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے، پجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے، سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے، انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے، قبائلی اور نسلی تعصبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے، زمانۂ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آرہا ہے اسے کیوں توڑنا چاہتا ہے۔ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے، یہ سب خاندانی روایات اور قومی طریقہ کے خلاف ہیں تو ان کو چھوڑ دے ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اس کو بادشاہی دینے پر آمادہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی، بشرطیکہ وہ اس تعلیم سے باز آجاتے۔ مگر اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلہ میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابلِ التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا اور کامل ۲۱ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کر سکتا ہو؟ غور کرو! کیا نیک نفسی، ایثار اور ہمدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوشش کرتا ہے، وہی اس کو پتھر ماریں، گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کر دیں، غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکے لڑانے والا انسان محض گمان اور قیاس سے کوئی بات

بھر کر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں، زمین اس پر تنگ کر دی جاتے، تمام ملک اس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر امنڈ امنڈ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے یک سرِ مُو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت، یہ عزم، یہ ثبات، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین اور کامل یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک اور شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۲۱ سال تک مصائب کے ان پے در پے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھیر سکتا۔

یہ تو اس شخص کے انقلاب حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک خطیب، ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا۔ کسی نے اس کو حکمت اور دانائی کی باتیں کرتے نہ سنا۔ کسی نے اس کو الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے خدا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور امم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، شائستہ اطوار اور بہترین سیرت تو ضرور رکھتا تھا، مگر چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص اب کچھ بننے والا ہے۔ اس وقت تک جاننے والے اس کو محض ایک خاموش، امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سنا رہا تھا جس کو سن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کلام کی شدتِ تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹر دشمن بھی اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اتر نہ جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم

تھا کہ تمام قوم عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی تھے، اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورت اس کے مانند بنا لاؤ، مگر کوئی اس کے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مصلح اخلاق و تمدن، ایک حیرت انگیز ماہر سیاست، ایک زبردست مقنن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اس نے، اس ان پڑھ صحرا نشین نے حکمت اور دانائی کی باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکا۔ وہ امی الٰہیات کے عظیم الشان مسائل پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا۔ تاریخ اقوام سے عروج و زوال امم کے فلسفہ پر لکچر دینے لگا۔ پرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہب عالم پر تنقید اور اختلافات اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔

اس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دیئے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلاء غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں ان کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پُرامن سوداگر، جس نے کبھی تمام عمر تلوار نہ چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی، حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسا بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جرنل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملک عرب کو فتح کر لیا۔ ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سروسامان عربوں نے چند سال میں دنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی، یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مدبر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑتے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظام حکومت کا تابع بنا دیا۔ اس نے ان کے خیالات بدل دیئے، ان کے اخلاق بدل دیئے۔ ان کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بدکرداری کو اور بد اخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، ان کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجہ کی پابندیٔ قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا۔ اس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، اس نے ایسا مردم خیز بنایا کہ اس میں ہزار در ہزار اعاظم رجال اٹھ کھڑے ہوئے، اور دنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگِ عالم میں پھیل گئے۔

اور یہ کام اس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور روحوں کو مسخر کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم اور شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل اور انصاف سے حکومت کی۔ حق اور صداقت سے کبھی یک سرِ مُو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا۔ جو اس کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے اس کو پتھر مارے تھے، اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا تھا، حتیٰ کہ جنہوں نے جوشِ عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبطِ نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھونس کے

چھپر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گزرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اسے تامل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ ترفع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذراسی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اسی جیسا ایک انسان ہے۔ تمام عمر کی جدوجہد میں اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر دیا۔ اپنے پیروؤں پر اس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اس کے پیرو اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں۔

ابھی اس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرست ختم نہیں ہوئی۔ اس کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخ عالم پر حیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ اَن پڑھ بادیہ نشین، جو چودہ سو برس پہلے اس تاریک دور میں پیدا ہوا تھا، دراصل دورِ جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے۔ وہ نہ صرف ان کا لیڈر ہے جو اسے لیڈر مانتے ہیں، بلکہ ان کا بھی لیڈر ہے جو اسے نہیں مانتے۔ ان کو اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اس کی رہنمائی کس طرح ان کے خیالات میں، ان کے اصولِ حیات اور قوانینِ عمل میں اور ان کے عصرِ جدید کی روح میں پیوست ہو گئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصورات کا رُخ وہمیت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر عقلیت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیاداری کی طرف

پھیر دیا۔ اسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اسی نے خرقِ عادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اسی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقل اور تفکر اور مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔ اسی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیاد مل کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی واحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی، ان کو اسی نے تمدن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی و رہنما تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، ان کو اسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوند عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا خدا بناتے تھے ان کو اسی نے سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور جمہوریت اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے ہیں۔

تصورات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اس امی کی لیڈرشپ کے عملی نتائج دنیا

کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب، شائستگی اور طہارت و نظافت کے کتنے ہی اصول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے دنیا نے کس قدر ان کی خوشہ چینی کی اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے ان سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوئے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے تھے، ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصول اس نے وضع کیے تھے انہوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب تک ان کی تاثیر خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا امی ہے۔ ورنہ پہلے دنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر {Heroes} میں شمار کرتی ہے، جب اس کے مقابلہ میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے ہیں۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ

میں ہر طرف یک رخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے۔ اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبر بھی ہے، فوجی لیڈر بھی ہے، واضع قانون بھی ہے، معلم اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے، اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب (Civilization) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمہاری نظر میں ہے؟

دنیا کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا، اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا، اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا ———— یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا، ظلم، بیرحمی، خوں ریزی اور مکر و دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفۂ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا، یا ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی

توجیہ کیونکر کرے گا کہ اس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہُوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا، انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیت کے اوہام وتعصبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پُوری انسانیت پر پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالمِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی وروحانی اور تمدنی وسیاسی نظام کی بنا ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات اور سیاستِ مُدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالمِ خیال میں نہیں بلکہ عالمِ واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت ومادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت ودانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اس وقت تھا کیا ایسے شخص کو تم عربِ جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا، بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاریوں (Millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پُرانا کر دیا ہے، جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (March) کرتا ہے اور ہر دَور میں ویسا ہی جدید (Modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دَور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" (Makers of History) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے (Creatures of History) ہیں۔ دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے، دنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں، ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو تم دیکھو گے کہ

ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، اور وہ اسباب خود ہی اس انقلاب کا رُخ اور راستہ بھی معین کر رہے تھے جس کے برپا ہونے کے وہ متقضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معین ہو لیے مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا، جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا وہاں اس نے خود مواد تیار کیا، جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں خود اس نے اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے، اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اتار دیا اور ان کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا، اس کی طاقت اور قوتِ ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا، خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معین کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستے پر چلایا جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

آئیے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے ان پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم، اتنی روشنی، اتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اس کو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا ڈالا، جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامل نہ کیا، جس نے بدھ کو خود بخود معبود بنا لیا، جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی

اور ہوا تک کو پرچ ڈالا، وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو، وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا کہتا ہے میں ایک انسان ہوں، تمہیں جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوعِ انسانی عاجز ہے میرا کلام نہیں ہے، میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے، لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھاتے، یہ قوانین جو میں نے وضع کیے، یہ اصول جو میں نے تمہیں سکھاتے، ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ ادھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے۔ کیسی امانت اور راستبازی ہے۔ جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تامل نہیں کرتا جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ لیکن یہ شخص ان کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اس کو جھٹلا نہ سکتا تھا، کیونکہ کسی کے پاس ان کے اصلی ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس شخص سے زیادہ سچا اور کون ہو گا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں، اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟

(ترجمان القرآن، شوال ۱۳۵۵ھ۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

اِتّباعِ و اطاعتِ رسُول

(یہ مضمون مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی کتاب "تعلیماتِ قرآن" پر تنقید کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا)

صاحبِ تعلیماتِ قرآن نے رسالت اور اس کے احکام کی تشریح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میرے نزدیک رسالت کے اس تصور سے موافقت نہیں رکھتے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۹ پر فاضل مؤلف نے لکھا ہے:

"اصولی قانون صرف اللہ کی کتاب ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ	جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ	اُوپر اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو
دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ (اعراف:۳)	اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

جملہ ضوابط اسی کی روشنی میں باہمی مشورہ سے بنائے جائیں گے:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔	اور ان کی حکومت آپس کے مشورے
(شوریٰ: ۳۸)	سے ہے"

یہاں مؤلف نے بیچ میں سے اسوۂ رسول کو صاف اڑا دیا ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ قرآن کریم سے اصول لے کر مسلمان باہمی مشورہ سے تفصیلی قوانین وضع کر لیا کریں۔ لیکن ان دونوں کڑیوں کے درمیان سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی تھی جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اس زنجیر میں پیوست کیا تھا۔ وہ کڑی یہ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	اے محمد! کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران ۳۱)	تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کریگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے، مگر یہ قانون ہمارے

پاس بلاواسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسولِ خدا کے واسطہ سے بھیجا گیا ہے۔ اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں، اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لیے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیے۔ پس قرآن کی رُو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا قانون، پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول
وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ	کی اور ان اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں پھر
فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو
(النساء: ۵۹)	تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا فقرہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ مسائلِ شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا و رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر مرجع صرف قرآن مجید ہوتا تو صرف فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ کہنا کافی تھا لیکن اس کے ساتھ وَالرَّسُوْلِ بھی کہا گیا ہے جس میں صاف اشارہ ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ تمہارے لیے مرجع ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے صفحہ ۲۸ پر لکھا ہے:۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ	رسولوں کے اوپر کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ
(المائدہ: ۹۹)	وہ پیغام پہنچا دیں۔
وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ	ہمارے اوپر سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ
(یٰسٓ: ۱۷)	نہیں ہے۔

آگے چل کر صفحہ ۱۵۵ پر لکھتے ہیں:۔

اور بحیثیت منصبِ رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغامِ الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس۔

إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (الشوریٰ:۴۸) — تیرے اوپر صرف تبلیغ ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔ (التغابن:۱۲) — اگر تم نے منہ پھیر لیا تو ہمارے رسول پر صرف کھلی ہوئی تبلیغ ہے اور بس۔

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (الرعد:۴۰) — تجھ پہ پہنچانا ہے اور ہمارے اوپر حساب لینا ہے۔"

یہاں مؤلف نے آیات کے سیاق وسباق اور فحوائے کلام کو نظر انداز کر کے رسول کی حیثیت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا وہ محض ایک نامہ بر یا نعوذ باللہ ڈاک کا ہرکارہ ہے۔ لیکن اگر وہ ان جملوں کو ان عبارات کے سیاق وسباق سے ملا کر پڑھتے جن میں یہ وارد ہوئے ہیں تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ دراصل یہ جو کچھ کہا گیا ہے یہ نبی پر ایمان لانے والوں سے نہیں بلکہ ان کا انکار کرنے والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لوگ رسول کی تعلیم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اور بار بار رسول کو جھٹلاتے تھے، ان سے کہا گیا ہے کہ رسول کا کام تم تک ہمارا پیغام پہنچا دینا ہے سو اس نے پہنچا دیا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا، مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ (المائدہ:۱۹) اب خدا پر تمہاری کوئی حجت نہیں رہی، لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء:۱۶۵) اب تم نہ مانو گے تو اپنا کچھ بگاڑو گے، فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ۔ (المائدہ:۱۲) اسی سلسلہ میں رسول اللہ سے بھی فرمایا گیا ہے کہ تم ان کافروں کی روگردانی سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو؟ تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے ہو۔ تمہارے سپرد جو خدمت کی گئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کے سامنے سیدھا راستہ پیش کر دو، سو وہ تم نے پیش کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ اس راستے پر آتے ہیں یا نہیں تو اس بارے میں کوئی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تمہارا یہ کام نہیں کہ ان کو کھینچ کر اس راستہ کی طرف لاؤ۔ اگر وہ تمہاری تعلیم و تبلیغ سے منہ موڑ کر ٹیڑھے راستوں پر چلتے ہیں تو ان کے اس فعل کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا۔

اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ (الشوریٰ ۴۸) فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ (الغاشیہ: ۲۱، ۲۲)

یہ سب کچھ کفار کے مقابلہ میں ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کرلیں اور امّتِ مسلمہ میں داخل ہوجائیں، تو ان کے لیے رسول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ رسول ان کے لیے معلّم اور مربّی بھی ہے، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہے اور ایسا امیر بھی ہے جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چون و چرا کی جانی چاہیے۔ معلّم کی حیثیت سے رسول کا کام یہ ہے کہ پیغامِ الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کرے (وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ) (بقرہ: ۱۲۹) مربّی ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرے اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالے (وَیُزَکِّیْھِمْ) نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھائے، تاکہ اس کی زندگی اس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، اور اس کے ہر قول اور ہر فعل کو دیکھ کر معلوم ہوجائے کہ زبان کو اس طرح استعمال کرنا، اور اپنی قوتوں سے یوں کام لینا، اور دنیا کی زندگی میں ایسا برتاؤ رکھنا کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ منشاءِ کتاب کے خلاف ہے (لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ) (احزاب: ۲۱) اور (وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی) (نجم: ۳، ۴)۔ اس کے ساتھ ہی رسول کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی بھی ہے۔ ایسا امیر نہیں جس سے نزاع کی جائے، بلکہ ایسا امیر جس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ) (نساء: ۵۹) اور (مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ) (نساء: ۸۰) ایسا امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے، بلکہ ایسا امیر جو قیامت تک کے لیے امّتِ مسلمہ کا امیر ہے جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر حال میں مرجع ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی جتنی آیات اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں ہے نہ

منسوخ ہے۔

مؤلف نے منصبِ رسالت کے ان مراتب کو سمجھنے میں تین بہت بڑی غلطیاں کی ہیں:

(۱) پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے بعض آیات کا غلط مفہوم لے کر رسول کا کام صرف تبلیغ (یعنی نامہ بری) میں محدود کر دیا۔ حالانکہ رسول کی مبلغانہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جبتک کہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوں، اور صرف ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے رسول کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کرکے امتِ مسلمہ میں داخل ہو جائیں، تو ان کے لیے رسول کی حیثیت محض مبلغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا لیڈر ہے، فرماں روا ہے، مقنّن ہے، معلّم ہے، مربّی اور واجب التقلید نمونہ ہے۔

(۲) مؤلف کی دوسری غلطی اسی پہلی غلطی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جب انہوں نے رسول کو مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے لیے محض مبلّغ قرار دے لیا تو ان کو یہ زحمت پیش آئی کہ قرآن میں جو رسول کو مسلمانوں کے لیے معلّم اور مربّی اور نمونہ قرار دیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم معیّن کیا جائے۔ آخر کار انہوں نے رسول کی ان سب حیثیات کو تبلیغ ہی کے ضمن میں شامل کر دیا، اور اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ مبلغانہ حیثیت کے ماسوا آں حضرت کی زندگی کے اور جتنے پہلو ہیں وہ سب آپ کی شخصی (پرائیویٹ) حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "آیت وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم ۳، ۴) کا یہ مفہوم قرار دینا کہ رسول اللہ جو کچھ کلام کرتے تھے وہ سب کا سب وحی تھا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دعویٰ قرآن کے وحی ہونے کا تھا جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ جو کچھ وہ بولتے ہیں وحی ہے۔ گھر یا ازواج مطہرات یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفار کو کوئی بحث تھی۔"

اس تقریر کو جب ہم مؤلف کی ان عبارتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "رسول کا کام صرف پیغامِ الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس" اور "رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے" اور یہ کہ "ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے"، تو اس سے مؤلف کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عبداللہ بحیثیت رسول، اور محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آنحضرت قرآن کی جو تعلیم دیں اور قرآن کے مطابق جو احکام دیں، وہ تو مؤلف کے نزدیک سمع و اطاعت کے مستحق ہیں، مگر بحیثیت انسان آپ کے اقوال و افعال ویسے ہی ہیں جیسے ایک انسان کے ہوتے ہیں۔ ان کا خدا کی طرف سے ہونا اور ضلالت و گمراہی سے پاک ہونا مؤلف کے نزدیک مسلّم نہیں ہے، اور نہ جناب مؤلف ان کے اندر امتِ مسلمہ کے لیے کوئی قابلِ تقلید نمونہ پاتے ہیں۔

لیکن یہ تفریق جو انہوں نے محمد بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرت کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت[1] ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلّم بھی تھے، مربّی اور مزکّی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے، حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے، اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی پاک زندگی ایک انسانِ کامل اور مسلمِ قانت اور مومنِ صادق کی زندگی کا ایسا

---

[1] ایک شخص کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے "آزادی کا اسلامی تصور" کے زیرِ عنوان جو کچھ ہم کہہ آئے ہیں، یہ بات اس کے خلاف ہے مگر یہ شبہ اس کتاب کے صفحہ ۱۰۳ اور ۱۰۷ کو بغور پڑھنے سے خود بخود رفع ہو جائے گا۔

نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اس شخص کے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (احزاب : ۲۱) قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ خدا کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو، اور اس شریعت کی نمائندہ ہو، اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔

اسی بات کی طرف سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى[2] "تمہارا صاحب یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نہ بدراہ ہوا، نہ گمراہ ہوا" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى "اور جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا" اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى "اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے"۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى "اس کو ایسے اُستاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں"۔ جناب مؤلف فرماتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ لیکن مجھے ان آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں هُوَ کی ضمیر نطقِ رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر نطقِ رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر وہ بات جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، آیاتِ مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لیے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بدراہی اور گمراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے اور وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ خواہشِ نفس پر

بنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو رسول کی رسالت پر سے اعتماد اُٹھ جاتے کفار اسی چیز کے منکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نعوذ باللہ رسول کو جنون ہے، یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے، یا وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر کہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بدراہ ہے نہ گمراہ ہے اور نہ خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ معلم سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے۔ یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی کہ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا الْحَقُّ "اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے۔"

افسوس ہے کہ صاحب "تعلیمات قرآن" کو اس حقیقت سے انکار ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت اپنے گھر میں ازواج مطہرات سے یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفار کو کوئی بحث تھی" میں کہتا ہوں کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔ سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا۔ اللہ نے جو فطرت سلیمہ آپ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپ کو بتائے تھے، آپ کے تمام اقوال و افعال اسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے۔ ان کے اندر تمام عالم انسانی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تھا، اور ہم انہیں سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز، کونسی چیز حرام ہے اور کونسی حلال، کونسی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کونسی اس کے خلاف ہیں، کن امور میں ہم کو رائے اور اجتہاد کی آزادی حاصل ہے اور کن امور میں نہیں ہے، کس طرح ہم اطاعت امر کریں، کس طرح شوریٰ سے معاملات طے کریں اور کیا معنی ہیں ہمارے دین میں جمہوریت کے۔

(۳) مؤلف کی تیسری بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو حیثیتِ رسالت سے الگ کر دیا ہے جس کا ثبوت قرآن میں نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اطاعت بحیثیتِ رسول اور اطاعت بحیثیت امیر میں دو باتوں کا فرق ہے۔

(۱) بحیثیتِ رسالت رسول اللہ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کیا گیا تھا۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (المائدہ:۶۷) اور امیر کی حیثیت سے لوگوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:۱۵۹)

(۲) بحیثیتِ رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے۔ لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالشافہ تھی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (انفال:۲۰) اور امارت کے فرائض ہمیشہ ہنگامی ہوں گے کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج جو امیر ہوگا وہ غزوۂ بدر و احد کی متابعت میں صرف نیزہ و شمشیر سے جہاد میں کام نہ لے گا بلکہ موجودہ زمانے کے اسلحہ استعمال کرے گا۔ امراء کے مقابلہ میں منازعت کا حق حاصل ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء:۵۹)"

یہ سب کچھ قرآن کے منشا کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مؤلف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بناتے ہوئے امیر نہیں تھے، نہ خود بن گئے تھے، بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپ رسولِ خدا ہونے کی حیثیت سے ہی امیر تھے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ مؤلف نے اسی حقیقت کو نہیں سمجھا اس لیے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو عام

امراء کی سی حیثیت امارت سمجھ لیا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں مؤلف نے قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے ان کو بھی وہ ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (Democracy) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں، وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۴) اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیں، فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۹) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ مؤلف نے وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعتِ رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود ہی کچھ اور ہے۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (انفال: ۱) اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوتِ جہاد پر دل میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

الْعِقَابِ﴾۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے" (نساء: ۱۱۵) اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ[1] (انفال: ۲۰) اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے۔ امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا، اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول اللہ سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے۔ اس کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کہنے کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ اس اَنْتُمْ اور تَسْمَعُوْنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے، بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و احد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے، تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص

---

[1] اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اور رسول کے حکم سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

نہ تھے، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ۔ بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کو کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرورِ عالم قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے امراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے۔ تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (حجرات) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء: ۱۷) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ امارت اور عام امراء کی حیثیتِ امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے، حتیٰ کہ ان تمام احکام کو جو اطاعتِ رسول سے متعلق ہیں، اطاعتِ امیر کے احکام قرار دے دیا ہے۔ صفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ مثلاً يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال:۱) | مال غنیمت کا حکم عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے۔

پھر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (نساء: ۵۹) کے متعلق صفحہ ۱۵۰ پر حاشیہ لکھتے ہیں :-

"آخری اختیار اللہ ورسول یعنی امارت ہے اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے، اطاعتِ رسول سے مراد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے اور اطاعتِ اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور ارباب حل وعقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے تابع ہے، اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ "اموالِ غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے۔

حدیث کے متعلق مؤلف کا مسلک حدیث کے متعلق مؤلف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرینِ حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :-

"تعلیمِ کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو جائے "۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (احزاب: ۲۱) تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے ۔

چنانچہ ہمارے رسولؐ نے جملہ احکامِ قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل کر کے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے ۔ یہ اسوۂ حسنہ امت کے پاس عملِ متواتر کی شکل میں موجود ہے ، جس کے مطابق رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ وہ عمل کرتی چلی آتی ہے ۔ اس لیے یہ یقینی اور دینی ہے ۔ اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے "۔

دوسری جگہ مؤلف نے لکھا ہے :

"غیر یقینی شے کا دین میں کچھ دخل نہیں "۔

اِن عبارات اور مؤلف کی ان تصریحات سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں ان کا مسلک واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ :

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدالتی فیصلے اور وہ قوانین جو آپ نے سیاسی، جنگی ، اور تمدنی و اجتماعی امور میں امیرِ قوم کی حیثیت سے نافذ کیے تھے ، اس اسوۂ رسول کی تعریف سے خارج ہیں جس کی پیروی کا حکم عام قرآن میں دیا گیا ہے ، لہٰذا ان کی اب ضرورت نہیں رہی ، کیونکہ امارت کے فرائض ہنگامی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے ۔

(۲) صرف ان امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل (نہ کہ قول) قابلِ تقلید ہے جو عبادات اور دینی اعمال سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرآنی احکام پر عمل درآمد کرنے کی صورت خود اپنے عمل سے بتا دی ہے۔

(۳) مؤلف کے نزدیک صرف وہ عملِ متواتر یقینی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد سے اب تک جاری ہے، اور جس کی پیروی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو دیکھ کر کرتی رہی ہے۔ رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلعم کے اقوال و اعمال کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں، تو وہ یقینی نہیں ہیں اور دین میں ان کا کچھ دخل نہیں۔

ان میں سے پہلی دونوں باتوں کے متعلق میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن کے بالکل خلاف ہیں۔ قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے محض مذہبی اعمال ہی دائماً قابلِ تقلید ہیں، رہے تمدنی و اجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین، تو وہ صرف اس عہد کے لیے مخصوص تھے جس عہد میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں ہو جس سے ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جا سکتا ہو اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جا سکتے ہوں تو اس کو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ	کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر میں
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ	فیصلہ کر دے، تو ان کو اپنے معاملہ میں خود
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ	کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور
ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (احزاب: ۳۶)	جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی
	کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گا۔

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن اور مومنہ سے خاص عہدِ رسالت کے مومن مرد و عورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔ اَمْرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے، خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ اللہ اور رسول سے مراد اللہ

اور رسول ہی ہیں "امارت" ہرگز نہیں ہے، کیونکہ امیر یا اولی الامر بہرحال مومن ہی ہونگے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کر لیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انہیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ "جو اس کے خلاف عمل کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا" یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی ہدایت سے اس کے رسول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے، اس کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام جاری کر دیئے گئے ہیں اور جو قوانین نافذ کر دیئے گئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جاتے۔ اگر خدا اور اس کے رسول کی قولی اور عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی تم راہِ راست سے بھٹک کر بہت دُور نکل جاؤ گے۔ تعجب ہے کہ جس قرآن میں ایسی صاف اور صریح ہدایت موجود ہے اس کی تعلیمات لکھنے والے نے وہ مسلک اختیار کیا ہے جو آپ ابھی سُن آئے ہیں۔

رہی تیسری بات، تو اس کے متعلق مَیں نے اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون "حدیث اور قرآن" میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ مَیں جناب مؤلف سے صرف یہ سوال کروں گا کہ اگر کوئی شخص ان تمام بدعات و خرافات کو جو آج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں رائج ہو گئی ہیں، وہ "یقینی عملِ متواتر" قرار دے جو رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے، اور اس بنا پر انہیں داخلِ دین سمجھے، تو آپ کے پاس کونسا ایسا یقینی ذریعہ ہے جس سے آپ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ عمل رسول اللہ کا نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں گے اور اس کی آیات سے ان بدعات کی تردید کریں گے۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول و عمل سے آیاتِ قرآنی کے معانی کی جو تعیین ہوتی ہے اس کو نظر انداز کرنے کے

بعد آیات کی تاویل میں ایک بدعت پسند انسان اتنی گنجائش نکال سکتا ہے کہ اس کی بہت سی بدعتوں کی تردید مشکل ہو جائے گی۔ دوسرے اگر آپ نے قرآن سے اس کی بدعات کی تردید کر بھی دی تو یہ اس کے اس دعویٰ کی تردید نہ ہوگی کہ یہ وہی یقینی عمل متواتر ہے جو رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا ہے۔ آپ اپنے مسلک کے مطابق اس عمل کو غیر یقینی کہہ نہیں سکتے اور آپ تاریخ سے بھی (جو روایات کی طرح غیر یقینی ہی ہونی چاہیے) یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ یہ بدعات عہدِ رسالت میں نہ تھیں، بلکہ فلاں عہد میں جاری ہوئیں۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ ان کو یقینی مان لیں، پھر یا تو ان کی پیروی کریں یا یہ فیصلہ کر دیں کہ عملِ رسول تعلیمِ قرآن کے خلاف تھا۔ معلوم نہیں کہ فاضل مؤلف اور ان کے ہم خیال حضرات کے پاس اس پیچیدگی کا کیا حل ہے؟

(ترجمان القرآن۔ رجب ۱۳۵۴ھ۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

رسول کی حیثیتِ شخصی و حیثیتِ نبوی

اس کتاب کے دو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعتِ رسول" کا عربی ترجمہ دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ اس پر شام کے اہلِ علم حضرات نے مصنف کو توجہ دلائی کہ ان دونوں مضامین میں کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے نیز دمشق کے ایک صاحب نے مقدم الذکر مضمون پر حسبِ ذیل اعتراض بھی کیا۔

"کیا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام باعتبارِ انسان ہمارے اندر ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور باعتبارِ انسان ان کے اندر بھی ایسی ذاتی خواہشات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ لوگوں پر اپنی ذاتی عظمت کا سکہ جمائیں اور اپنے شخصی اقتدار کے پنجے میں جکڑیں؟ اگر یہ صورت ہے تو آپ کا بحیثیت نبی معصوم ہونا اور بحیثیت انسان محفوظ ہونا چہ معنی دارد؟ آپ کی اس زندگی کی تفصیلات کیا فائدہ رکھتی ہیں جب کہ آپ محض انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ نبوت پر سرفراز نہیں فرمایا تھا؟ اور کیا رسول ہونے کے بعد آپ کی یہ حیثیتیں حیثیتِ بشری اور حیثیتِ نبوی یکجا ہو گئی ہیں یا الگ الگ ہیں؟ اور کیا ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ محمد الرسول کی اطاعت کی جائے اور محمد الانسان کی مخالفت میں ہم آزاد ہوں؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی قاعدہ کلیہ بھی موجود ہے جس کی روشنی میں ہم آپ کے انسانی کلام — جس سے اختلاف کا ہمیں حق ہے — اور نبوی کلام — جو واجب الاطاعت ہے — کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ سکیں؟

کیا نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے؟ کیا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اندر یہ روح پھونکتے تھے کہ بحیثیتِ انسان آپ کی اطاعت واجب نہیں ہے، بلکہ اپنی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے؟ نیز کیا یہ درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حجت اور دلیل کی بنا پر آپ سے بحیثیتِ انسان اختلاف کیا تھا...؟"
ذیل کا مضمون انہی اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

* المسلمون جلد ششم، شمارہ ۶، ۷ اور ۸ میں میرے جو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعتِ رسول" کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں، ان کے متعلق مجھے توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں تناقض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے مضمون میں تو کہا گیا ہے کہ نبی کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی الگ الگ ہیں اور اسلام کی دعوت صرف حیثیتِ نبوی کی اطاعت کی طرف ہے نہ کہ حیثیتِ شخصی کی اطاعت کی طرف۔ لیکن دوسرے مضمون میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ نبی کی یہ دو حیثیتیں الگ الگ ہیں اور پورے اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نبی کی ایک ہی حیثیت تھی اور وہ تھی صرف نبی ہونے کی حیثیت۔ ان دونوں باتوں میں توفیق و تطبیق کی کیا صورت ہے؟ علاوہ بریں میرے پہلے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" پر دمشق سے ایک صاحب نے کچھ سوالات کیے ہیں، جو المسلمون کے شمارہ ۷ میں درج ہوئے ہیں۔

یہ دونوں اعتراضات چونکہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایک ہی مختصر مضمون میں ان کا جواب دے رہا ہوں۔

"دراصل اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، اس اعتبار سے کہ حقیقت نفس الامری کیا ہے؟ دوسرے عملی، اس لحاظ سے کہ جہاں تک نبی کی ذات سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے، آیا وہ ہمارے لیے پورا کا پورا انبی اور صرف نبی ہے یا ہم اس کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے صرف اس کی حیثیتِ نبوی کا اتباع اور اسی کی اطاعت کریں گے اور حیثیتِ شخصی کو چھوڑ دیں گے؟

اب پہلے نظری پہلو کو لیجیے۔ قرآن مجید اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ انبیاء

علیہم السلام کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی میں فرق ہے۔ وہ انسانوں کو اپنا بندہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ "کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو" (آل عمران آیت ۷۹)۔ ان کے سپرد دو فریضے ایک ساتھ کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو ہر غیر اللہ کی بندگی سے نکالیں جس میں دوسری سب مخلوقات کے ساتھ ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کو صرف ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل: ۳۶)

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے الگ رہو۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران: ۶۴)

اے نبی کہو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

دین میں ان کی بے چون و چرا اطاعت کا جو حکم دیا گیا، وہ ان کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ رسول ہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر فرماتا اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت قرار دی گئی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء: ۶۴) "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ اور مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰) "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قرآن اور بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ جو باتیں نبی صلی اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کی یا کہی ہے اس میں بے چون و چرا اطاعت کا وہ مطالبہ آپ نے کبھی نہیں کیا جو امر الٰہی کے تحت کوئی کام کرنے یا کوئی بات کہنے کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں میں نے اپنے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔ خصوصاً حضرت زید کا حضورؐ کے منع فرمانے کے باوجود سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اور اللہ اور اس کے رسول کا ان پر کوئی نکیر نہ کرنا تو اس کی صریح مثال ہے، جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی جو میں نے اپنے اس مضمون میں کی ہے۔ اور تابیر نخل والے معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے کو بالفاظ صریح فرما چکے ہیں۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ — إِنَّمَا ظَنَنْتُ ظَنًّا فَلَا تُؤَاخِذُونِي بِالظَّنِّ وَلَكِنْ إِذَا حَدَّثْتُكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا فَخُذُوا بِهِ فَإِنِّي لَمْ أَكْذِبْ عَلَى اللَّهِ — أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكره صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الرأي)

میں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں — میں نے اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری ان باتوں کو نہ لو، جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو، اس لیے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا — تمہیں اپنے دنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے۔

یہ تو ہے نظری اور اصولی فرق۔ اب اس کے عملی پہلو کو لیجیے۔

دراصل یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ اپنا واحد نمائندہ بنا کر انسانوں کے درمیان اس دوہری خدمت پر مامور فرماتے کہ ایک طرف

تو وہ بشر اپنے ابنائے نوع کو اپنی شخصیت سمیت تمام مخلوقات کی بندگی سے آزاد کرے اور خود اس آزادی کی انہیں تربیت دے، اور دوسری طرف وہی بشر ان سے اللہ کی مکمل بے چون وچرا اطاعت کراتے اور اس اطاعت کا مرجع بھی تمام عملی اغراض کے لیے اس بشر کی اپنی ہی ذات من حیث الرسول ہو۔ یہ دو متضاد کام ایک ہی شخصیت کو بیک وقت کرنے تھے اور ان کے حدود ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گتھے ہوئے تھے کہ خود اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی دوسرا ان کے درمیان خطِ امتیاز نہ کھینچ سکتا تھا۔

اس معاملہ کی نزاکت اور پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم تین باتوں پر غور کرتے ہیں۔

اوّل یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جس وقت احکامِ الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کراتے تھے اس وقت تو ظاہر ہی ہے کہ آپ ایک وظیفۂ رسالت انجام دیتے تھے مگر جس وقت آپ اپنے انتہائی اطاعت گزار متبعین کو خود اپنی ذات کی ذہنی غلامی سے آزاد کر کے حریتِ فکر و رائے کی تربیت دیتے تھے، جب آپ ان کو اپنی شخصی آراء کے مقابلے میں اختلاف کی ہمت دلا کر تمام انسانوں کے سامنے استقلالِ فکر سکھاتے تھے، اور جب آپ اپنی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں خود ایک خطِ امتیاز کھینچ کر بتاتے تھے کہ یہاں تم آزاد ہو اور یہاں تمہارے لیے سمع وطاعت کے سوا چارہ نہیں ہے، اس وقت بھی دراصل آپ وظیفۂ رسالت ہی کا ایک حصہ ادا فرماتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے لیے آپ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی کے فرق کو سمجھنا اور عملاً ان دونوں حیثیتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی جلی نظر آتی ہیں کہ ان کے درمیان صرف نظری فرق رہ جاتا ہے، عملاً اپنی شخصی حیثیت میں بھی کام کرتے وقت آپ نبوت ہی کا ایک کام کرتے پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً، جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا

پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفع حاجت وغیرہ، وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں، بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے اور آدمی کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کہاں حیثیت رسالت ختم ہوتی ہے اور حیثیتِ شخصی شروع ہو جاتی ہے۔

ثالثاً، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کی ذات بحیثیت مجموعی ایک اُسوہ ہے جس کا ہر پہلو اور ہر رُخ ہمیں ہدایت کی روشنی دیتا ہے اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی ہوائے نفس یا ضلالت وغوایت سے ذرہ برابر بھی آلودہ نہیں ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین اُسوہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا۔ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

اے نبی ہم نے تمہیں (لوگوں کے لیے) گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنایا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ (النجم: ۲، ۳، ۴)

تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بہکا ہوا اور نہ گمراہ ہوا۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے، ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

ان وجوہ سے نہ تو عملاً ہمارے لیے یہ ممکن ہے اور نہ شرعاً ہم اس کے مجاز ہیں کہ بطور خود نبی کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق کریں اور آپ ہی آپ اس کے حدود متعین کرلیں، اور خود ہی یہ بھی طے کرلیں کہ فلاں امور آپ کی حیثیتِ نبوی کے تحت تھے جن میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور فلاں شخصی حیثیت میں تھے، جن میں ہم آپ کی اتباع و اطاعت سے آزاد ہیں۔ اس فرق کے معلوم ہونے کا ذریعہ یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے، یا پھر وہ اصولِ شریعت جو آپ ہی کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہ کرام اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے سے پہلے آپ سے دریافت کر لیتے تھے کہ آپ کا ارشاد یا عمل حکم الٰہی کی بنا پر ہے یا اپنی ذاتی رائے پر، اور جب معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ آپ کی ذاتی رائے سے ہے، تب وہ اپنی بات عرض کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں حضرت حباب بن المنذر نے اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے پوچھ لیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعے سے کیا گیا ہے جس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یا یہ محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ اسی طرح غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ نے بنی غطفان سے صلح کی تجویز پر اظہار رائے کرنے سے پہلے دریافت کر لیا "اے اللہ کے رسول! کیا یہ ارادہ وحی کی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اس میں ہمارے لیے مجالِ کلام نہیں ہے، یا حضور صرف اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں؟"

اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ ظاہر فرما دیتے تھے کہ فلاں بات آپ اللہ کی طرف سے ایک حکم دینی کے طور پر نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اپنی شخصی رائے ظاہر فرما رہے ہیں، جیسا کہ اوپر تابیرِ نخل کے معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

اور بعض اوقات معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی تھی جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضور کا ارشاد اپنی شخصی حیثیت میں ہے۔ مثلاً حضرت زیدؓ سے آپؐ کا فرمانا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (احزاب: ۳۷) "اپنی بیوی کو طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو" اس ارشاد کے متعلق یہ بات ظاہر تھی کہ یہ ایک مومن کو نبی کا حکم شرعی نہیں ہے بلکہ ایک خاندان کے فرد کو بزرگ خاندان کا مشورہ ہے۔ اسی وجہ سے حضرت زیدؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے باوجود حضرت زینبؓ کو طلاق دی اور اللہ اور اس کے رسول کے اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت زیدؓ نے آپؐ کے فرمان کی نوعیت ٹھیک ٹھیک سمجھی تھی۔

یہ تو وہ مثالیں ہیں جو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آئی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد معاملات ایسے ہیں جن میں اب بھی اصولِ شریعت کی روشنی میں اس فرق کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپ کے کھانے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپ ایک خاص وضع اور قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور ان کے انتخاب میں بھی آپ کے اپنے ذوق کا دخل ہوتا تھا۔ دوسرا یہ پہلو تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں آپ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے، اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے آپ اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں، اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں، البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرۂ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملے میں حرام اور حلال، جائز اور ناجائز کے حدود معین کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ فرق خواہ ہم کو حضورؐ کی تصریح سے معلوم ہو یا آپ کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے، بہرحال اس کے علم کا ذریعہ نبی کی تعلیم ہی ہے۔ گویا ہم آپ کی حیثیتِ شخصیہ کے کام کو متعین کرنے کے لیے بھی آپ کی حیثیتِ نبویہ ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ حیثیتِ شخصیہ سے براہِ راست ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آپ کی حیثیتِ نبویہ کو نظر انداز کر کے ہم کر سکتے ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں نے اپنے دوسرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسولؐ" میں منکرینِ سنت کو متنبہ کیا ہے۔ ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ محمد بن عبداللہ باعتبارِ رسول اور محمد بن عبداللہ باعتبارِ انسان میں خود تفریق کر کے ان

دونوں حیثیتوں کے کاموں میں ایک خط امتیاز کھینچ دیتے ہیں اور آپ کی زندگی کے جس دائرے کو وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت سے الگ سمجھ بیٹھے ہیں، اس کے اتباع واطاعت سے خود ہی انہوں نے آزادی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ حضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے وہ عنداللہ وعندالرسول ہے اور ہمیں اس سے صرف اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمد بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مُطاعِ حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امّت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت حتیٰ کہ محمد بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے، تو وہ محمد رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ ہی اس کے حدود متعیّن کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمد رسول اللہ ہی نے دی ہے۔

ان توضیحات کے بعد اگر میرے دونوں مضمونوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۵۶ء)

رسالت اور اُس کے احکام

میرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسُول" کو دیکھ کر میرے دوست چوہدری غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے ایک طویل مراسلہ میں حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :

"... لیکن مجھے آپ کی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی کی تفسیر سے کچھ اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے :

"جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ نبوت پر سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا"

پھر دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں :

"آنحضرت جس وقت جس حال میں جو کچھ کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے"

اس کا مقصد واضح ہے کہ حضورؐ کا ہر قول و فعل من جانب اللہ ہوتا تھا۔ اور بحیثیتِ رسول صادر فرماتے کی بنا پر امّتِ مسلمہ کے لیے واجب الاطاعت۔

اس کے متعلق یہاں صرف دو ایک اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ پہلے تو قرآن کریم کو لیجیے۔ آپ کو متعدد ایسے امور ملیں گے جن میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تہدید و تادیب ہوئی ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھالی تو ارشاد ہوا :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ — اے نبی جس کو اللہ نے تمہارے لیے

اللہ لک (تحریم: ۱) — حلال کیا ہے اسے تم حرام کیوں کرتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینا خدا کی جانب سے تھا تو خدا اس پر معترض کیوں ہوا؟

دوسری جگہ ہے:

عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ (توبہ: ۴۳) — اے نبی خدا نے تم سے درگزر کیا، تم نے انہیں کیوں اجازت دے دی تھی؟

اب اگر حضورؐ کا اجازت دے دینا از روئے وحی تھا اور یہ فعل خدا کے رسول کی حیثیت سے تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے نے تہدید کس لیے فرمائی؟

اسی طرح عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (عبس)، اگر حضورؐ کا پیشانی مبارک پر بل لے آنا بہ حیثیتِ رسول تھا تو قرآن کریم میں اس پر تنبیہ کیوں آئی؟

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ افعال و اقوال بہ حیثیت رسول نہ تھے بلکہ ذاتی حیثیت سے تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ امور ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس کی بنا پر تھے بلکہ یہ کہ امور دنیاوی میں بہ حیثیتِ بشر خاصّہ بشریت حضورؐ کے ساتھ تھا جس میں ایسے معمولی سہو کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور اس سے حضورؐ کے خلقِ عظیم اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے دشمنانِ اسلام کے لیے زندہ شہادت ملتی ہے۔ اب (اس کی) شہادت خود احادیث سے بھی ملتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب اس عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرتؐ سے مروی ہے اور کتب حدیث میں مدون ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ امور جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ امور جن کو تبلیغِ رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی کی نسبت حضورؐ نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّنْکُمْ اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِہٖ وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔	میں ایک انسان ہوں۔ جب تم سے کوئی مذہبی امر بیان کروں تو اس کو اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

اسی بنا پر درخت خرما کے گابھا لگانے کے مشہور واقعہ کے بعد حضورؐ نے فرمایا تھا۔

اِنِّیْ ظَنَنْتُ ظَنًّا وَلَا تُؤَاخِذُوْنِیْ بِالظَّنِّ وَلٰکِنْ اِذَا حَدَّثْتُکُمْ مِّنَ اللّٰہِ بِشَیْءٍ فَخُذُوْا بِہٖ فَاِنِّیْ لَمْ اَکْذِبْ عَلَی اللّٰہِ	میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ کرو لیکن میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو اس کو اختیار کرو اس لیے کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں بولتا۔

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں سے وہ امور ہیں جنھیں حضورؐ عادۃً کیا کرتے تھے یا اتفاقیہ بلا قصد یا بہ سبیل تذکرہ بیان فرماتے۔ اور اس کے بعد وہ ان مواقع و امور کی مثالیں بھی بیان فرماتے ہیں، انہیں میں وہ ان امور کو بھی لیتے ہیں جو حضور کے عہد میں ایک جزئی مصلحت رکھتے تھے لیکن وہ تمام امّت کے لیے حتمی اور لازمی نہ تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ دین کے متعلق فرماتے تھے وہی بحیثیت رسول ہوتا تھا، خواہ وہ وحی منزل ہو یا اجتہادِ رسولؐ، اور وہی امت کے لیے واجب الاتباع ہے۔ اور اس کے علاوہ جو باتیں بحیثیت بشر فرماتے ان میں یہ قید نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امور مشاورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ نے رائے بھی پیش کی اور وہ اختیار بھی کی گئی۔ یہی نہیں حضور کی ایسی رائے کے خلاف عمل بھی تھا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ آپ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ، لیکن انہوں نے حضرت زینب کو طلاق دے دی کیا

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ بحیثیت رسول آپ کا فرمان ہوتا اور حضرت زید اس کی خلاف ورزی کرتے ؟ کتب احادیث میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں حضورؐ نے کوئی ارشاد فرمایا اور صحابہ نے عرض کیا کہ یہ حکم بحیثیت رسول ارشاد فرما رہے ہیں یا بطور اپنی رائے کے ؟ چنانچہ جنگ بدر میں جب آپ ایک مقام پر کیمپ نصب فرمانا چاہتے تھے تو ایک صحابی نے یہی سوال کیا اور جب معلوم ہوا کہ حضورؐ اپنی رائے سے ایسا فرما رہے ہیں تو انہوں نے باادب گذارش کیا کہ اگر حضورؐ ذرا آگے جا کر خیمہ زن ہوں تو زیادہ قرین مصلحت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیت رسول ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جو مرد خدا محبوب کے رنگ میں رنگا جانا چاہے اس کی بات بالکل جدا ہے۔ لیکن اس شکل اور وجوب کی صورت میں بڑا فرق ہے۔ اگرچہ شاہ صاحبؒ نے حضورؐ کے فیصلے بھی اسی ذیل میں رکھے ہیں جو رسالت کی حیثیت لیے ہوئے نہ تھے (غالباً ان کی مراد وقتی فیصلوں سے ہوگی) اور صاحب "تعلیمات" نے بھی امارت کو جو رسالت سے الگ کیا ہے تو غالباً اسی بنا پر۔ لیکن میں تو حضورؐ کے قضایا متعلقہ دین کو عین تبلیغ رسالت میں ہی سمجھتا ہوں اور واجب الاتباع۔ البتہ ایک اور چیز ہے جو امارت اور رسالت کی بحث میں میرے سامنے آگئی ہے اور اگرچہ صاحب "تعلیمات" نے اس پر بوضوح روشنی نہیں ڈالی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منشا شاید یہی ہے جو میرے ذہن میں آیا ہے۔ جہاں تک نبی کریمؐ کا تعلق ہے امور دین میں حضورؐ کی اطاعت کیا بحیثیت رسول اور کیا بحیثیت امیر قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں نہ اس وقت کسی منازعت کا حق تھا نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ

حضورؐ کے بعد قرآن کریم نے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو اسلامی نظام کے بقا کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی سند (Authority) ہو جو یہ بتا سکے کہ خدا اور رسول کا اس بارے میں یہی فیصلہ ہے، یا وقتی امور میں ایسا ہی فیصلہ خود صادر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر خلیفہ برحق ہو اور اس کے ساتھ اس کی مجلس شوریٰ (صحیح طریق پر منتخب شدہ) کام کر رہی ہو تو یہی جماعت یعنی خلیفہ اِن کونسل (Caliph-in-Council) ہی وہ آخری سند (Authority) ہوگی جو امت مسلمہ کے لیے "خدا اور رسول" کی نمائندگی کرے گی۔ یعنی اس مجلس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا اور کسی شخص کو اس کے خلاف منازعت کا حق نہ ہوگا۔ ورنہ اگر ہر شخص کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ خود فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا فریضہ خود ہی سرانجام دے لے تو ظاہر ہے کہ نظام اسلام کسی طرح بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی مجلس اعلیٰ (Supreme Council) ہوگی جس کے قضایا کی پھر کہیں اپیل نہ ہوگی۔ اور یہی جماعت فقہ مرتب کرنے کا کام کرے گی۔ البتہ جب اس جماعت کا کوئی رکن کتاب و سنت کے خلاف فیصلے صادر کرے تو جمہور کو اختیار ہوگا کہ انہیں برطرف کر کے ان کی جگہ دوسرا انتخاب عمل میں لے آئیں۔ کیونکہ یہاں ایسے اولی الامر سے منازعت کا حق حاصل ہو جائے گا جو امت کو خدا اور رسول کی اطاعت کی طرف نہیں لے جاتے۔ لیکن انفرادی طور پر کسی کو حق نہ ہوگا کہ ان کے فیصلوں سے اس بنا پر سرتابی شروع کر دے کہ وہ اس کے اپنے خیال میں کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ یہی وہ بااختیار جماعت ہوگی جو وقتی امور میں بنا بر مصلحت کسی سابقہ وقتی فیصلہ یا انتظام کے خلاف بھی فیصلہ کر سکے گی جیسا کہ کتب سیر و احادیث سے ظاہر ہے۔ رسول اللہ نے نجران کے عیسائیوں اور خیبر کے یہود کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بنا بر مصلحت وقت ان کو وہاں سے نکال دیا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات خود خلیفۂ

وقت رشتاً حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ بھی عدالتوں میں بحیثیت مدعا علیہ پیش ہوا کرتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کے خلاف بھی ہر شخص کو منازعت کا حق حاصل ہے، تو واضح رہے کہ یہ لوگ خلیفہ اور اس کی ذاتی حیثیت (Personal Capacity) میں فرق نہیں کرتے۔ عدالتوں میں عمر ابن خطاب اور علی ابن ابی طالب پیش ہوتے تھے۔ اور دعاوی ان کی ذات کے خلاف تھے نہ کہ "خلیفہ ان کونسل" کے خلاف۔ اور یہ اسلامی نظام حکومت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے قانون کو رائج کرنے والوں کو بھی قانون کی زد سے مستثنیٰ نہیں کیا پھر یہ بھی واضح رہے کہ "خلیفہ ان کونسل" کی حیثیت بھی واضع قانون کی نہیں ہوگی۔ بلکہ جہاں تک اصول قانون کا تعلق ہے وہ تو کتاب و سنت میں ہمیشہ کے لیے منضبط ہو چکے۔ اب ان اصول کو نافذ کرنا یا ان کی روشنی میں جزئی امور میں قواعد مرتب کرنا یہ اس مجلس کا فریضہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ صاحبِ "تعلیمات" نے جہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعتِ خدا اور رسول کا حکم آیا ہے اس سے مراد امارت ہے، ان کے پیش نظر یہی خاکہ ہے جو اوپر گزارش کیا گیا ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو اس میں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں کہ اس با اختیار جماعت کی اطاعت عین اطاعتِ رسول ہے اور اس کی معصیت معصیتِ خدا و رسول، جیسا کہ نبی اکرم نے خود ارشاد فرمایا کہ:

مَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِىْ	جس شخص نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے
وَمَنْ عَصَى الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِىْ۔	اس کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

بحث طویل ہوگئی۔ لیکن امید ہے کہ اس میں بہت سی کام کی باتیں نکل آئیں گی۔ اخیر میں اتنا گزارش کرنا ضروری ہے کہ چونکہ میں نے اس میں آپ کو

مخاطب کیا ہے اس لیے وہی امور پیش کیے ہیں جن میں مجھے آپ کے جواب کے بعد مزید اطمینان کی ضرورت نظر آئی - رہے وہ امور جن سے اتفاق ہے یا صاحب "تعلیمات" سے جن امور میں اختلاف ہے انہیں دہرانا تحصیلِ حاصل سمجھا گیا ہے اور یہ گذارشات بھی محض لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ہیں "

اطاعتِ رسول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسول اپنی ذاتی حیثیت میں مُطاع اور متبوع نہیں ہو سکتا - نہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت اور پیروی اس بنا پر ہے کہ وہ موسیٰ بن عمران ہیں، نہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس وجہ سے لائق اطاعت و اتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں، اور نہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپ محمد بن عبداللہ ہیں - اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسول ہیں - اللہ نے ان کو وہ علم حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا، اور ان کو وہ ہدایت بخشی جو عام لوگوں کو نہیں بخشی - اور ان کو دنیا میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وہ صحیح طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی رائے و عقل یا انبیاء کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے - اب اختلاف جس امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے -

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسول لے کر آتا ہے - تبلیغ کتاب کے بعد رسول کی حیثیتِ رسالت ختم ہو جاتی ہے - پھر وہ بھی ویسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان - دوسرے انسان اگر امیر اور سردارِ قوم ہوں تو محض نظم و ضبط (Discipline) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہوگی - مگر مذہبی فریضہ نہ ہوگی - دوسرے اگر عالم، حکیم اور متقی ہوں تو ان کے اوصاف (MERITS) کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے گی اور یہ پیروی اختیاری ہوگی، واجب نہ ہوگی - یہی معاملہ رسولِ خدا کا بھی ہے - تبلیغ کتاب کے سوا دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخصی ہے - بحیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو

اس کی اطاعت باطن فیہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ قاضی ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اس کے حدود قضا (Jurisdiction) ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل جج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطور ایک نظیر کے لیے جائیں گے نہ کہ ایک شارع اور واضع قانون کی حیثیت سے۔ اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی جس طرح دوسرے علماء و عقلاء کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں محض اس بنا پر کہ وہ حامل منصب رسالت کی زبان سے نکلی ہیں وہ داخلِ دین نہیں سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک نیک سیرت انسان ہے، اور اس کی زندگی اپنے اطوار، آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے، تو ہم بالاختیار اس کو ایک نمونہ (Model) بنائیں گے جس طرح ایک غیر نبی کی اچھی زندگی کو نمونہ قرار دینے میں ہم مختار ہیں لیکن اس کا کوئی عمل اور قول ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔ یہ مذہب اس گروہ کا ہے جو آج کل اہلِ قرآن کہلاتا ہے۔

ایک دوسرا گروہ اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رسول کے ذمہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا، بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھا دینا بھی تھا کہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو۔ لہٰذا عبادات و طاعات وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسول نے بتائی ہے، اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے، اور دینی فرض ہے۔ باقی رہے وہ معاملات جو احکام کتاب کے علاوہ رسول اپنی شخصی حیثیت میں ایک امیر، ایک قاضی، ایک مصلح قوم، ایک حکیم، ایک شہری، اور ایک فرد جماعت کی حیثیت سے انجام دے، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ و قانون بنانے والی ہو اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔ اس گروہ کے نمائندے جناب مولانا اسلم جیراج پوری ہیں۔

ایک تیسرا گروہ ہے جو رسول کی حیثیت رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام و قضایا، اور بہت سے دوسرے معاملات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔ مگر وہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیتِ رسالت سے خارج ہیں، اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ شخصی میں بیّن امتیاز کر دیتا ہو، اور ایک ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور میں ابتدا ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اگرچہ تھوڑی غلطی اس میں ضرور ہے لیکن الحمدللہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچی۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول کی حیثیتِ شخصی اور رسالت کی حیثیت اگرچہ اعتبار میں دو جداگانہ حیثیتیں ہیں مگر وجود میں دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ منصبِ رسالت دنیوی عہدوں کی طرح نہیں ہے کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کرسی پر بیٹھتا ہے، عہدہ دار ہے، اور جب اس سے اُترا تو ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسول جس وقت منصبِ رسالت پر سرفراز ہوتا ہے اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (On Duty) ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتا جو اس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے معاملات عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلم اخلاق کی حیثیت سے، ایک شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں، یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اس کی حیثیت رسالت اس

طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے، اس وقت بھی وہ اسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے، جس کے ماتحت وہ انہیں حدود کے اندر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کردی ہیں، اور اپنے اقوال میں اعمال میں اور زندگی کے پورے رویے میں دنیا کے سامنے اس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ اصول جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے۔ اور یہ ہیں وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کی آزادی عمل کو محدود ہونا چاہیے۔ اس خدمت کو نبی اپنی شخصی وخانگی زندگی میں بھی اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں، اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہوجاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے، کیونکہ اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرکے ان کے سامنے ایک "مسلم" کی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کردے، اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کرکے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کرکے صحیح معنوں میں ایک مسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہٰذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے اور اس کے قول وفعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جاسکے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کے اقوال و افعال میں تقلید و تاسی کے لحاظ سے فرق مراتب ضرور ہے۔ بعض وجوب اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں، اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت درجہ کمال کی ہے۔ لیکن فی الجملہ نبی کی پوری زندگی ایک ایسا نمونہ (Model) ہے جس کو

اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ بنی آدم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا، اور جو اس کی مطابقت سے کم از کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹ جائے گا وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق، فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق پر ہے۔ اور میں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اس مسلک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے مجھ کو نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ یکایک کسی راہ چلتے کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیتا ہو، یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کرتا ہو کہ وہ منجملہ اپنے دوسرے کاروبار کے ایک پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے، گویا کہ وہ ایک جز وقتی مزدور (Part-time Worker) ہے جو مقررہ اوقات میں ایک مقرر کام کر دیتا ہے اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ برعکس اس کے میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت کرائی ہے۔ نبوت عطا کرنے سے پہلے بھی اس کو اخلاقی عیوب اور گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے، خطرات اور ہلاکتوں سے اس کو بچایا ہے اور ایسے حالات میں اس کی پرورش کی ہے جن میں اس کی استعداد نبوت ترقی کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی رہی ہے پھر جب وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوتِ فیصلہ (Judgement) اور نورِ ہدایت عطا کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے، اور اس سے اس طرح یہ کام لیا ہے کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے آخری سانس تک اس کی پوری زندگی اسی کام کے لیے

وقف رہی ہے۔ اس کے لیے دنیا میں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں رہا ہے۔ رات دن، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کو یہی دھن رہی ہے کہ گمراہوں کو راہِ راست پر لائے اور راہِ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر جانے کے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمہ وقتی ملازم (Whole time Servant) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی اور نہ اس کے لیے کبھی اوقاتِ کار (Working Hours) مقرر کیے گئے۔ اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی قائم رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پائے۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے۔ معاملات کو بالکل اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ جہاں بھی اس کی خواہش یا اس کے اجتہاد نے خدا کے مقرر کیے ہوئے خطِ مستقیم سے بال برابر جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش اور اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سواء السبیل اور صراطِ مستقیم پر چلائے، اگر وہ اس خط سے یک سرِ مو بھی ہٹتا تو عام انسان میلوں اس سے دور نکل جاتے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔

۱۔ یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دیے جاتے تھے، اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا تھا، متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت اسحٰق کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے، وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ (الصّٰفّٰت: ۱۱۲) حضرت یوسف کے متعلق بچپن ہی میں حضرت یعقوب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے۔ حضرت زکریا بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحیٰی کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ

الْمُطَهَّرِينَ (آل عمران: ۴۹) حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طینت لڑکے (غلام زکی) کی خوشخبری دے، اور جب ان کے وضع حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورۂ مریم رکوع دوم) پھر اس اسرائیلی چرواہے کو بھی دیکھیے جس سے وادیٔ مقدس طویٰ میں بلا کر باتیں کی گئیں۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھوا کر دریا میں ڈبویا گیا۔ خاص اسی فرعون کے گھر میں پہنچایا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پیاری صورت دی گئی کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں گھر کرلے (وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي) (طٰہٰ: ۳۹) اسے مذکور تمام عورتوں کے دودھ سے روک دیا گیا یہاں تک کہ وہ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گیا، اور اس کی پرورش کا انتظام خاص حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا (وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي) (طٰہٰ: ۳۹) یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خاص طور پر نبوت ہی کے لیے پیدا کیے جاتے تھے۔

۲۔ پھر دیکھیے کہ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے، سیدھی نکلتی ہے۔ غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض عمل وجدان (intuition) سے ان صحیح نتائج پر پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے بلکہ جبلی و وہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں، صحیح نتیجے، صحیح عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوب کو دیکھیے۔ حضرت یوسف کا خواب سنتے ہی ان کے دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ اس بچے کو اس کے بھائی جینے نہ دیں گے۔ برادرانِ یوسف ان کو کھیل کے لیے لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوب نہ صرف ان کی بری نیت کو بھانپ جاتے ہیں بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بعد میں وہ بنانے والے

تھے۔ فرماتے ہیں وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (یوسف: ۱۳) پھر جب بیٹے بھائی کا خون بھرا ہوا کرتہ لا کر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ دیکھ کر فرماتے ہیں بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (یوسف: ۱۸) اسی طرح جب بنیامین یوسف مصر سے واپس آکر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں سے ہم آرہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس کا دھوکہ ہے۔ بیٹوں کو پھر مصر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ (یوسف: ۸۷) اسکے بعد جب ان کے بیٹے حضرت یوسف کا قمیص لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دور ہی سے حضرت یوسفؑ کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نفسی و روحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں۔ یہ صرف حضرت یعقوب ہی کی خصوصیت نہیں تمام انبیاء کا یہی حال ہے۔ حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے:

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (مریم: ۱۳) — ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوت فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰ کی زبان سے گہوارے میں کہلوایا جاتا ہے کہ:

وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (مریم: ۳۱-۳۲) — اور اللہ نے مجھ کو برکت والا بنایا جہاں بھی میں رہوں۔ اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمتگذار بنایا اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۴) — اور تم اخلاق کے بڑے رتبے پر ہو۔

یہ سب ان جبلی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو لے کر انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ ان کی انہی فطری استعدادات کو ترقی دیکر

فعلیت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (قوتِ فیصلہ) اور ہدایت اور بیّنہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اعراف: ۶۲)

میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سماوات و ارض کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے (انعام: ۹)، اور جب وہ اس مشاہدہ سے علم لیقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں:

یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔ (مریم: ۴۳)

اے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں، لہٰذا میری پیروی کریں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف: ۶۸)

اور یقیناً وہ وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ یہ راز نہیں جانتے

حضرت یوسفؑ کے حق میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (یوسف: ۲۲)

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو دانش اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی (قصص: ۲) یہی حکم اور علم حضرت لوطؑ کو عطا کیا گیا (انبیاء: ۵) اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (نساء: ۱۱۳)

اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ (انعام: ۵۷)

کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن راستے پر ہوں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف: ۱۰۸)	کہو کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں بھی بصیرت پہ ہوں اور وہ بھی جو میرے پیرو ہیں۔

اس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ (الانعام: ۵۰)	میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پہ وحی کی جاتی ہے۔ کہو اے محمدؐ! کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

ان آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے، اور اسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس روشنی سے حقائق کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں، اسی سے غلط اور صحیح میں امتیاز کرتے ہیں، اسی سے معاملات میں فیصلہ کرتے ہیں اور اسی سے ان امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علمائے اسلام نے اسی چیز کا نام وحی خفی رکھا ہے، یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی تھی اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے تھے۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے اور جن امور میں حق اور صواب معلوم نہیں کر سکتے، ان میں نبی کی نظر اللہ کی دی ہوئی روشنی اور بصیرت کے زور سے آن واحد میں تہ تک پہنچ جاتی تھی۔

۳۔ اس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف حکمت اور قوت فیصلہ اور غیر معمولی دانش و بینش عطا کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے، غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے۔ خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں یا شیطانی وساوس کے تحت یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں۔ حتیٰ کہ اگر بمقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں

بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصے میں دیکھیے۔ جب قریب تھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی ان کو اپنے جال میں پھنسا لے اللہ تعالیٰ نے اپنی "برہان" دکھا کر ان کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔

(یوسف: ۲۴)

اس نے یوسفؑ سے ارادۂ بد کر ڈالا، اور وہ بھی اس کی طرف ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا تاکہ ہم اس کو برائی اور بے حیائی سے پھیر دیں کیونکہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہیں خوف ہوا کہ کہیں فرعون ان پر زیادتی نہ کرے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سُن اور دیکھ رہا ہوں (طٰہٰ : ۲)۔ خوف بشریت کی بنا پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بشری کمزوری کو اپنی وحی سے دُور کیا۔

حضرت نوحؑ بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اُٹھے "رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ، خدایا یہ میرا بیٹا ہے" (ہود: ۴۵) یہ بشری کمزوری تھی۔ اللہ نے اسی وقت یہ حقیقت ان پر واضح کر دی وہ تیرے نطفہ سے ہو تو ہوا کرے، مگر تیرے "اہل" سے نہیں، کیونکہ عمل غیر صالح ہے۔ بشریت نے محبت پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ، بیٹا، بھائی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں کے سے پردہ اٹھا دیا اور حضرت نوحؑ مطمئن ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ اپنی فطری رحمت و رأفت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی تالیفِ قلب، لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں

میں ایمان کی روح پھونکنے کی خواہش، اور کبھی کبھی اقتضائے بشریت کی بنا پر جب کبھی آپ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوتی ہے، وحی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (عبس: ۱) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی (انفال: ۰۰) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ: ۴۳) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰) وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: ۸۴) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم: ۱) یہ سب آیات اسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ ان آیات کو اس امر کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے مبرا نہ تھے۔ خصوصاً حضرات اہلِ قرآن کو تو ان آیات کے ذریعہ سے اللہ کے رسول کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزہ آتا ہے۔ لیکن دراصل یہی تو وہ آیتیں ہیں جن سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور اس کی زندگی کو ٹھیٹھ معیارِ حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور یہ حقیقت صرف مذکورہ بالا آیات ہی میں بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اصولی حیثیت سے بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔

(النساء ۱۳:۱۱)

اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو راہ راست سے ہٹا دینے کا عزم کر ہی چکا تھا مگر وہ خود اپنے آپ کو بہکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ

قریب تھا کہ وہ تم کو اس بات سے جو ہم نے

عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ خَلِیْلًا وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (بنی اسرائیل ۷۳-۷۴)

تم پر وحی کی ہے منحرف کر دیتے تاکہ تم اس کے سوا کچھ اور ہم پر بنا لو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے۔ اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف جھک ہی جاتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ۔ (الحج: ۵۲)

ہم نے تم سے پہلے جو نبی یا رسول بھیجا ہے اس نے جب کبھی کسی بات کی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں وسوسہ ڈال دیا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ (نبی کے دل میں) شیطان جو وسوسہ بھی ڈالتا ہے اللہ اسے مٹا دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا ہے۔

ان اصولی ارشادات سے اور اوپر کی واقعاتی مثالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی کو ٹھیک ٹھیک معیار مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جائے اس کی فوراً اصلاح کر دے، خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک معاملہ میں۔ پھر اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جائے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نبی کے جن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے گرفت نہیں کی ہے وہ سب کے سب اللہ کے معیار مطلوب پر پورے اترتے ہیں اور گویا ان پر خود اللہ ہی کی مہر توثیق ثبت ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس امر کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے کہ نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان، جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو، ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک خدا کی طرف سے نزول وحی کے لیے چن لیا جائے، اور بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات، اس کے اعمال، اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی

انسانوں سے ممتاز نہ ہوں، جیسا کہ نام نہاد اہل قرآن کا گمان ہے۔ یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتادی گئی ہوں اور اس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہو جیسا کہ مولانا اسلم جیراج پوری کا خیال ہے۔ اسی طرح نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذات بشریہ پر نبوت عارض ہوتی ہے اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریت اور اس کی نبوت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے صرف اس شعبہ کو اطاعت و اتباع کے لیے منتخب کر سکیں جو نبوت سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ہمارے دوست چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا خیال ہے۔ یہ تینوں خیالات بے اصل ہیں۔ ان کے برعکس قرآن مجید سے نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کار نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ بشر ہی ہوتا ہے اور ان تمام حدود سے محدود ہوا کرتا ہے جو حق تعالیٰ نے فطرتِ بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں، لیکن ان حدود کے اندر اس کی بشریت آخری اور انتہا درجہ کی کامل و اکمل بشریت ہوتی ہے جس میں وہ تمام قوتیں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اس کے جسمانی، نفسانی اور عقلی و روحانی قویٰ عدل و تسویہ (Ralance and Moderation) کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ بلا کسی غور و فکر کے اپنے وجدان سے اس الہام الٰہی کو پا لیتا ہے جس کی طرف فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس: ۸) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت اتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر صرف اپنے میل طبعی سے فجور کی راہ چھوڑ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اس کے سامنے آئے اس الٰہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔
(سورہ بلد پ ۳۰)

اس کے قلب کی سلامت اور اس کی فطرت کی صحت اس کو خود بخود ان راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں۔ اور وہ آپ سے آپ ان راستوں پر چلتا ہے جو مرضاتِ الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ یہی کامل و اکمل بشریت ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایتِ عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے، حق تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پاکر سراج منیر بنتی ہے، مصالح عامۂ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا مہبط قرار پاتی ہے، اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہر انسانیت پر عارض ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیت کاملہ کا جوہر ہے جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا جاتا ہے۔ نبوت کا منصب ایسا نہیں ہے کہ ایک انسان تھا جو وائسرائے بنا دیا گیا، حتیٰ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اسی کی طرح وائسرائے بنا دیا جا سکتا تھا، بلکہ دراصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے، اور نبی کی حیثیتِ ذاتی ہی اس کی حیثیتِ نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اس کی حیثیتِ نبوی بالقوۃ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل، کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی پیدا ہوا ہے، لیکن اس کی مٹھاس پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی ظاہر ہوتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور ذات نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ میں توضیح مدعا کے لیے ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں:-

(۱) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا	اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو براہِ راست غیب کا علم دے بلکہ وہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے

بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۔ (آل عمران: ١٧٩)

چن لیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔

(٢) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء: ٦٤)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن[1] سے۔

(٣) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ٨٠)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(٤) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ (النجم: ١تا٤)

تارے کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے، تمہارا صاحب (یعنی نبی) نہ گم کردہ راہ ہے اور نہ کج راہ، اور نہ وہ ہوائے نفس سے بولتا ہے۔ وہ صرف وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔

(٥) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (الانعام: ٥٠)

میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔

(٦) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب: ٢١)

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(٧) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران: ٣١)

اے محمد! کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(٨) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور: ٥١) وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۔ (النور: ٥٤)

اہلِ ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ..... اور

---

[1] یعنی رسول بذاتِ خود مطاع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اذن یا اس کے حکم کی بنا پر مطاع ہوتا ہے۔

اگر تم اس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤ گے۔

(۹) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء: ۶۵)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی، نہیں! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر تو جو فیصلہ کرے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سر بسر تسلیم کریں۔

(۱۰) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑگیا۔

ان آیات پر غور کیجیے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

۱۔ پہلی آیت میں نبی اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اپنے غیب[1] کا علم ہر انسان پر فرداً فرداً ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص بندے پر ظاہر کرتا ہے، اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اس بندے پر ایمان

---

[1] غیب یعنی وہ غیر محسوس حقیقتیں جن سے واقف ہوئے بغیر دنیا میں انسانی زندگی کے لیے کوئی صحیح طریقہ اور نظام نہیں بن سکتا۔ مثلاً یہ کہ انسان کی اصلیت کیا ہے؟ وہ آزاد ہے یا کسی کا محکوم؟ محکوم ہے تو کس کا محکوم ہے؟ اپنے حاکم سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اسے کبھی اپنے حاکم کو جواب دینا ہے یا نہیں؟ جواب دینا ہے تو کہاں؟ کس شکل میں؟ کس معیار پر؟ کن معاملات میں؟

لائیں۔

(۲)، دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو رسولِ خدا مان لیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اس آیت میں، بلکہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی دیا گیا ہے، مطلق ہے، مقید نہیں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ رسول کی اطاعت فلاں فلاں امور میں ہے اور ان امور کے سوا کسی دوسرے امر میں نہیں ہے پس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول ایک حاکم عام ہے۔ جو حکم بھی وہ دے، مومنوں پر اس کا ماننا لازم ہے۔ یہ خود رسول کے اپنے اختیار میں ہے کہ الٰہی ہدایت کے ماتحت اپنی حکومت کے اقتدار کو مخصوص حدود کے اندر محدود کر دے، اور ان حدود سے باہر لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخش دے لیکن مومنوں کو یہ حق ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ خود رسول کے اختیارات کی حد بندی کر دیں۔ وہ تو قطعاً محکوم و مامور ہیں۔ اگر رسول ان کو زراعت اور نجاری اور حدادی وغیرہ کے طریقوں میں سے بھی کسی خاص طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیتا تو ان کا فرض یہی تھا کہ بے چون وچرا اس کے حکم کی اطاعت کرتے۔

۳۔ جب اطاعت غیر مشروط اور غیر محدود کا حکم دے دیا گیا تو یہ اطمینان دلانا بھی ضروری تھا کہ نبی کی اطاعت، اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت نہیں ہے، جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا۔ جو کہتے تھے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ، کیا یہ (الانبیاء : ۳)

---

۴ اور اس جواب دہی میں کامیاب یا ناکام ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ ان سوالات کا جب تک کوئی جواب، اور وہ بھی قیاسی وگمانی جواب نہیں بلکہ علمی اور یقینی جواب معلوم نہ ہو انسانی زندگی کے لیے کوئی اسکیم نہیں بن سکتی۔ اور یہی وہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں "غیب کے علم" سے تعبیر فرما رہا ہے۔

تمہیں جیسا ایک بشر نہیں ہے ؟ اور مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (مومنون: ۲۴) "یہ کچھ نہیں ہے مگر تمہارے ہی جیسا ایک بشر، اور اس پر یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے" اور وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (مومنون: ۳۴) "اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے") بلکہ دراصل یہ خدا کی اطاعت ہے، کیونکہ نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے اور جو کچھ عمل کرتا ہے خدا کی ہدایت کے ماتحت کرتا ہے، وہ خود اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہے، اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

یہی بات ہے جو تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی تھی بلکہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا تھا اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے تھے، معاملات میں صائب رائے قائم کرتے تھے، اور تدبیریں عمل میں لاتے تھے۔
مثال کے طور پر دیکھیے۔ نوح علیہ السلام طوفان کی پیش بندی کے لیے اللہ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے ماتحت کشتی بناتے ہیں (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا) (ہود: ۳۷) حضرت ابراہیم کو ملکوت سموات و ارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔ حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ) (یوسف: ۳۷) حضرت موسیٰ طور پر باتیں کی جاتی ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے، اس سے بکریاں چراتا ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ اس کو پھینک دو۔ جب

لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے اور حضرت موسیٰ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے یا مُوسیٰ اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (قصص: ۳۱) "موسیٰ ڈرو نہیں، آگے بڑھو، تم امن میں ہو"۔ پھر حکم دیا جاتا ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ: ۲۴) "فرعون کی طرف جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے"۔ وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے لَا تَخَافَا اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى (طٰہٰ: ۴۶) "ڈرو نہیں میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور سنتا ہوں"۔ فرعون کے دربار میں سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ ڈرتے ہیں تو وحی آتی ہے لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ: ۶۸) "مت ڈرو، تمہارا ہی بول بالا ہو گا"۔ جب فرعون پر اتمام حجت ہو چکتا ہے تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (شعراء: ۵۲) "میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چل پڑو، تمہارا تعاقب کیا جائے گا"۔ دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (شعراء: ۶۳) "دریا پر اپنا عصا مارو"۔ کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایت عامہ کے لیے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالیٰ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کی غلطی کرنے کا امکان ہو اپنی وحی سے ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے اور یہ وحی اس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لیے ان کے واسطہ سے بھیجی جاتی اور کتاب میں ثبت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الٰہی ہدایت نامے اور دستور العمل کا کام دے۔

ایسی ہی وحی غیر متلو اور وحی خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ حضور انور نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں آیا۔ مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا اس وقت ارشاد ہوا:۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ (بقرہ : ۱۴۳)	جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا اتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ موڑنے والے کے درمیان امتیاز ہو جائے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا، وہ وحی کی بنا پر تھا۔

جنگِ اُحد کے موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ ۔ (آل عمران : ۱۲۶)	اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا۔

ظاہر ہوا کہ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔

جنگِ اُحد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدرِ ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ بھی اسی کی جانب سے تھا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۔ (آل عمران : ۱۷۲)	جن لوگوں نے لڑائی میں زخم کھانے کے بعد پھر اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضورؐ کے مدینے سے نکلنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ ۔ (انفال : ۵)	جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے نکالا۔

گھر سے نکلنے کا حکم قرآن میں نہیں آیا، مگر بعد میں اللہ نے تصدیق فرمائی کہ

یہ خروج اس کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی رائے سے۔

پھر عین جنگ کے موقع پر اللہ نے اپنے نبی کو خواب دکھایا:

اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ۔ (انفال: ۴۳) جب کہ اللہ ان کو قلیل بنا کر تیرے خواب میں تجھے دکھا رہا تھا۔

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم صدقات پر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ یہ تقسیم خود حضرت حق کے ارشاد سے عمل میں آئی تھی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔ (توبہ: ۵۹) اگر وہ راضی ہو جاتے اس حصہ پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہ صلح کے مخالف تھے، اور صلح کی شرائط ہر شخص کو ناقابل قبول نظر آتی تھیں مگر اللہ کے نبی نے ان کو قبول کیا، اور اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ صلح اسی کی جانب سے تھی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (فتح: ۱) ہم نے تجھ کو فتح مبین عطا کی۔

آیات کے تتبع سے اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تعلق اپنے انبیاء کے ساتھ کوئی عارضی اور موقتی تعلق نہیں ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو بس اسی وقت یہ تعلق بھی قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جاتے۔ بلکہ دراصل حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی پیغمبری کے لیے منتخب فرماتے ہیں اس کی طرف وہ ہمیشہ ایک توجہ خاص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں، اور دائماً اپنی وحی سے اس کی ہدایت و رہنمائی فرماتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر گامزن رہے، اور اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر نہ ہونے پاتے جو مرضات الٰہی کے خلاف ہو۔ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اور

جیسا کہ میں اس مضمون کے پہلے حصّہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بات بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاء پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے، اور اگر باقتضائے بشریّت ان سے کبھی کوئی لغزش ہوتی ہے، یا وحی خفی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں وہ کبھی غلطی کرتے ہیں، یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کر جاتے ہیں جو مرضاتِ الٰہی سے یک سرِ مُو بھی ہٹی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کرتا ہے اور تنبیہ کر کے سیدھے رستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیائے کرام کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے، اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ لوگوں کے دلوں سے انبیاء علیہم السلام کا اعتماد اُٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب انبیاء بھی ہماری ہی طرح نعوذ باللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جا سکتی ہے بلکہ اس ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہوائے نفس کا اتباع کرنے یا اپنی رائے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چونکہ اس کی طرف سے اس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، اس لیے ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ دائماً اس کی ہدایت پر کاربند رہیں اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیّت نہیں رکھتیں۔ مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا، اور کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے دخل در معقولات پر چیں بہ جبیں ہو جانا، یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا، کونسا ایسا اہم واقعہ تھا؟ مگر اللہ نے اپنے نبی کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی رائے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو معاف کر دینا، اور بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک

معمولی واقعہ ہے، مگر نبی کی زندگی میں یہی واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر وحی جلی کے ذریعے سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام افراد کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو، بلکہ منصب نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبی کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک منشاء الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو نہ سمجھ کر مرضی الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرتا ہے تو اللہ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

۴۔ اللہ نے اپنے نبی کی اس خصوصیت کو ہمارے سامنے اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اس کے نبی کی راست روی پر کامل اعتماد ہو اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یقین رکھیں کہ نبی کا قول اور عمل گمراہی اور کج راہی اور اتباع ہویٰ اور بشری فکر و رائے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے۔ زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اس صراط مستقیم پر جما ہوا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بتائی ہوئی ہے۔ اس کی سیرت پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل و اکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہتے وہ بے خطر اسی کی پیروی کرے۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے۔ چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ میں ایک "اسوۂ حسنہ" ہے۔ اور ساتویں آیت میں رسول اللہ کے اتباع کو محبوب الٰہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے۔

یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخصیص و تحدید نظر نہیں آتی۔ صریح تعمیم و اطلاق ہے۔ رسول اللہ کی ذات کو مطلقاً اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے اور مطلقاً ہی آپ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپ کا اتباع کرو گے، اور اپنی زندگی میں سیرت پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کرو گے اتنا ہی تقرب

تم کو بارگاہ الٰہی میں حاصل ہوگا، اور حق تعالیٰ اتنا ہی تم کو پیار کرے گا۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام معاملات زندگی میں آپ نے جو کچھ کیا ہے اور جس طرح کیا ہے سب انسان بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں، اور اپنی زندگی میں آپ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور فرائض و واجبات اور ارکانِ اسلام کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تمدنی، معاشی، اور سیاسی معاملات، اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، بعض ایسی ہیں جن میں آپ نے اخلاق اور حکمت اور شائستگی کی تعلیم دی ہے، اور بعض ایسی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روح اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیے، کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہییں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوئی ہے وہ اس میں طرح طرح

کی حجتیں نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی ویسا ہی لباس پہنیں؟ آپ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟ آپ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہ ویسی ہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں ہے جو آپ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدود ہیں جن کی پابندی کو حضورؐ نے ہمیشہ کلام میں ملحوظ رکھا۔ اصل چیز یہ نہیں ہے کہ شادی عرب عورت سے کی جائے یا غیر عرب سے بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو، اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں، اور اپنے جائز شرعی اختیارات کو اس پر کس طرح استعمال کریں۔ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ تھا اس سے بہتر نمونہ ایک مسلمان کی خانگی زندگی کے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کس نے کہا کہ آپ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہی مشروع لباس ہے؟ اور جو کھانا آپ کھاتے تھے بعینہ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے؟ اصل میں اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقویٰ اور پاکیزگی کے وہ حدود ہیں جو آپ اپنے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ انہی حدود سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ اسراف یہی حال حضورؐ کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے۔ وہ پاک زندگی پوری کی پوری ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ نے سچ فرمایا کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن۔ اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھ لو۔ جو اسلام

خدا کی کتاب میں مجمل ہے وہی رسولِ خدا کی ذات میں تم کو مفصل نظر آئے گا۔

الحمدللہ کہ ہمارے دوست چودھری غلام احمد صاحب ان لوگوں کے ہم خیال نہیں ہیں، مگر بعض احادیث سے ان کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ "حضور ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بہ حیثیت رسول نہیں ہوتا تھا" یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے، اور یہ شانِ رسالت ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے جس کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ لوگوں سے رائے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کر لیں اور ان کی عقل و فکر کو معطل کر دیں۔ نہ آپ دنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے ذاتی معاملات میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ آپؐ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ اسلام کو عقیدہ کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائٹی کے نظام میں نافذ کر دینا تھا۔ اس مقصد کے سوا دوسری کسی چیز کی طرف حضورؐ نے کبھی توجہ نہیں فرمائی۔ اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہہ دیا کہ تم اپنی رائے اور عمل میں آزاد ہو، جس طرح چاہو کرو اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ اگرچہ صحابہ کرام آپ کے ہر ارشاد کو رسول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے، اور آپ کو مطلقاً مُطاع و متبوع سمجھتے تھے، اور اسی لیے جب کبھی حضورؐ کسی دنیوی مسئلہ میں بھی کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ کو شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ حکمِ رسالت ہو، لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ آپؐ نے کسی ایسے مسئلہ میں، جو آپ کے مقصدِ بعثت سے متعلق نہ تھا صحابہؓ کو کوئی حکم دیا ہو اور انہیں اطاعت پر مجبور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا، اور ہر آن اس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا

کہ کونسا معاملہ اس مشن سے تعلق رکھتا ہے اور کونسا نہیں رکھتا، اور اپنے تبعین پر کامل اقتدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا خود اس بات پر شاہد ہے کہ شانِ رسالت کسی وقت بھی حضورؐ سے منفک نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضورؐ نے فرمایا وہ خدا کی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپ کے ایسے ارشادات آپ کے احکام نہیں ہیں، نہ آپ نے ان کو حکم کے انداز میں فرمایا، اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا، مگر پھر بھی جو بات آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی، اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طب نبوی کے باب میں جو کچھ آپ سے ثابت ہے وہ ایسی ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا امّی جو طبیب نہ تھا جس نے کبھی فن طب کی تحقیق نہ کی تھی، وہ کس طرح اس فن کی حقیقتوں تک پہنچا، جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب منکشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہم کو حضورؐ کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بقول آپ کے تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، مگر اللہ اپنے رسولوں کی جبلّت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغِ رسالت کے کام ہی نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شانِ امتیاز دکھا کر رہتی ہیں۔ حدادی اور زرہ سازی کا تبلیغِ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داؤدؑ اس میں غیر معمولی کمال دکھاتے ہیں اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے ان کو سکھایا تھا، وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (انبیاء: ۸۰) پرندوں کی بولیاں جاننے سے تبلیغِ رسالت کو کیا واسطہ؟ مگر حضرت سلیمانؑ اس میں کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے ہیں کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (النمل: ۱۶) نجاری اور کشتی سازی تبلیغِ رسالت کا کونسا شعبہ ہے؟ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط سی کشتی بنوا لو، بلکہ فرماتا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (ہود: ۳۷)

پس انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی امور وحی کیے

گئے تھے جو براہِ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان ہونے کے لیے ناگزیر شرط ہے، اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور بارگاہِ حق میں تقرب کا طلبگار رہو، اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبی کی سنت پر چلے، حتیٰ کہ اگر یک سر مُو بھی اس خط سے ہٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ محبوبیت کے لیے بجز اتباعِ نبی کے اور کوئی راستہ ہی نہیں، فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران ۳۱)

۵۔ اس بحث کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کی امارت اور دوسرے امیروں کی امارت میں کیا فرق ہے اور نبی کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلے میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم مَیں نے تین آیتیں آخر میں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے حکم پر سر جھکا دینا اور آپ کے فیصلے کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے جو اس سے انکار کرے وہ مومن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ "اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں جہاں جہاں ساتھ ساتھ آتے ہیں، ان سے مراد امارت ہے"۔ مجھے مولانا جیراج پوری کے اسی قول پر اعتراض ہے اور مَیں اس کو قرآن مجید کی تعلیم کے قطعاً خلاف سمجھتا ہوں۔ رہا وہ مسئلہ جو چودھری صاحب نے پیش فرمایا ہے تو وہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور اس میں مجھے ان سے بالکل اتفاق ہے۔ مَیں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کی اطاعت واجب ہے۔ اور اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسول اکرم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیتے تھے، اور معاملات میں اولی الامر

کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو حکم خدا و رسول کے خلاف بھی سمجھتا ہو، تب بھی ایک حد خاص تک اس کے لیے لازم ہوگا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے ان کے فیصلے کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ امارت بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "اللہ اور رسول" کہا گیا ہے اور امارت کے احکام ہو بہو وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے احکام ہیں۔ اگر ایسا ہو تو امراء کے بگڑ جانے اور ارباب حل و عقد کے کتاب و سنت سے منحرف ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے کوئی چارہ ان کی اطاعت کرنے کے سوا، اور ہلاکت کے راستوں میں ان کی پیروی کرنے کے سوا باقی نہ رہے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بندۂ خدا اٹھے اور اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کرے تو مولانا اسلم کے فتوے کی رُو سے تو امراء اس کو باغی قرار دے کر قتل کر دینے میں بالکل حق بجانب قرار پائیں گے اور ان کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ "اللہ اور رسول" تو ہم ہی ہیں۔ دوسرا کون ہے جس کی طرف تو ہم کو پھیرنا چاہتا ہے؟

"ترجمان القرآن"۔ ربیع الثانی ۵۴ھ۔ جولائی ۳۵ء

حدیثؒ اور قرآن

منکرینِ حدیث کے مسلک پر ایک ناقدانہ نظر

حال میں ایک صاحب نے ایک مختصر سا رسالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے:
"میں منکرِ حدیث کیوں ہوا"[1] مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا بلکہ اپنے لیے "حق گو" کا لقب اختیار فرمایا ہے۔ انہی "حق گو" صاحب کا ایک مفصل مضمون "مطالعۂ حدیثؒ" کے عنوان سے بھی بعض رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے جس کے بعض حصے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ دلائل قریب قریب وہی ہیں جو منکرینِ حدیث کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے لیے صرف قرآن کافی ہے۔ حدیث کی روایات ناقابلِ اعتبار ہیں، اور ان پر مذہب کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے۔ حق گو صاحب اور ان کے ہم خیال منکرینِ حدیث کی رائے میں حدیث سے اسلام کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ اس کے برعکس اسی چیز نے دشمنانِ اسلام کو وہ اسلحہ فراہم کیے ہیں جن سے وہ اسلام پر حملے کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ اسلام سے حدیث کو بالکل خارج کر دیا جائے اور اس کو وہ اسلام کی ایک بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

حق گو صاحب نے اپنی تائید میں حدیث کی کتابوں سے بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث سے کس طرح دشمنوں کو

---

[1] شائع کردہ "دفترِ امتِ مسلمہ"، امرتسر

اسلام اور رسول کی رسالت پر حملہ کرنے کے لیے مواد حاصل ہوتا ہے، مثلاً بعض احادیث تحریفِ قرآن کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بعض اس الزام کی تائید کرتی ہیں کہ وحی کا نزول ایک ڈھونگ تھا، رسول اللہ جو کچھ اہلِ کتاب سے سنتے تھے اس کو وحی بنا کر پیش کر دیتے تھے (معاذ اللہ)۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کا نزول رسول اللہ کی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق ہوتا تھا۔ بعض اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ رسول اللہ پر جادو کا اثر ہو جاتا تھا۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ اپنے مخالفین کو خفیہ طریقوں سے قتل کرا دیتے تھے (کعب بن اشرف کا واقعہ) بعض سے رسول اللہ پر ظلم اور بیرحمی کا الزام عاید ہوتا ہے (عکل اور عرینہ والوں کا قتل) بعض سے رسول اللہ پر نفس پرستی کا الزام نکلتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مصنف نے رسول اکرم پر شاردا ایکٹ بھی نافذ کیا ہے اور ان سب روایات کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرا دیا ہے جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے نو سال کی عمر میں شادی ہونا ثابت کرتی ہیں۔ اس کے بعد مصنف علمِ حدیث پر عام اعتراضات کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حدیث کی اشاعت عہد خلفائے راشدین میں ممنوع تھی۔ بنو امیہ اور آلِ عباس کے زمانے میں روایت کا سلسلہ شروع ہوا اور بادشاہوں کی سیاسی اغراض کے لیے حدیثیں وضع کی گئیں۔ امام حسن بصری، امام زہری، امام مالک، صحاح ستہ کے مصنفین اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے حدیث کی کتابیں مدوّن کی ہیں، سب کے سب مصنف کے زعم میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے تھے اور ان لوگوں نے بے سر و پا روایتیں جمع کر کے اسلام کو مسخ کر دیا۔ سیاسی اغراض کے علاوہ حدیث میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت اور دوسرے مذاہب کے عقاید اور خرافات بھی داخل ہو گئے۔ پانچ وقت کی نماز، تیس دن کے روزے، صراط اور میزان کا تخیل، احکام ذبیحہ، کھانے پینے کی چیزوں میں مذہب کا دخل، ختنہ، قربانی، احکامِ طہارت، تصاویر اور مجسموں کی حرمت، معراج کے قصے اور ایسی ہی بہت سی چیزیں مصنف کے نزدیک محدثین نے دوسرے مذاہب سے لیں اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے

اسلام میں داخل کر دیں۔

ائمہ فقہ بھی مصنف کے نزدیک قابل طعن ہیں۔ کیونکہ انہوں نے شریعت کا تخیل یہودیوں سے لے کر اسلام کے سر چپک دیا، زندگی کے تمام معاملات پر مذہب کو حاوی کر دیا، جو قوانین عراق کی آب و ہوا اور پہلی دوسری صدی کے حالات کی بنا پر وضع کیے گئے تھے ان کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے مذہبی قوانین بنا ڈالا، اور اس طرح مذہب اسلام "قومی شریعت" کا پابند ہو کر اس قابل نہ رہا کہ دنیا میں اس کی اشاعت ہوتی اور دوسری قومیں اس کا اتباع کر سکتیں۔ مصنف کے نزدیک سینٹ پال اور اس کے متبعین کا یہ خیال درست تھا کہ مذہب (یعنی ایمانیات) کو شریعت (یعنی قانونِ حیات) سے الگ کر دیا جائے، اور یہی چیز دنیا میں مسیحیت کی اشاعت کا باعث ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی مصنف کے خیال میں اس لیے ہوئی تھی کہ شریعت کی بیڑیوں کو کاٹ دیں اور زندگی کے معاملات کو مذہب کی پابندیوں سے آزاد کر دیں۔ دلیل میں یہ آیت پیش کی گئی ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (وہ اتارتا ہے ان سے ان کے بوجھ اور وہ بندش جو ان پر تھی)۔ اس آیت میں اغلال (بیڑیوں) سے مراد مصنف کے نزدیک "اغلالِ شریعت" ہیں اور وہ کہتا ہے کہ ائمہ فقہ اور ائمہ حدیث نے رسول اللہ کے خلاف بغاوت کر کے پھر انہی اغلال شریعت کو مسلمانوں پر ڈال دیا جنہیں کاٹنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تھے، اور یہود کی تقلید میں ان لوگوں نے روایتِ حدیث اور "شریعت سازی" شروع کر دی۔ یہ سب کچھ مصنف کی رائے میں اس لیے کیا گیا کہ یہود کے فریسیوں کی طرح یہ لوگ مسلمانوں پر اپنی گرفت قائم کرنا چاہتے تھے، اور اس غرض کے لیے انہوں نے رسول اللہ کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

پھر لطف یہ ہے کہ مصنف اپنے تمام نظریات کی بنا تاریخی استدلال پر رکھتا ہے، حالانکہ اگر حدیث کی روایات قابلِ اعتبار نہیں ہیں تو تاریخ ان سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ حدیث میں تو ہمارے زمانے سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یا صحابۂ کرام یا ائمہ تک اسناد کا پورا سلسلہ موجود ہے، خواہ وہ آپ کے نزدیک مشکوک ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن تاریخ کے پاس تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔ جن قدیم کتابوں کو آپ تاریخ کا سب سے زیادہ معتبر ذخیرہ سمجھتے ہیں ان کے متعلق آپ کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ جن مصنفین کی طرف وہ منسوب ہیں انہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جو حالات ان کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں ان کے لیے بھی آپ کوئی ایسی سند نہیں رکھتے جس کی بنا پر ان کی صحت کا یقین کیا جا سکے۔ پس اگر حدیث کی مسلسل اور مستند روایات کی تکذیب اس آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے تو تاریخ کے پورے ذخیرے کو اس سے بھی زیادہ آسانی کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ عباسیوں کا وجود دنیا میں کہیں نہ تھا۔ اموی سلطنت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ سکندر کا وجود محض ایک افسانہ ہے۔ غرض تاریخ کے ہر واقعہ کو اس دلیل سے بدرجہا زیادہ قوی دلیل کی بنا پر جھٹلایا جا سکتا ہے جس کی بنا پر آپ حدیث کو جھٹلاتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں زمانۂ گزشتہ کے حالات کا کوئی ذخیرہ اتنا مستند نہیں ہے جتنا حدیث کا ذخیرہ ہے، اور جب وہ بھی ناقابلِ اعتبار ہے تو قدیم زمانہ کے متعلق جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شخص حدیث کی روایات سے انکار کرتا ہو، اور جس کے نزدیک یہ ممکن ہو کہ رسول اللہ سے قریب تر زمانہ میں ایسے ایسے نامور مسلمان بھی، جن سے زیادہ نمایاں ہستیاں مسلمانوں کی قوم سے پیش نہیں کی جا سکتیں، اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود رسول اللہ پر بہتان گھڑ سکتے تھے اور اپنے دل سے حدیثیں وضع کر کے رسول اللہ کی طرف منسوب کر سکتے تھے، وہ آخر تاریخ پر کیسے اعتماد کر لیتا ہے؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور تاریخ کی تمام کتابیں موضوع ہیں، افسانہ ہیں، اور گزشتہ زمانہ کا کوئی حال ہم تک صحت کے ساتھ نہیں پہنچا ہے؟ اس سے زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو شخص بخاری و مسلم، ترمذی و ابوداؤد حتیٰ کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام حسن بصری تک کو ناقابلِ اعتماد سمجھتا ہے وہ

قرآن کریم سے استشہاد کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کی پچ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔

"حق گو" صاحب کا رسالہ اگر کوئی ناواقف مسلمان یا غیر مسلم پڑھے تو اس کے دل پر یہ بات نقش ہو جائے گی کہ رسول اللہ کی وفات پر پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ مسلمانوں نے رسولِ خدا اور اسلام کے خلاف عام بغاوت کر دی اور وہی لوگ اس بغاوت کے سرغنے بنے جو اسلام کی مذہبی تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اور جنہیں مذہب اسلام کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے دل میں ایمان کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے اپنی اغراض کے لیے حدیث، فقہ، سنت اور شریعت کے شاندار الفاظ گھڑے اور دنیا کو دھوکا دینے کے لیے وہ باتیں رسول اللہ کی طرف منسوب کیں جو آں حضرت اور قرآن کی تعلیم کے بالکل خلاف تھیں۔ یہ اثر پڑنے کے بعد ہمیں امید نہیں کہ کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو گا، کیونکہ جس مذہب کے ائمہ اور ممتاز ترین داعیوں کا یہ حال ہو اس کے پیروؤں میں صرف "حق گو" صاحب اور ان کے ہم خیال گنتی کے چند آدمیوں کو دیکھ کر کون عقلمند یہ باور کرے گا کہ ایسا مذہب بھی کوئی سچا مذہب ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کے اعتراضات کو دیکھ کر تو ایک شخص اس امر میں بھی شک کر سکتا ہے کہ آیا اسلام اپنی اصلی شکل میں اس وقت محفوظ ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ جب مسلمانوں کے اسلاف میں پہلی صدی سے لے کر اب تک کوئی گروہ بھی ایسا موجود نہیں رہا جو اپنے پیغمبر کے حالات، اقوال اور تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک محفوظ رکھتا اور جب اس قوم کے چھوٹے بڑے سب کے سب ایسے بد دیانت تھے کہ جو کچھ جی میں آتا تھا گھڑ کر اپنے رسول کی طرف منسوب کر دیتے تھے، تو اسلام کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں فی الواقع کوئی پیغمبر مبعوث ہوا تھا، کیا عجب کہ عوام پر گرفت قائم کرنے کے لیے رسول اور رسالت کا افسانہ گھڑ لیا گیا ہو۔ اسی طرح قرآن کے متعلق بھی شک کیا جا سکتا ہے

کہ وہ فی الواقع کسی پیغمبر پر اترا تھا یا نہیں، اور اگر اترا بھی تھا تو اپنی اصلی عبارت میں محفوظ ہے یا نہیں، کیونکہ اس کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ وہی لوگ تو ہیں جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی باتیں لے لے کر پیغمبر کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذرا نہ شرماتے تھے، یا پھر وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا تھا اور وہ دم نہ مارتے تھے۔ "حق گو" صاحب اور ان کے ہم خیال منکرین حدیث نے یہ ایسا حربہ دشمنان اسلام کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو حدیث کے فراہم کیے ہوئے حربوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے تو اسلام کی جڑ بنیاد ہی کھود کر پھینک دی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "حق گو" صاحب نے حدیث کی کتابوں پر صرف عیب چینی کی نگاہ ڈالی ہے اور ان کتابوں کے بے شمار جواہر کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنا سارا وقت ان چیزوں کی تلاش میں صرف کیا ہے جو ان کے نزدیک حدیث پر طعن کرنے کے لیے مفید ہو سکتی تھیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسی عیب چینی کی نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے تو یہ کتاب بھی ان کو سراسر عیوب سے لبریز نظر آتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہزارہا کفار قرآن کو پڑھتے ہیں اور بجائے ہدایت پانے کے اور زیادہ گمراہ ہو جاتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ ہدایت کی طلب میں قرآن نہیں پڑھتے بلکہ عیوب تلاش کرنے اور اسلام کے خلاف اسلحہ فراہم کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کو قرآن میں بجز عیوب کے اور کچھ نہیں ملتا، کیونکہ انسان ہر جگہ وہی کچھ پاتا ہے جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت "حق گو" صاحب کی آنکھوں پر عیب چینی کی عینک نہ لگی، ورنہ وہ دیکھتے کہ مخالفین اسلام کو بہت سے اسلحہ اس کتاب نے بھی فراہم کیے ہیں، اور یہ بات ان کو قرآن سے بھی انکار کر دینے پر اسی طرح آمادہ کر دیتی جس طرح حدیث کے فراہم کردہ اسلحہ دشمنوں کے ہاتھ میں دیکھ کر انہوں نے حدیث سے انکار کر دیا۔

"حق گو" صاحب نے حدیث پر جتنے اعتراضات کیے ہیں ان سب کا لفظ بلفظ جواب دیا جا سکتا ہے لیکن ہم جزئیات میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتے، بلکہ چند اصولی

باتوں پر کلام کرنا چاہتے ہیں جو دراصل مدارِ بحث ہیں۔ اگرچہ ان کی اور عام منکرینِ حدیث کی عیب جویانہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے اصلاح کی امید کم ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کا آغاز دراصل نیک نیتی کے نقطہ سے ہوتا ہے اور محض ناواقفیت اور ضد ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے ذہن کو منکرانہ خیالات سے تھوڑی دیر کے لیے خالی رکھ کر ہمارے دلائل پر غور کیا تو ان کے عقیدہ کی اصلاح ہو جائے گی۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اُتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوعِ بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟ اگر وہ اس پر قادر نہ تھا تو عاجز تھا، اس کو خدا ہی کیوں مانیے؟ اور اگر وہ قادر تھا اور یقیناً قادر تھا تو اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ یہ تو بظاہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ایسے صریح معجزے اور بیّن خرقِ عادت کو دیکھ کر ہر شخص مان لیتا کہ یہ ہدایت خدا کی طرف سے آئی ہے۔ لیکن خدا نے ایسا نہ کیا اور ہمیشہ رسولوں ہی کے ذریعہ سے کتابیں بھیجتا رہا۔ پھر اس رسالت کے کام پر بھی اس نے فرشتوں یا دوسری غیر انسانی ہستیوں کو مامور نہ کیا، بلکہ ہمیشہ انسانوں ہی کو اس کے لیے منتخب فرمایا۔ ہر زمانہ کے کفار نے بیشتر کہا کہ اگر خدا کو ہم تک کوئی پیغام پہنچانا ہی منظور ہے تو فرشتے کیوں نہیں بھیجتا تاکہ ہم کو بھی اس پیغام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین آجاتے۔ مگر خدا نے ہر ایسے سوال پر یہی فرمایا کہ اگر فرشتے بھی بھیجتے تو ان کو آدمی بنا کر بھیجتے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (انعام) اور یہ کہ اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لیے فرشتے بھیجتے لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۵)

سوال یہ ہے کہ تنزیل کتب کے لیے رسولوں کو واسطہ بنانے اور رسالت کے لیے تمام بندگانِ خدا میں سے بالخصوص انسانوں ہی کو منتخب کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونہ کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء ۶۴)۔ انبیاء علیہم السلام پے درپے آتے اور ہر ایک نے لوگوں سے یہی مطالبہ کیا کہ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (الشعراء ۱۰۸، ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۷۹)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا کہ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران: ۳۱) مومنوں سے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱) اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا۔ لوگ احکام کے منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشا بتانے والا نہ ہوتا۔ اس ضرورت کو تو خیر ایک حد تک فرشتے بھی پورا کر سکتے تھے، مگر پاکیزگی، طہارت اور تقویٰ کے احکام پر لوگ یہ خیال کرتے کہ عملی زندگی میں ان پر عمل کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ فرشتہ تو انسانی جذبات سے محروم ہے پیٹ نہیں رکھتا۔ شہوانی قوتیں نہیں رکھتا۔ انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہے۔ اس کے لیے متقیانہ زندگی بسر کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مگر ہم انسانی کمزوریاں رکھتے ہوئے اس کی تقلید کیسے کریں؟ اس لیے ضروری تھا کہ ایک انسان انہی جذبات و داعیات اور انہی تمام قوتوں اور انسانی تقیدات کے ساتھ زمین پر آتا اور لوگوں کے سامنے احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کر کے بتاتا کہ اس طرح انسان خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر سکتا ہے۔ اس کو زندگی کے وہ تمام معاملات پیش آتے جو انسان کو پیش آتے ہیں۔ وہ ان تمام معاملات میں عام انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا۔[۱۶]

حصہ لیتا، قدم قدم پر ان کو اپنے عمل اور اپنے قول سے ہدایات دیتا، ان کی تربیت کرتا، اور انہیں بتاتا کہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں سے کس طرح انسان بچ کر حق اور نیکی کے سیدھے راستے پر چل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تنہا کتاب اللہ کو کافی نہ سمجھا اور رسول اللہ کے اتباع اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اس کے ساتھ لازم کر دیا۔

قرآن شریف میں صاف طور پر تین چیزوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک حکم خدا، دوسرے حکم رسول، تیسرے مسلمان حکام اور فرماں رواؤں کے احکام اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء: ۵۹) اگر محض قرآن کا اتباع کافی ہوتا اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کے اتباع کی حاجت نہ ہوتی تو رسول اور حکام (اولی الامر) کی اطاعت کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔ اگر رسول اور اولی الامر کا حکم قرآنی احکام کے ماسوا کوئی شے نہ ہوتا، تب بھی بقیہ دونوں کی اطاعت کا حکم الگ دینا بے معنی تھا۔ تین چیزوں کی اطاعت کا الگ الگ حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ قرآن میں جو احکام براہ راست اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں، ان کے علاوہ وہ احکام بھی واجب الاطاعت ہیں جو رسول اللہ دیں، اور ان کی اطاعت بعینہٖ ایسی ہے جیسی اللہ کی اطاعت، مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء: ۸۰) پھر ان کے ماسوا جو احکام مسلمانوں کے اولی الامر دیں ان کی اطاعت بھی لازم ہے بشرطیکہ ان کے احکام خدا اور رسول کے احکام سے اصولی مطابقت رکھتے ہوں۔ اختلاف کی صورت میں ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی دی ہوئی ہدایات کی طرف رجوع کیا جائے، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹)

اس سے معلوم ہوا کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابلِ انقطاع ہے، اور احکامِ رسول کی اطاعت اور اسوۂ رسول کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت

فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول واسوۂ رسول کو نہ لیں گے وہ رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے وہ اس واسطہ کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لیے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ کتاب کو رسول کے ذریعے نازل فرمایا۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ۔

کتاب اللہ اور سنت رسول کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجیے کہ آیا رسول اللہ کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک ضروری تھی؟ ان کے بعد اس کی حاجت باقی نہیں رہی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ جسم کے ساتھ زندہ تھے۔ آپ کے رحلت فرماتے ہی آپ کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ رسول کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی تو ہم پھر وہی کہیں گے کہ اس صورت میں رسول کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا۔ بلکہ اسے بلا واسطہ بھی کرنا ممکن تھا۔ لیکن اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اسی کے لیے اتباع کے احکام دیتے گئے تھے، اور اگر ہدایت نوع بشری کے لیے قرآن کے ساتھ رسول کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی، تو پھر یہ سب کچھ صرف تئیس چوبیس سال کے لیے ہونا کیا معنی؟ محض ایک صدی کے چوتھائی حصہ کے لیے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لیے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا، اور ایک چیز کو جو رسول کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری ہو جانے والی تھی، اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعۂ ہدایت قرار دینا، یہ سب

بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے جو خدائے حکیم و دانا کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔
اس الزام کو خود اللہ نے اپنی کتاب میں رفع کر دیا ہے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء: ۱۰۷) ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ کا فیضان رسالت صرف اپنے زمانے تک کے لیے ہوتا تو آپ کو رحمۃ للعالمین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ آپ قرآن لائے ہیں جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور اسی لیے آپ رحمۃ للعالمین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ رحمت نہ تھے بلکہ رحمت تو قرآن تھا اور آپ کو خواہ مخواہ رحمت کہہ دیا گیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔ پھر یہ جو فرمایا کہ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (السبا: ۲۸) یہ ارشاد صاف اشارہ کر رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے لے کر قیامت تک جن بندگانِ خدا پر "الناس" کا اطلاق ہوتا ہے ان سب کے لیے آپ خدا کے رسول ہیں۔ آپ کی رسالت کسی خاص زمانہ کے لیے نہیں ہے بلکہ جب تک روئے زمین پر "الناس" بستے ہیں اس وقت تک آپ کی رسالت قائم ہے۔ آیت میں کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ "الناس" سے صرف اسی زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔ نہ ایسا کوئی خفیف سے خفیف اشارہ موجود ہے جس سے بعد کے کسی زمانہ تک کی قید نکلتی ہو۔ بخلاف اس کے دوسری آیات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ حضورؐ کی رسالت دائمی ہے۔
اللہ تعالیٰ حضورؐ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر چکا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ: ۳) حضورؐ کی ذات پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (احزاب: ۴۰) اور دوسرے انبیاء کی لائی ہوئی کتابوں کے بخلاف آپ کی لائی ہوئی کتاب کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا گیا ہے، کیونکہ پہلی کتابیں مخصوص زمانوں کے لیے ہدایت تھیں اور یہ

دائمی ہدایت ہے وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (الحجر: ۹)

اس سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لیے ہے اور جب ایسا ہے تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لیے ہیں جن میں آں حضرت کے احکام کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے، آپ کی ذات کو اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے، آپ کے اتباع کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ کہا گیا ہے، اور ہدایت کا دامن آپ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا (النور: ۵۴) رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے، اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو رہے گی۔ پس جب یہ دونوں چیزیں رسول اللہ کے اتباع اور آپ کے نمونۂ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہوا کہ سیرتِ نبوی کے وہ پاک نمونے اور زبانِ وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسولِ اکرم کے ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی، ورنہ بعد کی نسلوں کے لیے ہدایت ناقص رہ جائے گی۔

میں نے "ہدایت ناقص رہ جائے گی" کے الفاظ بہت ہی نرم استعمال کیے ہیں۔ تنزیلِ کتاب کے ساتھ رسالت کا جو ناقابلِ انقطاع رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے، اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کی جو غیر متبدل سنت ابتدا سے چلی آ رہی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ اگر اسوۂ رسول باقی نہ رہتا، اگر رسول اللہ کے احکام باقی نہ رہتے، اگر ہدایت کا وہ پاک سرچشمہ بند ہو جاتا جو رسول اللہ کی سیرت میں تھا، تو محض کتاب اللہ سے دنیا کی ہدایت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے کہ رسالت کے آثار مٹ جانے کے بعد کتاب اللہ کا باقی رہ جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے رسول کے بغیر کتاب اللہ کا نازل ہونا۔ اگر کتاب کی تنزیل کے بعد آثارِ رسالت کے باقی رہنے کی ضرورت

نہیں ہے تو سرے سے تنزیل کے لیے رسالت ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خدا کی حکمت پر کھلا ہوا طعن ہے۔ اور اگر تنزیل کے ساتھ رسالت کا ہونا لازم ہے تو یقیناً اس کے ساتھ آثارِ رسالت کا رہنا بھی لازم ہے۔ بغیر آثارِ رسالت کے تنہا کتاب اللہ موجبِ ہدایت نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آثارِ رسالت محو ہو جاتے تو مسلمانوں کا حشر ان قوموں کا سا ہو جاتا جن کے پاس بجز افسانوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لوگ کہتے کہ جس شخص پر تمہارے قول کے مطابق یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کے حالات تو بتاؤ کہ ہم ان کو جانچ کر دیکھیں کہ آیا فی الواقع وہ رسولِ خدا ہونے کے قابل تھا بھی یا نہیں۔ مگر ہم انہیں کچھ نہ بتا سکتے۔ لوگ پوچھتے کہ تمہارے پاس قرآن کے دعوے کی تائید میں کوئی ایسی خارجی شہادت ہے جس سے تمہارے نبی کی نبوت ثابت ہو سکتی ہو؟ مگر ہم کوئی شہادت نہ پیش کر سکتے۔ ہم کو خود یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ کب اور کن حالات میں قرآن نازل ہوا، کس طرح رسول اللہ کی شخصیت اور آپ کی پاک زندگی کو دیکھ کر لوگ فوج در فوج ایمان لاتے، کس طرح آپ نے نفوس کا تزکیہ کیا، حکمت کی تعلیم دی اور آیاتِ الٰہی کی تلاوت سے معرفتِ حق کا نور پھیلایا، کس طرح آپ نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں تنظیم اور اصلاح کا وہ زبردست کام انجام دیا اور شریعت کا وہ ہمہ گیر اور حکیمانہ ضابطہ بنایا جو محض انسانی عقل کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور جو اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ آپ حقیقت میں اللہ کے رسول تھے۔ یہی نہیں بلکہ اگر وہ روایات نہ ہوتیں جو منکرینِ حدیث کے نزدیک دریا برد کر دینے کے قابل ہیں تو ہم قرآن کی سند اس کے لانے والے تک نہ پہنچا سکتے۔ ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ ہوتا کہ یہ قرآن حقیقت میں وہی ہے اور اسی عبارت میں ہے جس میں رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ ہماری اس کتاب کی وہی حیثیت رہ جاتی جو ژند، اوستا، گیتا، ویدوں اور بدھ مذہب کی کتابوں کی حیثیت ہے۔ اسی طرح ہماری مذہبی زندگی کے جتنے اعمال اور جتنے اصول و قوانین

ہیں، یہ بھی سب کے سب بے سند ہو کر رہ جاتے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے اعمال جس صورت میں ادا کیے جاتے ہیں ان کے متعلق ہم نہ بتا سکتے، اور خود نہ جانتے کہ یہ سب رسول اللہ ﷺ کے مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہیں۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ان سب اعمال کے لیے "سنتِ متواترہ" کافی ہے۔ مگر مدوّن اور مستند حدیث کی غیر موجودگی میں اس "سنتِ متواترہ" کی حیثیت بجز اس کے اور کیا ہوتی کہ اگلوں سے پچھلوں تک نسلاً بعد نسلٍ ایسا ہوتا چلا آیا ہے؟ اس قسم کی متواتر سنتیں تو ہندوؤں، بودھوں اور دوسری قوموں میں بھی ہیں۔ وہ سب یہی کہتے ہیں کہ جو عبادتیں ہم کرتے ہیں اور جو رسمیں ہم میں جاری ہیں وہ بزرگوں سے یونہی چلی آرہی ہیں۔ مگر کیا آج ان کی سنتِ متواترہ پر دنیا اور خود ان قوموں کے روشن خیال لوگوں میں یہ شبہ نہیں کیا جاتا کہ خدا جانے ان طریقوں کی اصل کیا تھی اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ وہ کس طرح بدلتے چلے گئے؟ کیا ان تمام طریقوں پر آج رسوم پرستی کی پھبتی نہیں اڑائی جاتی؟ اگر کوئی شخص ان میں تغیر کرکے کوئی نئی بدعت ایجاد کرنا چاہے تو کیا ان کے پاس اس بدعت کے خلاف کوئی حجت بجز اس ایک دلیل کے موجود ہے کہ جو کچھ باپ دادا کرتے چلے آرہے ہیں اس میں تغیر نہیں ہو سکتا؟ پھر اگر منکرینِ حدیث کی خواہش کے مطابق ہمارے ہاں بھی ایسی مسلسل، مستند اور مرتب روایات نہ ہوتیں جو ہمارے عہد سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر واقعہ یا ہر قول کی سند ہم پہنچا دیتی ہیں اور اگر ہمارے پاس بھی صرف عملِ متواتر ہی باقی رہ جاتا، جس کو "حق گو" "صاحب" "سنتِ متواترہ" سے تعبیر فرماتے ہیں، تو ہمارے مذہبی اعمال اور معتقدات کا حال ان طریقوں اور ان اوہام سے کچھ مختلف نہ ہوتا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں اور جن کو "رسوم" اور "مذہبی افسانوں" سے تعبیر کیا جاتا ہے[1]۔ غور کیجیے، یہ اسلام کے لیے قوت اور استحکام کا سبب

[1] خود مسلمانوں میں عرسوں، نیازوں، اور شادی و غمی کی رسموں کا جو سلسلہ آج چل رہا ہے، حدیث کی غیر موجودگی میں ان سب کو بھی "سنتِ متواترہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور انکارِ حدیث کے بعد ان متواتر سنتوں کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

ہونا یا کمزوری دنا استواری کا سبب؟

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول کا رہنا قطعاً ضروری اور ناگزیر ہے۔

اب اس سوال کی طرف آئیے کہ سنت رسول کے ہم تک پہنچنے کی صورت کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد سے رحلت تک تقریباً ربع صدی کا جو زمانہ بسر کیا وہ محض قرآن پڑھنے اور سنانے ہی میں بسر نہیں ہوا ہوگا، بلکہ آپ تلاوتِ آیات کے علاوہ بھی شب و روز اپنے دین کی تبلیغ فرماتے رہتے ہوں گے، گمراہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی فرماتے ہوں گے، ایمان لانے والوں کو تعلیم بھی دیتے ہوں گے، اور اپنی عبادات، اپنے اخلاق، اور اپنے اعمالِ حسنہ کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کرنے میں مشغول رہتے ہوں گے۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے: یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ: ۱۵۱) نیز قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلمانہ زندگی ایسی شدید مصروفیت میں بسر ہوتی تھی کہ آپ کو اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہ تھا، ہر لمحہ یا تو عبادات میں بسر ہوتا تھا، یا وعظ و نصیحت اور تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس میں۔ حتیٰ کہ بار بار اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اپنے آپ کو ہلاک کیوں کیے ڈالتے ہیں؟

اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسی سرگرم مبلغانہ زندگی میں آیاتِ قرآنی کے سوا کوئی بات بھی آپ کی زبان سے ایسی نہ نکلتی تھی جو یاد رکھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوتی؟ کوئی کام بھی آپ کی زندگی کا ایسا نہ تھا جس کو لوگ اپنے لیے نمونہ سمجھتے، اور دوسروں کو اس پاکیزہ نمونہ کی تقلید کا مشورہ دیتے؟ آپ کے اقوال و اعمال کے متعلق تو اہلِ ایمان کا اعتقاد تھا اور قرآن نے بھی ان کو یہی اعتقاد رکھنے کا حکم دیا تھا کہ آپ کا ہر ارشاد برحق ہے، وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (النجم: ۳) اور آپ کا ہر عمل واجب التقلید ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ ظاہر ہے
(الاحزاب: ۲۱)

کہ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے تو مسلمان یقیناً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد کو دل سے سنتے ہوں گے، ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہوں گے، اور آپس میں ایک دوسرے کے سامنے حضورؐ کے اقوال و اعمال کے چرچے کرتے ہوں گے۔ جہاں رسالت اور کسی قسم کے تقدس کا اعتقاد نہیں ہوتا وہاں بھی بڑے لوگوں کی باتوں اور حرکات و سکنات پر لوگ نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کے اقوال و اعمال کے چرچے کیا کرتے ہیں پھر کیونکر ممکن تھا کہ صحابہ کرام جس مقدس انسان کو خدا کا رسول اور اسلام کا مکمل نمونہ سمجھتے تھے اس سے صرف قرآن لے لیتے اور اس کے دوسرے تمام ارشادات اور اس کے تمام اعمال کی طرف سے کان اور آنکھیں بند کر لیتے۔

اس زمانہ میں فوٹو گرافی کے آلات نہ تھے کہ آنحضرت کی تمام حرکات و سکنات کے فلم لے لیے جاتے۔ نہ آواز بھرنے کے آلات تھے کہ آپ کی تقریروں کے ریکارڈ بھر کر رکھ لیے جاتے۔ نہ مکہ و مدینہ سے اخبارات نکلتے تھے کہ روزانہ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں اور آپ کے اعمالِ حیات کی رپورٹیں شائع ہوتیں۔ ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں۔ قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے اور بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحتِ نقل میں ممتاز تھے، اور ان کی یہ خصوصیت ایسی تھی کہ شاید ہمارے "حق گو" صاحب کے ذہن کریم کو بھی اس سے انکار نہ ہو۔ جو قوم ایام العرب، کلام جاہلیت، انساب قبائل حتیٰ کہ اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد کرتی ہو اور اپنی اولاد کو یاد کراتی ہو، اس سے بعید تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم الشان شخصیت کے حالات اور آپ کے ارشادات کو یاد نہ رکھتی اور آنے والی نسلوں تک انہیں منتقل نہ کرتی۔

پھر جب آنحضرت صلعم کا وصال ہوا تو فطری بات تھی کہ لوگوں میں آپکے احوال و اقوال کی جستجو اور زیادہ بڑھ جاتی۔ جو لوگ حضورؐ کی زیارت اور صحبت سے محروم رہ گئے تھے ان میں یہ شوق پیدا ہونا بالکل فطری امر تھا کہ آپ کے صحبت یافتہ بزرگوں سے آپؐ کے ارشادات اور آپؐ کے حالات پوچھیں۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی پیر مرد ایسا مل آتا ہے جس نے پچھلی صدی کے اکابر میں سے کسی نامور بڑے شخص کی صحبت پائی ہو تو لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اس کے حالات دریافت کرتے ہیں ہمارے ایک دوست نے شمالی ہندوستان سے حیدرآباد کا سفر اس غرض کے لیے کیا کہ اگر کوئی پرانا آدمی ایسا مل جائے جس نے سید جمال الدین افغانی کی صحبت پائی ہو تو اس سے سید صاحب کے حالات معلوم کریں۔ یہ معاملہ جب معمولی انسانوں کے ساتھ پیش آتا ہے تو کیا یہ ممکن تھا کہ خدا کے سب سے بڑے پیغمبر اور دنیا کے سب سے بڑے معلمؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں اس کے حالات پوچھنے اور اس کے ارشادات سے مستفید ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوتی؟ کیا تاریخ کے ان واقعات میں کوئی استبعاد ہے کہ لوگ جہاں کسی صحابی کی خبر پا لیتے وہاں سینکڑوں میل سے سفر کر کے جاتے اور آنحضرت صلعم کے حالات پوچھتے؟ یہی معاملہ یقیناً صحابہ کے بعد تابعین کے ساتھ پیش آیا ہوگا۔ کم از کم دو صدی تک سماعت حدیث اور نقل حدیث کا غیر معمولی شغف مسلمانوں میں پایا جانا یقینی ہے اور یہ بات نہ صرف قیاس کے عین مطابق ہے، بلکہ تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ منکرین حدیث قیاس یا عقل سے تو کام ہی نہیں لیتے۔ رہی تاریخ، تو وہ اس کے صرف اسی حصہ کو مانتے ہیں جس سے انکار حدیث کے لیے مواد مل سکتا ہو۔ اس کے سوا تاریخ کی جتنی شہادتیں ہیں سب ان کے نزدیک نامعتبر ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں انکار حدیث کے لیے ضد پیدا نہیں ہوئی ہے وہ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست شخصیت اور آپ کی تابناک پیغمبرانہ زندگی اتنی

ناقابلِ اعتنا تو نہ تھی کہ مسلمانوں میں کم ازکم دو سو برس تک بھی آپ کے حالات معلوم کرنے اور آپ کے ارشادات سننے کا عام شوق نہ رہتا۔ اس سے انکار کرنے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرونِ اولیٰ کے لوگوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اثر نہ تھا، اور وہ لوگ بھی آپ کی جانب کوئی توجہ نہ رکھتے تھے جو آپ کی رسالت کے قائل ہو چکے تھے۔ منکرینِ حدیث کو اختیار ہے کہ رسول کی ذات اور ان لوگوں کے متعلق جو آپ سے قریب تر تھے یہ یا اس سے بھی زیادہ بُری کوئی رائے قائم کر لیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان تو کجا، اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والا کوئی منصف مزاج غیر مسلم بھی اس رائے کو صحیح باور نہ کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ عہدِ رسالت سے دُور ہونے کے بعد مسلمانوں میں بیرونی اثرات بھی داخل ہونے لگے تھے، اور یہ اثرات بیشتر وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے جنہوں نے عراق، ایران، شام اور مصر میں مذہب اسلام قبول تو کر لیا تھا مگر قدیم مذاہب کے تخیلات ان کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا تھا جو اپنے دل سے گھڑ گھڑ کر باتیں نکالتا تھا اور محض لوگوں پر اثر قائم کرنے کے لیے ان باتوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ یہ دونوں باتیں تاریخ سے بھی ثابت ہیں اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہو گا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کیا درست ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں سب کے سب ایسے ہی لوگ تھے؟ سب جھوٹے اور بے ایمان تھے؟ سب ایسے منافق تھے کہ اسی ہستی پر بہتان گھڑتے جس کی رسالت پر وہ دن بھر میں کم ازکم پانچ مرتبہ گواہی دیا کرتے تھے؟ سب ایسے دشمنِ حق تھے کہ دنیا بھر کی خرافات لے کر رسول کے نام سے خدا کے دین میں داخل کرتے اور اس کی جڑیں کاٹتے؟ یہ نتیجہ نہ عقلاً نکالا جا سکتا ہے اور نہ تاریخ اس کی تائید کرتی ہے اور جب یہ صحیح نہیں ہے تو صداقت کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی

داخل ہونے لگا تھا جو موضوع تھیں، اور یہ کہ بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچی ہیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔

کھرے اور کھوٹے کی اس آمیزش کے بعد صحیح طریق کار کیا تھا؟ کیا یہ صحیح ہو سکتا تھا کہ آمیزش کی بنا پر صحیح اور غلط سب کو ایک ساتھ رد کر دیا جاتا، اور بعد کے مسلمان رسالت سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے؟ منکرینِ حدیث اس کو ایک آسان بات سمجھتے ہیں۔ مگر جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور رسول اللہ کی ذات کو اسوۂ حسنہ سمجھتے تھے، اور جن کے نزدیک حضورؐ کی پیروی کے بغیر ہدایت کا میسر ہونا ممکن نہ تھا، ان کے لیے ایسا کرنا بہت دشوار تھا۔ اتنا دشوار جتنا کسی کے لیے برضا و رغبت آگ میں کود پڑنا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے سب کو رد کر دینے کی بہ نسبت پہاڑ کھود کر جواہر نکالنے کی مشقت کو زیادہ آسان سمجھا۔ رسالت سے اپنا اور مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے کے لیے شب و روز محنتیں کیں۔ حدیثوں کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول بنائے۔ کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کیا۔ ایک طرف اصولِ روایت کے اعتبار سے حدیثوں کی تنقیح کی، دوسری طرف ہزاروں لاکھوں راویوں کے احوال کی جانچ پڑتال کی۔ تیسری طرف درایت کے اعتبار سے حدیثوں پر نقد کیا۔ اور اس طرح سنتِ رسول کے متعلق ان لوگوں نے ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا جس کے برابر مستند اور معتبر ذخیرہ آج دنیا میں گذشتہ زمانے کے کسی شخص اور کسی عہد کے متعلق موجود نہیں ہے۔ منکرینِ حدیث کو آزادی ہے کہ ان کی ساری محنتوں پر بیک جنبشِ قلم پانی پھیر دیں۔ منکرینِ حدیث کو اختیار ہے کہ دین کے ان سچے خادموں کو وضاعِ حدیث، پروردگانِ عجم، زلہ ربایانِ بنی امیہ و بنی عباسؓ اور جو کچھ چاہیں کہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان محدثین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ قیامت تک اس بار سے سبکدوش نہیں

ؔ یہ سب القاب "حق گو" صاحب نے ائمۂ حدیث کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔

ہو سکتے۔ اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے، یہ انہی عاشقانِ رسول کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس رسولِ اکرم اور صحابۂ کرام کے عہد کی پوری تاریخ اپنے جزئیات کے ساتھ موجود ہے اور وہ وسائل بھی ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ہم حدیث کے ذخیرے کی جانچ پڑتال کر کے آج بھی واقعات کی صحیح صحیح تحقیق کر سکتے ہیں۔ منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ بجز متواتر روایات کے (جو بہت کم ہیں) باقی جتنی احادیث ہیں یقینی نہیں ہیں، ان سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے، پھر ایسی چیزوں پر مذہب کا مدار رکھنا کیا معنی؟ ہم کہتے ہیں کہ مشاہدۂ عینی اور تجربۂ حسی کے سوا دنیا میں کوئی ذریعہ بھی ایسا نہیں ہے جو مفید ہو سکتا ہو۔ تواتر کو بھی محض اس قیاس کی بنا پر یقینی سمجھا جاتا ہے کہ بہت سے آدمیوں کا جھوٹ پر متفق ہو جانا مستبعد ہے۔ لیکن خبرِ متواتر کے لیے جو شرائط ہیں وہ بہت کم ایسی خبروں میں پائی جاتی ہیں جن پر تواتر کا گمان ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر امورِ غیب میں خواہ زمانۂ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں یا حال سے، ہمارے علم اور ہمارے فیصلوں کا مدار اسی ظنِ غالب پر ہے جو کم از کم دو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خود قرآن نے اسی ظنی شہادت کو اتنا معتبر قرار دیا ہے کہ اس کی بنا پر ایک مسلمان کا خون مباح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی رُو سے مسلمان کا خون اتنا محترم ہے کہ جو کوئی مسلمان کو عمداً قتل کر دے اسے خلود فی النار کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح زنا، قذف اور سرقہ کی حدود میں بھی ایسے اہم فیصلہ جات کا مدار صرف دو یا چار شہادتوں پر رکھا گیا ہے جن سے ایک مسلمان کا ہاتھ کاٹ دیا جا سکتا ہے، یا ایک مسلمان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جا سکتے ہیں۔ پس جب قرآن مجید میں غیر متواتر شہادتوں ہی پر پورے نظامِ عدل کی بنیاد رکھی گئی ہے تو قرآن کے مقابلہ میں کس مسلمان کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ کسی حدیث کو حدیثِ رسول مان لینے کے لیے ہر مرتبہ اسناد میں دو چار راویوں کا ہونا کافی نہیں ہے؟ البتہ راویوں میں سے ہم ہر راوی پر اعتماد

نہ کریں گے، جس طرح شاہدوں میں سے ہر شاہد کا اعتبار نہیں کرتے۔ ہم حکمِ قرآن کے بموجب ذَوَا عَدْلٍ کی شرط لگاتے ہیں اور اسی کی تحقیق کے لیے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا گیا، تاکہ راویوں کے حالات کی تحقیق کی جائے۔ اسی طرح ہم راویوں پر جرح بھی کریں گے کہ حدیث کے جوہری نکات میں ان کے درمیان ایسا اختلاف تو نہیں ہے جو ان کے بیان کی صحت کو مشکوک کر دیتا ہو؟ اسی طرح ہم درایت سے بھی کام لیں گے جیسے ایک جج مقدمات میں درایت سے کام لیتا ہے۔[1] مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اسی طرح درایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصولِ درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصولِ اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو، اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ پھر جس طرح ایک معاملہ میں دو قاضیوں کا اجتہاد مختلف ہوتا ہے اور جس طرح قرآن مجید کے معانی میں دو فاضلوں کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں، اسی طرح دو محدثوں کی درایت میں بھی اختلاف ممکن ہے۔ خدا نے ہم کو انسانی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا مکلف قرار نہیں دیا ہے۔ اختلافِ رائے انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہے، اور اس کی وجہ سے نہ قرآن چھوڑا جا سکتا

---

[1] فنِ حدیث میں درایت کی حیثیت وہی ہے جو قانون میں جج کی رائے اور قوتِ فیصلہ کی ہے۔ جس طرح جج ہر گواہ کے بیان کو یونہی قبول نہیں کر لیتا بلکہ اس کو مختلف پہلوؤں سے جانچ کر رائے قائم کرتا ہے اسی طرح ایک محدث بھی ہر روایت کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتا بلکہ جانچ پڑتال کر کے اس کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔

ہے، نہ حدیث، اور نہ عدالت کی کرسی۔ پس ایک حدیث کے متعلق جس حد تک تحقیق انسان کے بس میں ہے، اس کا سامان محدثین نے فراہم کر دیا ہے۔ ہمارا کام اس سامان سے فائدہ اٹھا کر صحیح کو غلط سے ممتاز کرنا اور صحیح کا اتباع کرنا ہے۔ نہ یہ کہ صحیح و غلط کے اختلاط کو دیکھ کر سرے سے رسالت ہی سے قطع تعلق کر لینا۔

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ہم حدیث کو صرف تاریخ کی حیثیت سے لیں گے، حجت شرعی نہ بنائیں گے۔ مگر کیا ان حضرات نے رسول کی تاریخ کو سکندر اور نپولین کی تاریخ سمجھا ہے کہ اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو؟ کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ اس انسان کی تاریخ ہے جس کا اتباع فرض ہے، جس کی اطاعت پر نجات کا مدار ہے، جس کی سیرت مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے؟ اس ذات پاک کی تاریخ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی، یا صحیح ہو گی یا غلط۔ اگر غلط ہے تو اس کو لینا کیا معنی نذر آتش کر دیجیے۔ رسول پر بہتان اور آپ اس کو تاریخ کی حیثیت سے قبول کریں؟ اور اگر وہ صحیح ہے تو اس کا اتباع فرض ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی پیروی سے آپ بچ کہاں سکتے ہیں؟

منکرین حدیث کے مقالات پر نظر کرتے ہوئے انکار حدیث کے دو وجوہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام کے نظام دینی میں سرے سے حدیث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف قرآن کافی ہے۔

دوسرے یہ کہ احادیث ناقابل اعتبار ہیں۔

ان میں سے پہلی وجہ کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ رہی دوسری وجہ، تو اس کی غلطی بھی اشارۃً گذشتہ صفحات میں ظاہر کی جا چکی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس شبہ کو بھی تفصیل کے ساتھ رفع کر دیا جائے۔ احادیث کو ناقابل اعتبار سمجھنے کی اصل وجہ وہم اور شک کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔ انسان کی فطرت میں شک کا مادہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ بحث و تحقیق اور تلاش و تجسس کے لیے محرک ہو اور

حقیقت کی جستجو پر انسان کو ابھارے۔ لیکن ہر چیز کے لیے ایک حد ہوتی ہے جس سے گھٹنے یا بڑھ جانے پر وہ مستحسن نہیں رہتی۔ شک کا مادّہ اگر اتنا بڑھ جائے کہ وہ تحقیق کے ان طریقوں سے جو انسان کے امکان میں ہیں، اس کو مطمئن نہ ہونے دے اور ان تمام باتوں سے انکار پر آمادہ کر دے جو تحقیق کے ایک غیر ممکن الحصول معیار پر پوری نہ اترتی ہوں تو یہ بھی ایک مذموم صفت ہے جس کو ہم اردو زبان میں "وہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے، اور علم یقین کے بغیر ہر بات کو ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا بلکہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر میں نے آج تک کبھی کسی شخص کو سانپ کے کاٹے سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ مجھے سانپ نے کاٹا کہ اس کے مہلک ہونے کا مجھے علم یقین حاصل ہوتا۔ میں نے صرف لوگوں سے یہ سنا ہے کہ جب سانپ کاٹتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ میں اس روایت پر یقین رکھتا ہوں، اور سانپ کو دیکھ کر اس سے بچ جاتا ہوں۔ لیکن اگر میں اس روایت میں شک کروں اور کہوں کہ جب تک سانپ میرے سامنے کسی کو نہ کاٹے اور اسی کی تاثیر سے وہ میرے سامنے مر نہ جائے یا جب تک سانپ خود مجھ کو نہ کاٹے اور میں اس کے زہر سے نہ مر جاؤں، اس وقت تک میں یقین نہ کروں گا کہ سانپ مہلک ہوتا ہے، تو میرے اس شک کا جو کچھ انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ تو خیر روایت متواترہ کی مثال ہے جس کے مفیدِ یقین ہونے کو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبارِ آحاد (یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں) کو تسلیم کرتے ہیں، اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی حیثیت سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے، مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو

ترجیح دینے کے لیے محض خبر کے ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے، بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں، اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبرِ واحد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے سے مل ہی نہیں سکتا، نفسِ خبر ہونے کی حیثیت سے صدق و کذب کا یکساں احتمال ہے۔ لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار، کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا خواہ واقعہ کے اعتبار سے اس کا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی ہم اسی طرح اخبار احاد کی امکانی جانچ پڑتال کرکے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں، اور اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے، لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے۔ ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اور اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں، بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے۔ قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گزرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے اور بہت کم واقعات بلکہ شاذونادر ایسے ہوتے ہیں جن میں شہادتیں تواتر کی حد کو پہنچتی ہوں۔ بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف "اخبار احاد" پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار، اور قیاسِ عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے۔ اور جب کوئی پہلو راجح ہو جاتا ہے تو اس پر وہ اس طرح فیصلہ کرتا ہے جیسے اس کے نزدیک واقعہ یقین کی حد تک ثابت ہو گیا ہے۔ اگر کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا

اور ہر شہادت کو غلط فرض کر کے اپنا کام شروع کرے، اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے اس بات پر اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے، یا متواتر روایات اس تک پہنچیں، تو یقیناً چند ہی ساعتوں میں اس کو عدالت کی کرسی چھوڑ دینی پڑے گی۔

اسی طرح تجارت، تدبیر سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبار احاد پر ہمارے معاملات چلتے ہیں بلکہ بہت سی خبریں تو ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعہ سے ملتی ہیں جن کی صحت میں عقلاً بہت سے شکوک و شبہات کی گنجائش نکلتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہم کو تار دیا ہے وہ درحقیقت وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے۔ اور اگر تار فی الواقع اسی کا دیا ہوا ہے تب بھی ہم کو نہیں معلوم کہ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ اسے کس ذریعہ سے معلوم ہوئی؟ اور اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اس قسم کے بہت سے احتمالات ہر تار کی خبر میں ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار انہی خبروں پر چلتا ہے وہ ان احتمالات کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ محض ظاہری قرائن سے یہ جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے ایجنٹ کا دیا ہوا ہے یا نہیں، اور جب ایک ظن غالب ان کو حاصل ہو جاتا ہے تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔

یہی صورت مذہبی معاملات میں بھی ہے۔ سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے اور وہ گواہ ذات رسالت پناہ ہے۔ نفس خبر ہونے کے لحاظ سے اس میں بھی صدق و کذب کا احتمال ہے۔ لیکن خبر جس گواہ نے دی ہے اس کی راست بازی، دیانت اور پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر اور جو خبر اس نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم کذب کے پہلو پر صدق کے پہلو کو راجح قرار دیتے ہیں، اور پھر یہی ترجیح ایمان بن کر ہمارے قلب میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ کذب کا تصور تک آنے نہیں پاتا۔ لیکن دوسری

طرح بہت سے لوگ ہیں جنہیں اس شاہد امین کی شہادت میں شک ہے ، اور اسی شک کی بنا پر وہ اس کی تصدیق سے انکار کر رہے ہیں۔ ہم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ایک راست باز گواہ کی گواہی کو تسلیم کیا اور مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے اس کی گواہی میں شک کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وحی اُترتے ہوئے نہ ہم نے دیکھی اور نہ انہوں نے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بالعموم اوسط درجہ کے انسان اپنی زندگی کے معاملات میں نہ اتنے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں کہ ہر خبر کو بلا تحقیق و تفتیش قبول کر لیں، اور نہ اتنے شکی اور وہمی ہوتے ہیں کہ ہر خبر کی صحت اور ہر راوی کی صداقت میں شبہ کریں اور ہر معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لیے اس علم یقین کا مطالبہ کریں جو صرف تجربہ و مشاہدہ یا روایت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان عقل سلیم اور معتدل فطرت رکھنے والے انسانوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ خبروں اور روایتوں کو امکانی ذرائع تحقیق سے کام لے کر جانچتے ہیں اور اس جانچ پڑتال میں اگر ان کے غلط ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) ہوتا ہے تو انہیں رد کر دیتے ہیں، اور اگر ان کے صحیح ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو قبول کر کے انہیں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ تحقیق اور جانچ پڑتال کا معیار بھی تمام خبروں کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کے سخت اور نرم ہونے کا انحصار خبر کی نوعیت اور اس معاملہ کی اہمیت پر ہوتا ہے جس سے اس خبر کا تعلق ہو۔

یہ تو اس مسئلہ کی علمی حیثیت تھی۔ اب اگر آپ عقلی حیثیت سے بھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہی اعتدال کا طریقہ عین مطابق عقل ہے۔ اور اس کے خلاف ضعیف الاعتقادی اور وہمی پن دونوں خلاف عقل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل کے نزدیک ہر واقعہ میں شک کرنا ممکن ہے، حتیٰ کہ محسوسات اور مشاہدات تک میں بھی شک کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر فعل جو کیا جا سکتا ہو اس کا کرنا عقل کے نزدیک درست اور احسن بھی ہو۔ مزید برآں عقل ہر خبر کے متعلق صرف

یہ حکم لگاتی ہے کہ اس میں صدق اور کذب کا یکساں احتمال ہے، یعنی محض خبر ہونے کی حیثیت سے وہ سچ اور جھوٹ ہونے کا مساوی امکان رکھتی ہے اور جب تک کوئی معقول وجہ کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لیے موجود نہ ہو کسی خبر کو نہ سچ کہا جا سکتا ہے اور نہ جھوٹ۔ لیکن کوئی خبر ہم کو محض خبر ہونے کی حیثیت سے نہیں پہنچتی، بلکہ اس کے ساتھ لازماً بہت سے ایسے قرائن بھی ہوتے ہیں جن سے تصدیق یا تکذیب کی جانب پلڑا ضرور جھکتا ہے۔ خالص شک کا مقام یعنی جہاں نہ تصدیق ہو اور نہ تکذیب، ایک ایسا باریک مقام ہے کہ انسان کا ذہن چند لمحے بھی اس پر نہیں ٹھیر سکتا۔ اس لیے ہر خبر کو سنتے ہی ذہن فوراً ایسے وجوہ تلاش کرنے لگتا ہے جن سے مدد لے کر وہ شک کے مقام سے تصدیق یا تکذیب کی طرف پھر جائے۔ پھر یہ بات بالکل ذہن کے سلیم یا مریض ہونے پر موقوف ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو معقول وجوہ کے ساتھ ترجیح دیتا ہے یا غیر معقول وجوہ کے ساتھ۔ کسی خبر کا متواتر نہ ہونا، یا خبر واحد ہونا عقلاً اس کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ مجرد اسی بنیاد پر اس کے غلط ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔ نہ یہ بات کسی خبر کو جھوٹ قرار دینے کے لیے کافی اور معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ بہت قدیم زمانے سے متعلق ہے اور ہم تک بہت سے واسطوں سے پہنچی ہے، نہ کوئی صاحب عقل آدمی یہ فرض کر سکتا ہے کہ ہر مخبر جھوٹا ہوتا ہے اور دنیا کے تمام مخبر آپس میں متفق ہو کر جھوٹی خبریں دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس قسم کے تمام مفروضات جو تکذیبی ذہنیت سے دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ ہر خبر کی تکذیب کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں، قطعاً خلاف عقل ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس جن مفروضات کی بنا پر ہر خبر اور ہر مخبر کی تصدیق کی جاتی ہے وہ بھی عقل کے مطابق نہیں ہیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان صحیح راستہ جو ایک سلیم الفطرت ذہن اختیار کرے گا وہ یہی ہے کہ وہ مجموعاً تمام خبروں کی نہ تصدیق کرے گا اور نہ تکذیب، بلکہ وہ

ہر خبر کو فرداً فرداً لے کر اس کے مخصوص حالات کے لحاظ سے تحقیق و تفتیش کے ایک خاص معیار پر جانچے گا، اور جب اس تحقیق کے ذریعہ سے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف گمان غالب حاصل ہو جاتے گا تو اسی پہلو کا حکم لگا دیگا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کسی خبر کی تحقیق کا سخت سے سخت قابلِ عمل معیار کیا ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے زید نام کا ایک شخص اب سے سو برس پہلے گزرا ہے، جس کے متعلق عمرو ایک روایت آپ تک پہنچاتا ہے۔ آپ کو تحقیق کرنا ہے کہ زید کے متعلق یہ روایت درست ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لیے آپ حسبِ ذیل تنقیحات قائم کر سکتے ہیں۔

(۱) یہ روایت عمرو تک کس طریقے سے پہنچی؟ درمیان میں جو واسطے ہیں ان کا سلسلہ زید تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ درمیانی راویوں سے ہر راوی نے جس شخص سے روایت کی ہے اس سے وہ ملا بھی تھا یا نہیں۔ ہر راوی نے روایت کس عمر اور کس حالت میں سنی؟ روایت کو اس نے لفظ بلفظ نقل کیا یا اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا؟

(۲) کیا یہی روایت دوسرے طریقوں سے بھی منقول ہے۔ اگر منقول ہے تو سب بیانات متفق ہیں یا مختلف؟ اور اختلاف ہے تو کس حد تک؟ اگر کھلا ہوا اختلاف ہے تو مختلف طریقوں میں سے کونسا طریق روایت زیادہ معتبر ہے؟

(۳) جن لوگوں کے واسطے سے یہ خبر پہنچی ہے وہ خود کیسے ہیں؟ جھوٹے یا بد دیانت تو نہیں؟ اس روایت میں ان کی کوئی ذاتی یا جماعتی غرض تو مخفی نہیں؟ ان میں صحیح یاد رکھنے اور صحیح نقل کرنے کی قابلیت تھی یا نہیں؟

(۴) زید کی افتادِ طبع، اس کی سیرت، اس کے خیالات، اور اس کے ماحول کے متعلق جو مشہور و متواتر روایات یا ثابت شدہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں یہ روایت ان کے خلاف تو نہیں ہے؟

(۵) روایت کسی غیر معمولی اور بعید از قیاس امر کے متعلق ہے یا معمولی اور قرین قیاس امر کے متعلق؟ اگر پہلی صورت ہے تو کیا طرق روایت اتنے کثیر، مسلسل اور معتبر ہیں کہ ایسے امر کو تسلیم کیا جا سکے؟ اور اگر دوسری صورت ہے تو کیا روایت اپنی موجودہ شکل میں اس امر کی صحت کا اطمینان کرنے کے لیے کافی ہے؟

یہی پانچ پہلو ہیں جن سے کسی خبر کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ ان سوالات کے متعلق اگر ذرائع تحقیق ہمارے پاس موجود ہوں، اور ان ذرائع سے کوئی خبر تحقیق کے معیار پر پوری اُتر جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی تکذیب کریں اور اگر کوئی خبر اس معیار پر پوری نہ اُترے تو ہم کو حق ہے کہ خواہ اس کی تکذیب کریں یا اس کو رد کر دیں۔ لیکن اگر ذرائع تحقیق موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص فرداً فرداً ہر خبر کو جانچنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے تمام خبروں کو مجموعاً محض اس بنا پر رد کر دے یا جھوٹ قرار دے کہ ان میں بعض جعلی خبریں مل ہوئی ہیں، یا بعض راویوں کی کمزوریاں ثابت ہیں، یا بعض اس شخص کی عقل میں نہیں سماتیں، تو اس سے بڑھ کر غیر معقول طرز عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس تمہیدی بیان نے معاملہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ذات رسالت پناہ کے اسوۂ حسنہ اور سنتِ مطہرہ سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہ چاہتا ہو، تو یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اگر وہ آں حضرت کی تقلید ضروری سمجھتا ہے اور اسے واقعی یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ نے اپنی ۲۳ سال کی حیات نبوی میں کس طرح زندگی بسر کی؟ کون سے افعال کیے؟ کن افعال سے اجتناب کیا؟ کن باتوں کو جائز رکھا؟ کن باتوں سے منع فرمایا؟ تو لامحالہ اس کو حدیث کے ذخیرے کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہاں وہ دیکھے گا کہ اس وقت بھی دنیا میں کم و بیش چار پانچ لاکھ آدمی ایسے موجود ہیں جن کے پاس حدیث کی کتابیں امام مالک، امام محمد، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث سے سلسلہ بہ سلسلہ پہنچی ہیں۔ اس لیے اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں

کہ یہ کتابیں انہی بزرگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ پھر اس میں بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان بزرگوں نے ہر حدیث کی جو سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام تک پہنچائی ہے، وہ کم از کم ان کی تحقیق کے لحاظ سے درست تھی۔ لہٰذا ان کتابوں کے ذریعہ سے حدیث کا وہ علم قریب قریب یقینی طور پر ہم تک پہنچ گیا ہے جو پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے ائمہ حدیث کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے متعلق وہ تمام معلومات بھی معتبر کتابوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ گئی ہیں جن سے کام لے کر ان محدثین نے حدیثوں اور ان کے راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی تھی۔ اوپر ہم نے ایک خبر کی تحقیق کے لیے جو تنقیحی سوالات قائم کیے ہیں ان میں سے ہر سوال کا مفصل جواب قریب قریب ہر حدیث کے متعلق ہم کو ان کتابوں میں مل جاتا ہے۔ پھر محدثین کے درمیان احادیث اور ان کی تحقیق کے بارے میں جو اختلاف آراء ہوتے ہیں وہ بھی تمام دلائل اور وجوہ کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس وسیع، مفصل اور زیادہ سے زیادہ امکانی وثوق رکھنے والے ذخیرے کے موجود ہوتے ہوئے کوئی صاحب عقل انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی واقعہ اور آنحضرت کا کوئی ارشاد آج دنیا میں صحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کو سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت سے لے کر ہمارے زمانے تک جو لاکھوں سے متجاوز اور کروڑوں تک پہنچتے ہوئے مسلمان احادیث نبوی کے نقل کرنے اور سننے سنانے میں مشغول رہے ہیں وہ سب کے سب، یا ان میں سے اکثر جھوٹے تھے اور انہوں نے بالاتفاق یہ طے کر لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت گھڑنے اور اس طریقے سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کو تباہ و برباد کرنے ہی میں اپنی ساری عمر بسر کریں گے۔ اگر کوئی منکر حدیث اس امر کا ثبوت رکھتا ہے تو وہ اس کو پیش کرے۔ ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ ساری دنیا کے محققین اور مکتشفین کے کارنامے اس کی اس نادر

تحقیق کے سامنے دب جائیں گے۔ لیکن اگر اس کے پاس بدگمانی اور جھوٹے الزامات اور کل پر بعض کا حکم لگانے کے مغالطہ انگیز اور خلافِ عقل و دیانت طریقوں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہو تو اسے کم از کم یہ امید تو نہ رکھنی چاہیے کہ جن لوگوں کی عقل درست ہے اور جو فطرتِ سلیمہ سے بہرہ ور ہیں، وہ بھی اس کے دعویٰ کو تسلیم کر کے حدیث کی ساری خبروں کو مجموعی حیثیت سے غلط اور قابلِ رد قرار دے دیں گے۔

ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمہ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہیے یا ان کو غلطی سے مبرا سمجھنا چاہیے۔ نہ کبھی ہم نے یہ دعویٰ کیا کہ ہر کتاب میں جو روایت قال رسول اللہ سے شروع ہو اس کو آنکھیں بند کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیثِ رسول قرار دینے کی ذمہ داری ایک گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرأت کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ اور تحقیق و اجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے اور کسی خاص عہد کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جن لوگوں نے فنِ حدیث کی تحقیق اور اس کے باقاعدہ مطالعہ اور تحقیقات میں پورا ایک مہینہ بھی صرف نہیں کیا ہے وہ ان بزرگوں کے کارناموں پر تنقید کریں جنہوں نے پوری پوری عمریں اس فن کی خدمت میں بسر کر دی ہیں۔ صرف ایک فنِ حدیث ہی پر موقوف نہیں ہے دنیا کا کوئی علم و فن بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس میں ہر تدبیر اور اناڑیوں کو ریسرچ اور ماہرانہ اظہارِ رائے اور مجتہدانہ کلام کا حق دیا جاتا ہو۔ یہ حق انسان کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فن کے مبادی اور اصول پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہو، اور جتنا ذخیرۂ معلومات اس فن کے متعلق موجود ہو وہ سب اس کی نظر میں ہو۔ باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس

مرتبہ پر نہیں پہنچا ہے تو اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمہ فن کی تحقیقات
اور ان کی آرا کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی
طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے
ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لیے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔

("ترجمان القرآن" صفر ۵۳ھ۔ جون ۳۴ء)

مسلکِ اعتدال

کسی مسلمان کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امورِ دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریقِ نبوی کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضورؐ سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو تواتر کے ساتھ آیا ہے، خواہ وہ تواتر عملی ہو یا خبری دوسرا حصہ وہ ہے جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ان میں سے پہلے حصہ کے متعلق تمام امت کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصہ تو اصولاً اس کو سب ظنی مانتے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ مفید علم ضروری ہے۔ مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبارِ احاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتے؟ اس مسئلہ میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے، اس لیے وہ من حیث الکل رد کر دینے کے لائق ہے، کیونکہ جو چیز ظنی ہے وہ ثابت شدہ نہیں اور جو ثابت شدہ نہیں وہ لائقِ اتباع نہیں۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی مظنون چیز ثابت شدہ

نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت شدہ نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرماتیے کہ "یقینیات" دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور مظنونات کو من حیث الکل رد کر دیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کر کے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے، اسی درجہ کی غلطی ان کو من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے۔ عقل سلیم کا اقتضا یہ ہے اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے کہ تمام مظنونات کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے۔ ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کونسی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے۔ جو چیز بعید ہو اسے رد کر دو۔ جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرو۔ اور جو چیز قریب یا اقرب ہو اس کو بلحاظ اس کے درجہ کے قبول کر لو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے اس لیے اسی کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔ کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلافِ حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی برائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکلیہ اجتناب واجب ہے، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین وحی کے خلاف ہو، یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اختیار کیا جائے، وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکلیہ رد کر دینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے، اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ

اس سے اصولی احکام کی اصل اسپرٹ کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔
نیز اس میں یہ بڑی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی
تو لامحالہ انفرادیت راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق
جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا۔ اور کوئی قوت ایسی باقی نہ رہے گی جو تفرقہ و
انتشار اور اختلافِ عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔
مثال کے طور پر ایک نماز جمعہ ہی کو لیجیے۔ ہمارے پاس علم یقین کے جو ذرائع ہیں
ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف یہ ہدایت دیتا ہے
کہ "جب نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو"۔ دوسرا
ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دُور آگے لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔
وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے، اس کے
لیے جماعت شرط ہے، اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے، اس کی رکعتیں دو
ہیں، اور اس کے لیے اذنِ عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جتنے عملی
جزئیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم
نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبار احاد کو بہ حیثیت مجموعی رد کر دینے کا اصول
اختیار کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کریگا،
اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری
رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جا سکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی
پیروی لازم ہو جائے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے جزئیات میں کتنی افراتفری
برپا ہوگی، نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا اور کس طرح بعض صورتوں
میں مقاصد شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار احاد سے جو تفصیلات
معلوم ہوتی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذہب نکلتے ہیں مگر اول تو
ان میں بمشکل پانچ سات مذاہب نکلنے کی گنجائش ہے اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان سب
پر کم از کم اسی ایک یا دو تر اقتدار کی سند حاصل ہے جس کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور جس کی قوت سے

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے بخلاف اس کے اخبار احاد کو بالکلیہ رد کر دینے کے بعد بے شمار مذاہب کی گنجائش نکل آتی ہے اور ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں تو وہی مسلمانوں کو ایک جزئیہ میں ایک طریقہ پر جمع کر دے۔ نتیجہ اس کا بالکل ظاہر ہے۔ جمعہ کی قوت جامعہ ختم ہو کر رہ جائے گی، اختلافِ عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دے گا جس کے لیے اقامتِ جمعہ فرض کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے نظامِ شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور جو چیز مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم ہے جو ہم کو اخبار احاد سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی، آپ کے اخلاق، آپ کی عادات، آپ کا طریق عبادت، آپ کا طرز تعلیم و تبلیغ، آپ کا طرز عدالت، آپ کے قانونی فیصلے، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرزِ عمل، پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ اور اہل بیتؓ اور تابعین کے آثار یہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں اور اسی نقشہ پر اسلام ایک مکمل نظامِ حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار احاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا یہ عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے۔ پھر اسلام محض ایک ڈھانچہ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا، جس کی شکل اور جس کے خدو خال کو جو شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظامِ جماعت قائم ہی نہ ہو سکے گا، کجا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو دراصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی

حدود میں اپنی اہواء اور خواہشات کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے، اس لیے انہوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اس چیز کو ہی مٹا دو جو اس نظام کی حد بندی کرتی ہے، پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوست چڑھائیں اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنا دیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے ان حدیثوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں، یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے، یا جو صریح عقل کے خلاف ہیں، یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان چند افراد سے یہ لوگ پورے مجموعہ کے غلط اور قابلِ رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بدمعاشی سے پوری قوم کی بدمعاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت بلحاظ متن اور بلحاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جُدا جُدا تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کر دینے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لے کر پورے مجموعے کے متعلق ایک ہی رائے قائم کر لینا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں، وہاں ایک کثیر تعداد ایسی حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے لبریز ہیں، جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حِکَم پر بہترین روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ حق پرست اور انصاف پسند ہوں تو انہیں نظر آئے کہ محدثین کرام نے عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کے آثار و اخبار جمع کرنے اور ان کو چھانٹنے اور ان کی حفاظت کرنے میں وہ محنتیں کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے

کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دورِ گذشتہ کے حالات کی تحقیق کے ان سے بہتر طریقے عقلِ انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ کسی دورِ تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شاملِ حال رہی ہے، اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اسی نے اپنے آخری نبی کے نقوشِ قدم اور آثارِ ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یہ تو اس گروہ کے متعلق تھا جو احادیث کی اصولی ظنیت کی بنا پر انہیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے، ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابلِ اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں۔ ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے، ٹھیک اسی معیار کی ہم

بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر، مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سر مُو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہر حال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب ان کو جس بنا پر حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا، اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمالات کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد اور دوسرے بلحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کے جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ

میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں، تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" عطا اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے۔ اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں مَا رَأَيْتُ أَنْقَضَ لِعُرَى الْإِسْلَامِ مِنْ أَهْلِ مَكَّةَ۔ حالانکہ مکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ "ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے" ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ مسروق سے ملا تک نہیں" ضحاک کو دیکھیے۔ ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں" سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا

الزام رکھتے ہیں اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لَا تَکْذِبْ عَلَیَّ کَمَا کَذَبَ عِکْرَمَۃُ عَلَی ابْنِ عَبَّاسٍ۔ امام مالک کی جلالت شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ ذَالِکَ دَجَّالُ الدَّجَاجِلَۃِ۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علمائے عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ اَنْزِلُوْھُمْ مَنْزِلَۃَ اَھْلِ الْکِتَابِ لَا تُصَدِّقُوْھُمْ وَلَا تُکَذِّبُوْھُمْ۔ امام ابو حنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں، اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن مبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں، ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا"۔ یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابو عثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ لَیْسَ بِثِقَۃٍ۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سنا کہ ابو ہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابو ہریرہؓ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں، وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ شَاھِدٍ وَّمَشْھُوْدٍ کے معنی پوچھے گئے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقعہ پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن صامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔[1]

---

[1] یہ تمام مثالیں علامہ ابن عبد البر کی کتاب جامع بیان العلم سے ماخوذ ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور اس کی نیک نیتی اور صحتِ ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے، اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیاتِ متعلقہ کو محفوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباطِ مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فنِ رجال کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سُن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے

علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جاتے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے، مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا۔ اس لیے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں، رہا فقیہانہ نقطۂ نظر (یعنی متنِ حدیث پر غور کر کے یہ رائے قائم کرنا کہ وہ قابلِ قبول ہے یا نہیں) تو وہ ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ معنی کے اعتبار سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنیً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ امورِ شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن و اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہائے مجتہدین نے رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلکِ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمۂ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور

منقطع احادیث پر مبنی ہیں، یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے کہ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کر دیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں، چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ۷۰ مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے۔ نہیں، بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا، بلکہ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا

ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے، اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں ان کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اس کی روح روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لیے کہ اس کی نظر اس اُفتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے، اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں۔ پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیۃً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے

ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کرجاتا ہے۔ اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں، اور انہوں نے ہمیشہ اپنے تبعین کو ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ مَقَالَتَنَا حَتّٰی یَعْلَمَ مِنْ اَیْنَ قُلْنَا۔[1] امام زفرؒ کا قول ہے اِنَّمَا نَاْخُذُ بِالرَّاْیِ مَا لَمْ نَجِدِ الْاَثَرَ فَاِذَا جَاءَ الْاَثَرُ تَرَکْنَا الرَّاْیَ وَاَخَذْنَا بِالْاَثَرِ۔[2] امام مالکؒ کا ارشاد ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِیُٔ وَاُصِیْبُ فَانْظُرُوْا فِیْ رَاْیِیْ فَکُلَّمَا وَافَقَ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَخُذُوْہُ وَکُلَّمَا لَمْ یُوَافِقِ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَاتْرُکُوْہُ۔[3] امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَاضْرِبُوْا بِقَوْلِیَ الْحَائِطَ[4] اور لَا قَوْلَ لِاَحَدٍ مَعَ سُنَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔[5] غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ

---

[1] کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک کہ وہ تحقیق نہ کرے کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔

[2] جب ہم کو کوئی حدیث نہیں ملتی تو ہم اپنی رائے سے فیصلہ کرتے ہیں جب حدیث مل جاتی ہے تو رائے کو چھوڑ کر حدیث کو لے لیتے ہیں۔

[3] میں ایک انسان ہوں، غلطی بھی کرتا ہوں اور صحیح رائے بھی قائم کرتا ہوں۔ لہٰذا تم میری رائے کو نظر تحقیق سے دیکھو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔

[4] جب حدیث صحیح تمہیں مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔

[5] سنت رسول کے مقابلے میں کسی کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔

میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

(ترجمان القرآن ۔صفحہ ۵۶ ۔مئی ۳۷ء)

استدراک:۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے اس پر جو اعتراضات ہوئے ہیں، اور ان پر میری طرف سے جو جوابات دیئے گئے ہیں ان کو یہاں نقل کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک اہلحدیث دوست کے سوالات :۔

اُ۔مسلمانوں کا چاروں فقیہوں کو ماننا کس نص کے ماتحت ہے ؟

ب۔اسنادِ حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے ؟

ج۔تفقہِ مجتہد اور اسنادِ حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنیت ہے ؟

د۔محدث اور فقیہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں۔اور اسے بڑے محدث یا بڑے فقیہ پر فضیلت ہے یا نہیں ؟

ذ۔کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابو حنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد حدیث کو چھوڑا ہو۔

س۔کیا یہ قولِ ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابل قبول ہے صحیح ہے ؟

ص۔درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسنادِ صحیح رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جاتے ؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے ؟

ط۔کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا اور رسول کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کیے

اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جبکہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب :۔ ا۔ چاروں فقہوں کو برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چار فقہی مذاہب کتاب وسنت سے استنباط کرنے کے ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباطِ مسائل میں کام لیا تھا۔

ب :۔ اسنادِ حدیث اور تفقہِ مجتہد میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ اسنادِ حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے، وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے۔ اور تفقہِ مجتہد ایک ایسے شخص کی تحقیقی رائے (RESEARCH) ہے جو کتاب وسنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابلِ قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظامِ شریعت میں کہاں تک نصب (FIT) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (UNFIT) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے، یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہر حال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلہ پر مقدم ہوتی ہیں، اسی طرح محدث کی شہادت اور فقیہ کی اجتہادی تحقیق، دونوں میں سے کسی کو بھی مطلقاً دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

ج - تفقہ مجتہد میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسنادِ حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہاد اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کر کے حکمِ شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکمِ شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د - ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہو سکتا ہے اور ایسا شخص نِرے محدث یا نِرے فقیہ کے مقابلہ میں اصولاً قابلِ ترجیح ہے۔ لیکن میرا جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے۔ کسی شخصِ خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظِ حدیث میں ہے۔

ہ :- اس وقت میرے پیشِ نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے، اور ویسے بھی نظیریں پیش کرنے سے بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

ص - ائمۂ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب و سنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں ان کے ساتھ اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

ص - درایت سے مراد فہمِ دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ "حذاقت" کا فنِ طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنہیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب و سنت میں حاصل ہوئی ہو، کام نہ لیں تو

میرے نزدیک گنہگار ہوں گے۔

میرے نزدیک کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت اور فقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا معیار بتا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحب فن کی فنی مہارت کا کوئی نپا تلا معیار نہیں قائم کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معیّن نہ کیے جا سکنے کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضم ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے۔ لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعیّن کرنے میں بھی غلطی کر کے ویسا ہی مجرم ہو گا۔ لیکن شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ممکنات کی حد تک ہی اس پر بار ڈالتی ہے اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

ایک دوسرے اہلحدیث دوست کا عنایت نامہ:۔

"فقہی جزئیات کی تفصیل میں کتاب و سنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر روایتِ نبوی اور درایتِ مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابلِ برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکارِ حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے۔ خود اکابرِ حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ نیز امام ابو حنیفہؒ نے بھی اس قسم کے عقیدہ و خیال سے تبرّی اور بیزاری ظاہر کی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی۔"

جواب:- آپ کا یہ فقرہ کہ "اصولی طور پر روایتِ نبوی اور درایتِ مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا یقیناً میرے مسلک کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اور پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "بعض حالات میں یہ معاملہ انکارِ حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے" بے انصافی کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ آپ خود ہی انصاف سے غور فرمائیں کہ اسی کتاب میں حدیث کے متعلق میں نے جو مضامین لکھے ہیں اور دوسری کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدلال و احتجاج کرتا رہا ہوں، کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ میرا ذرہ برابر بھی کوئی میلان منکرینِ حدیث کے مسلک کی طرف ہے یا ہو سکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن و مسلم سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ نے یہ گمان کر لیا کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر کسی کے تفقہ یا اپنے اجتہاد یا کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں؟ ترجیح تو درکنار اگر میں دونوں کو مساوی بھی سمجھوں، بلکہ اس کا خیال بھی کروں تو مومن کیسے رہ جاؤں گا؟

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیثِ رسول پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک اسناد کی صحت حدیث کی صحت معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیثِ رسول ہونے کا ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم متن پر غور کرنا، قرآن و حدیث

کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس کا لحاظ کرنا، اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ سے متعلق ہے اس معاملہ میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر نظر ڈالنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے۔ پس ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ حدیث رسول اور اجتہادِ مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں بلکہ اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ روایات کے ردّ و قبول اور ان سے احکام کے استنباط میں ایک محدث کی رائے بلحاظ سند اور ایک مجتہد کی رائے بلحاظ درایت کا مرتبہ مساوی ہے یا نہیں ؟ یا یہ کہ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے ؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلہ قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گنہگار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ وہ حدیث کو حدیثِ رسول مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس کا ہم پلہ یا اس پر قابلِ ترجیح قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس چیز کا تصوّر بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح یا غلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلو میں بیان کر چکا ہوں۔ آپ براہِ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فنِ حدیث میں موجود ہیں یا نہیں ؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آرا پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شدومد سے کرتے ہیں ؟ محدثین کو بالکل ناقابلِ اعتبار تو ہم نے کہا نہیں، نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس کا کیا حال ہے، اور اس معاملہ میں جس پایہ کے محدث نے اس کو اپنی

کتاب میں جگہ دی ہو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو پوری پوری وقعت دیتے ہیں۔ لیکن فنِ حدیث کی ان کمزوریوں کی بنا پر جن کا ذکر کیا ہے ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علمِ روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات ہی پر پورا پورا اعتماد کر لیں اور ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیثِ رسول تسلیم کر لیں جسے اس علم کی رُو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔ آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے لیکن اس اختلافِ رائے کا نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگائیں جو فی الواقع ہم نے نہیں کیا ہے۔

حدیث کے متعلق چند سوالات

ناظرینِ "ترجمان القرآن" میں سے ایک تحریر فرماتے ہیں:

"منکرینِ حدیث کے جواب میں آپ کا فاضلانہ مضمون مندرجہ ترجمان القرآن پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ جزاکم اللہ خیرا لجزاء۔ اسی سلسلہ میں اگر جناب ذیل کے امور پر مزید روشنی ڈالیں تو ذی علم احباب کے لیے عموماً اور ناظرینِ رسالہ کے لیے خصوصاً بہت ہی مفید ہوگا۔"

(۱) حفاظتِ قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ لَا تَكْتُبُوا عَنِّي سِوَى الْقُرْآنِ ایک ضروری احتیاط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ صحابہ کرام قرأت وحفظ قرآن کَمَا نُزِّلَ کے لیے مامور تھے اور اسی پر عامل رہے، باوجود اس کے اختلافِ قرأت پیدا ہوا جس کا دفعیہ بعہد حضرت عثمان ہوا اس سے ظاہر ہے کہ احادیث بمقابلہ قرآن ویسی محفوظ نہیں ہو سکتیں، خصوصاً جب کہ قتل جمل وصفین کے بعد مدت تک ان کی جمع وتنقید کی مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی، جبکہ طرق رواۃ اور موضوعات کی پہچان بہت مشکل تھی۔

(۲) احادیث فعلی اور قولی میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً احادیثِ فعلی میں سے کیفیت وہیئت نماز کے متعلق عقل چاہتی ہے کہ مطلقاً کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ ارشادِ نبوی تھا کہ صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي کم از کم

حرمین شریفین میں دن رات پانچ مرتبہ ایک گروہ کثیر ہر زمانہ میں متواتر اس عمل کا مشاہدہ کرتا رہا ہے مگر ابتدائے زمانہ ہی میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف جو بصورت رفعِ یدین، ارسالِ یدین[1]، وضعِ یدین[2]، تامین بالجہر وغیرہا ظاہر ہوا، اس تواترِ فعلی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور تواترِ قولی کی حیثیت اور بھی گر جاتی ہے۔ خبرِ احاد کا کیا کہنا۔

(۳) اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے عملی طور پر سبق آموز ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جب تک کہ احادیث کا تسلی بخش اہتمام نہ ہو سکا، قرنین عظیم کے باہر مسلمان قرآن مجید ہی سے اسوۂ نبی کا اقتباس کرتے تھے۔ اخلاق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا اور آپ نے جواباً فرمایا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ۔ غرض قرآن پاک سے اسلامی اخلاق اور زندگی کے معلوم کرنے کے لیے ذخیرہ وافر ہے۔ فی زمانہ بھی بہت تھوڑے ہیں جن کو پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سوانح بالتفصیل والصواب معلوم ہوں۔ مگر متبعین شریعت عموماً اصول و ارکان سے واقف ہیں اور یہی مقصود بالذات تھا۔

مذکورہ بالا بعض منکرین حجیتِ حدیث کے شبہات ہیں جن کا ازالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا ورنہ خاکسار مَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کو صحیح معنوں میں لے کر حجیتِ حدیثِ صحیح کا قائل ہے۔"

آپ نے جن اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے علاوہ بیسیوں اور

---

[1] ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا جس طرح شیعہ حضرات پڑھتے ہیں۔

[2] ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا جس طرح اہلِ سنّت پڑھتے ہیں۔

اعتراضات بھی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں مگر ان جزئی باتوں پر بعد اجدا بحث کرنا طول کلام کا موجب ہے اور غیر ضروری بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے نقطۂ نظر پر ہے جب کسی مسئلہ پر مخالف نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو اس کو تمام مخالف ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے ہیں اور جب موافق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو تمام دلائل موافقت ہی میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب خالی الذہن ہو کر تلاش حق کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے اور دونوں میں موازنہ کرکے وہ ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے متاثر ہو کر، یا غیر محتاط علماء کی روایات سے دل برداشتہ ہو کر احادیث سے بدظن ہو چکے ہیں، وہ جب مخالفانہ ذہنیت کے ساتھ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو حدیثوں کے ناقابلِ احتجاج ہونے کے لیے دلائل پر دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ قدامت پسندی کے ماحول میں پرورش پاتے ہوئے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ہر حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو بے چون وچرا مان لیتے ہیں، خواہ وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، اور جب نقطۂ نظر غلط ہیں تو جو کچھ ان نقطوں سے دیکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تمام احادیث کو مطلقاً غلط سمجھنے والے بھی غلطی پر ہیں اور تمام احادیث کو مطلقاً صحیح سمجھنے والے بھی۔ وہ لوگ بھی راہ راست سے ہٹ گئے ہیں جو احادیث اور قرآن مجید میں فرق نہیں کرتے۔ اور وہ لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں جو احادیث کو قطعاً ناقابلِ احتجاج قرار دیتے ہیں۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور وہ درمیانی راستہ نظر نہیں آسکتا جب تک کہ دیکھنے والا ان متضاد نقطوں سے ہٹ کر وسط کے نقطہ پر نہ آجائے۔ پس اصلاح کا

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جزئیات میں اُلجھنے کے بجائے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر پر براہِ راست حملہ کیا جائے اور ان کو وہاں سے ہٹا کر صحیح نقطۂ نظر پر کھینچ لایا جائے۔

تاہم جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیان کردہ امور پر روشنی ڈالی جائے تو مختصراً میں ان پر اظہارِ رائے کیے دیتا ہوں۔

(۱) یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے مگر اس سے تجاوز کر کے یہ فرض کر لینا صحیح نہ ہوگا کہ وہ مطلقاً محفوظ ہی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور عمل ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کے طریقوں اور راویوں کے احوال کی چھان بین میں بہت دقتیں پیش آئی ہیں، اور ان میں محدثین کے درمیان اختلافات بھی ہوتے ہیں، مگر فنِ حدیث کی تاریخ شاہد ہے کہ محدثین نے تحقیق و تفتیش کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے اور اس کام میں اتنی محنتیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ انسان کے بس میں نہ تھیں۔ انہوں نے اپنی محنتوں سے جو ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ آج ہمارے پاس موجود ہے اور ان کے درمیان جو اختلافات ہوتے ہیں وہ بھی تمام دلائل اور شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر کوئی اس ذخیرہ پر تحقیق کی نظر ڈالے تو اس کے لیے آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا نہیں فرمایا، کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اور یہ کہ ہر روایت جو آپ کی طرف منسوب ہے وہ اپنی صحت اور اپنے قابلِ احتجاج ہونے کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتی ہے، لیکن یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے، ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے اس لیے صحت کا اصلی معیار قرآن ہی ہونا چاہیے۔ جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے مخالف ہوگی اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے، اور اس کا مخالفِ قرآن ہونا ہی اس امر کا بیّن ثبوت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

وہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے موافق ہوگی، اور تعلیمات قرآن کی ایسی تشریح و توضیح یا احکام کی ایسی تفصیل ہوگی جو قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف نہ ہو[1] اور روایت و درایت کے طریقوں سے اس کے معتبر ہونے کا ظن غالب بھی ہو جائے گا، اس کو ہم ضرور تسلیم کریں گے، اور اپنی عقلی تفسیر و تشریح اور اپنی رائے پر اس کو ترجیح دیں گے۔

(۲) بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کو دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں، ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرِ مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی، مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد، لوگوں سے پوچھ لیجیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کریگا کوئی کسی ٹکڑے کو، کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کردیگا،

---

[1] واضح رہے کہ قرآن کے خلاف ہونا اور چیز ہے اور قرآن سے زاید ہونا اور چیز۔ بعض لوگ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور حدیث میں جو باتیں قرآنی اجمال سے زائد ملتی ہیں ان کو قرآن کے خلاف قرار دینے لگتے ہیں۔ اس پر تفصیل کلام بعد والے مضمون میں کیا گیا ہے۔

کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کردیگا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کرسکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔ اگر اب کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہدے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی یا جو تقریر کی تھی وہ از سرتا پا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر تقریر کے متعلق تمام اخبار احاد کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی، بہت سے آدمی موجود تھے، اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق لفظاً یا معنیً پایا جائے گا، وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ تیار کر لیا جائے گا۔ اور جن حصوں کے بیان کرنے میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبتاً کم معتبر ہوں گے مگر ان کو موضوع اور غلط کہنا جائز نہ ہوگا، تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور ایسی بات ان میں نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جاتے، مثلاً تقریر کے معتبر حصوں سے مختلف ہونا یا مقرر کے خیالات اور انداز بیان اور افتاد مزاج کے متعلق جو صحیح معلومات لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں ان کے خلاف ہونا۔

یہی حال احادیث فعلی کا بھی ہے۔ آپ نے نماز کی مثال پیش فرمائی ہے۔ میں بھی اسی مثال کو سامنے رکھ کر جواب عرض کرتا ہوں۔ نماز کے متعلق تواتر قولی وعملی سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی نماز فرض ادا فرماتے تھے، نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی، مقتدی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہوتے اور آپ کی حرکات وسکنات کی پیروی کرتے تھے۔ آپ قبلہ کی جانب رُخ فرمایا کرتے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں داخل ہوتے

قیام، رکوع، سجود اور قعود سے نماز مرکب ہوتی تھی، ہر رکن نماز کی فلاں فلاں ہیئتیں تھیں۔ غرض نماز کے جتنے اہم اجزائے ترکیبی ہیں ان سب میں تمام زبانی روایات متفق ہیں اور عہد رسالت سے آج تک ان کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔ اب رہے جزئیات مثلاً رفع یدین اور وضع یدین وغیرہ تو ان کا اختلاف یہ معنی نہیں رکھتا کہ نماز کے متعلق تمام روایات غلط ہیں بلکہ دراصل یہ اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف دیکھا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، اور ان میں سے کسی کے کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور حضور خود صاحب شریعت تھے اس لیے آپ جس وقت جیسا چاہتے تھے عمل فرماتے تھے۔ لیکن حضورؐ کے سوا کوئی اور شخص چونکہ صاحب شریعت نہ تھا۔ اور اس کا کام اتباع تھا نہ کہ تشریع اس لیے ہر دیکھنے والے نے آپ کو جیسا فعل کرتے دیکھا اسی کی پیروی کی اور اسی کی پیروی کے لیے لوگوں سے کہا۔ بعد کے ائمہ نے روایات کی چھان بین کر کے ہر جزئیہ کے متعلق یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ زیادہ صحیح اور مستند روایات کونسی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق کے نتائج میں اختلاف ہونا ممکن تھا، اور وہ ہوا کسی نے کسی روایت کو زیادہ مستند سمجھا، اور کسی کو اس کے خلاف روایت پر اطمینان حاصل ہوا۔ مگر یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ ادائے نماز کے متعلق سرے سے کوئی قولی وفعلی تواتر ہی نہیں پایا جاتا۔

(۲) قرآن پاک اور حدیث نبوی کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے تیسرا سوال پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور ایمان پر دیا گیا ہے، اور ایمان ہی کی تفصیلات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس کے لیے تو ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں، اور حدیث میں اس سے زیادہ کوئی چیز ملتی بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اخلاقی تعلیمات ہیں۔ قرآن میں اصول اخلاق

ترتیب ترتیب سب کے سب بیان کر دیئے گئے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اخلاق کا تعلق لفظی بیان سے اتنا نہیں ہے جتنا عملی نمونہ سے ہے۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسول کو اخلاق کا مجسم نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے مواعظ اور اپنی تعلیم حکمت اور عملی تربیت و تزکیہ نفوس سے ان تمام اصول اخلاق کی قولی و عملی تشریح فرما دی جو قرآن مجید میں بیان ہوئے۔ پس جو شخص اس اسوۂ نبوی کو چھوڑ کر کہتا ہے کہ اس باب میں ہمارے لیے صرف قرآن کافی ہے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ حق تعالیٰ کے اس فعل کو عبث سمجھتا ہے کہ اس نے تنزیل کتاب کے ساتھ رسول بھی مبعوث فرمایا اور یہ کہہ کر مبعوث فرمایا کہ ہمارا رسول نہ صرف تم کو ہماری آیات سنائے گا بلکہ تمہارا تزکیۂ نفس بھی کرے گا۔ تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دے گا اور اس کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ بھی ہو گا۔

اب رہ گئے احکام تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کیے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں، دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں، اور ان کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی

چاہیئے اس سے واضح ہو گیا کہ پُورا اور پکا مسلمان بننے کے لیے قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا علم کس قدر ضروری ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک عام مسلمان حدیث کے بغیر بھی ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکتا ہے، تو میں کہوں گا یہ علم حدیث کی ضرورت نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر یہ دلیل ہے تو یہی دلیل قرآن کے علم کی ضرورت نہ ہونے پر بھی قائم کی جا سکتی ہے، کیونکہ ایک عامی مسلمان قرآن کے علم سے بھی بہت کم بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور پھر بھی اپنی زندگی میں احکام شریعت کا اتباع کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ معیاری مسلمان تو دراصل اس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں اور جن کی رگ و پے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔ باقی رہے عوام تو وہ اس وقت بھی ان معیاری مسلمانوں کے پیرو تھے، اور آج بھی ہیں۔ عہدِ نبوی میں جن صحابہ نے جتنا زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت اور تعلیم کا فیض اٹھایا وہ اتنے ہی زیادہ معیاری مسلمان سمجھے گئے۔ اور ان کے مقابلہ میں کبھی ان لوگوں کو باعتبار علم یا باعتبار عمل ترجیح نہیں دی گئی جنہوں نے آنحضرت سے تعلیم اور صحبت کا فیض نہ اٹھایا تھا۔ بلاشبہ مسلمان دونوں تھے مگر دونوں کے مرتب کا فرق کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاول ۵۴ھ۔ جولائی ۳۵ء)

قرآن اور سنّتِ رسول

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" میں متواتر ضرورتِ حدیث کے سلسلہ میں آپ کے مضامین دیکھ چکا ہوں۔ میں نہ تو ان غالی مخالفینِ احادیث میں سے ہوں کہ کسی قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ٹھکرا دوں اور نہ کورانہ روایات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ سے ان دو اصولی مسائل کے بارے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اور میرے احباب کی تسلّی فرمائیں :-

(۱) آیا قرآن مجید نجات کے لیے کافی ہے یا نہیں ؟ اگر کافی ہے تو تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں، کیوں فریضۂ اولین قرار دی جائیں ؟

مزید قابلِ غور امر یہ ہے کہ باقی ارکانِ اسلام (روزہ، زکوٰۃ، حج جو سال میں یا عمر بھر میں ایک دفعہ ادا کرنے ضروری ہیں) کی تفصیلات تو قرآن بیان کرتا ہے۔ لیکن نماز جو ایک دن میں ۵ دفعہ ادا کرنی ضروری ہے اس کی تفصیلات کیوں بیان نہیں کرتا ؟

(۲) الف۔ مسلمانوں کی تباہی کا سبب کیا روایات نہیں ہیں ؟

ب۔ کوئی قوم جس کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور جس کے لیے مختلف آرڈر موجود ہوں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک ایک آرڈر

پر اصولی وحدت نہ ہو جائے۔ کیا روایات کو قبول کرتے ہوئے مسلم قوم کے لیے آپ ایک آرڈر کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ میرا ایمان ہے کہ اس وقت مسلمان وحدت و یگانگت اور اتحاد ملی ہی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اصولاً اس وحدت کا حل آپ کیا تجویز کریں گے؟

آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ تھوڑے سے تامل سے خود آپ ہی ان کا جواب نہ پا لیتے۔ میرے ان مضامین میں بھی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ان میں سے بعض سوالات کا حل موجود ہے۔ تاہم جب آپ کو ان مسائل میں الجھن پیش آ رہی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی اس الجھن میں مبتلا ہیں تو ان کی تشفی کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے:۔

(۱) قرآن حکیم "نجات" کے لیے نہیں بلکہ "ہدایت" کے لیے کافی ہے۔ اس کا کام صحیح فکر اور صحیح عمل کی راہ بتاتا ہے اور اس راہ نمائی میں وہ یقیناً کافی ہے۔ مگر نجات کے لیے صرف قرآن کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور وہی اعتقاد رکھیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے، اور اسی قانون کے مطابق عمل کریں جس کے اصول قرآن نے مقرر کیے ہیں۔

(۲) ہدایت کے لیے قرآن کے کافی ہونے کا مفہوم بھی عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی علم یا فن کی تعلیم کے لیے کافی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فن کے جتنے گر ہیں یا اس علم کے جتنے اہم مسائل ہیں، وہ سب اس کتاب میں آ گئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر شخص جو اس کتاب کے الفاظ کو پڑھ سکتا ہو اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو جائے گا، اور محض کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کو اپنے فن میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو جائے گی کہ وہ عملاً اس سے کام لے سکے۔ کتاب اپنی جگہ کتنی ہی کامل سہی لیکن اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسری جانب خود

طالب علم میں بھی ایک خاص استعداد موجود ہو اور ساتھ ہی ایک ماہر فن استاد بھی موجود ہو جو نہ صرف کتاب کے مطالب کی توضیح و تشریح کرے، بلکہ مظاہرہ (EXPERIMENT) اور مشق و تمرین (EXERCISE) کے ذریعہ سے فن کی وہ عملی تفصیلات بھی سکھا دے جو نہ تو کتاب میں پوری طرح بیان ہو سکتی ہیں اور نہ محض کتاب میں پڑھ لینے سے کوئی ان پر علم و فضل کے اعتبار سے حاوی ہو سکتا ہے پس یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے۔ وہ اس لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے کہ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے، اور اس میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جس پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے۔ مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خالص نیت رکھتا ہو اور ان مبادی سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہر فن اُستاد موجود ہو جو کتاب اللہ کے نکات سمجھائے آیات کا صحیح معنی و مفہوم بتلائے، احکام پر خود عمل کر کے دکھائے اور قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ رہی دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو غیر از قرآن کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اس کی ضرورت کا منکر ہے اور قرآن کو اس معنی میں کافی سمجھتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی ہدایت کی حاجت نہیں ہے وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تنزیل کافی تھی، خدا نے نعوذ باللہ یہ فعل عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

(۴) آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلاتِ نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضۂ آدمین قرار دی جائیں؟" اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہرِ فن طبیب فن طب کے کسی قاعدے کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے "خارج از فن" نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو شکلیں کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اسے غیر از اقلیدس نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور مہمات مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں اور عملی تفصیلات استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ کیونکہ استاد عملی مظاہرے سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ پھر کتاب کے حسنِ کلام اور اس کے کمالِ ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بناتا، رکعتوں کی تفصیل دیتا، رکوع و سجود اور قیام و قعود کی صورتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا۔ بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر صورت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا۔ پھر تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، جزئیات کی پوری تفصیل

کے ساتھ درج کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن نہ ہو" لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۴) یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں نماز، روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صرف ان کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے، ان کے قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور کہیں کہیں ان کے ادا کرنے کے طریقوں کی طرف بھی اشارات کر دیئے گئے ہیں جو عملی تفصیلات پر کسی طرح بھی مشتمل نہیں کیے جا سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی تفصیلات مقرر کرنے والا کون ہو؟ کیا یہ کام ہر شخص کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دینا چاہیے تھا کہ جو جس طرح چاہے عمل کرے؟ اگر ایسا ہوتا تو دو مسلمانوں کی نمازیں بھی شاید ایک طریقے پر نہ ہوتیں اور نہ دوسرے ارکانِ اسلام کے عملی طریقوں میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی۔ آج آپ جس "شیرازۂ قومی" کے انتشار کا ماتم فرما رہے ہیں وہ صرف چند آرڈروں کے اختلاف کی وجہ سے ہے تاہم ہر آرڈر میں لاکھوں کروڑوں مسلمان مجتمع ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص قرآن کے احکام کی عملی تفصیلات مقرر کرنے میں خود مختار ہوتا تو اسلام کے پیروؤں میں سرے سے کوئی آرڈر ہی نہ ہوتا۔ ان مختلف افراد کو جس چیز نے ایک قوم بنایا ہے وہ اعتقاد و عمل کی یک رنگی و یکسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہ معلوم ہے کہ نظام جماعت کو قائم کرنے میں اعتقاد کے اشتراک سے بڑھ کر عمل کا اشتراک کارگر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان حواس کا بندہ ہے اور اس کے حواس کو محسوس صورتیں ہی متاثر کر سکتی ہیں، اور انہی صورتوں کی یکسانی و یک رنگی اس میں جمعیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا طریقہائے عمل کو افراد کے اختیار پر چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ محض اعتقاد کے اشتراک سے مسلمان کبھی ایک قوم نہ بن سکتے۔

پس جب یہ مسلّم ہے کہ وحدتِ قومی کے لیے اتحادِ عمل ناگزیر ہے، اور یہ بھی مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وہ تفصیلات نہیں دی ہیں جن سے یہ اتحاد حاصل ہو سکتا تھا، تو پھر آپ ہی بتائیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کو یہ حق پہنچتا تھا کہ قرآن کے مطابق عمل کرنے کے طریقے اور ضابطے مقرر کرتا؟ اس کے سوا اور کس طریقے پر امت جمع ہو سکتی تھی؟ ان کے سوا اور کون تھا جسے حاکمِ اعلیٰ تسلیم کر کے سب مسلمان اس کی تقلید پر متفق ہو جاتے؟ یہ آنحضرت ہی کا فیضِ تعلیم تو ہے جس کی بدولت آج ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمان ایک ہی ہیئت سے نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی طریقہ سے حج کرتے ہیں، ایک ہی زمانہ میں ایک ہی طرح روزہ رکھتے ہیں۔ فرق جو کچھ بھی ہے محض جزئیات کا ہے، اور وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے آپ کو ان جزئیات کے مقرر کرنے کا حق دار سمجھتا ہو، بلکہ اس بنا پر ہے کہ ہر گروہ اپنے علم کے مطابق اسی جزئیہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے مسنون سمجھتا ہے جس پر وہ عامل ہے۔ باقی رہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی امامت، اور آپ کی سنّت کا واجب التقلید ہونا، تو گنتی کے چند افراد کے سوا تمام امت اس پر متفق ہے اور اسی اتفاق پر مسلمانوں کی وحدتِ قومی کا انحصار ہے۔

(۵) آپ قرآن مجید میں ایک مرتبہ پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تفصیلات کہاں ہیں؟ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ کن چیزوں پر کتنی زکوٰۃ دی جائے اور زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ حج اور روزہ کے جن احکام کو آپ تفصیلات سے تعبیر کر رہے ہیں۔ وہ نماز کے احکام سے بھی زیادہ مجمل ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں اوّل سے آخر تک اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ پورا زورِ بیان ایمانیات کی تعلیم ہی میں صرف کر دیا جاتے، کیونکہ یہی دین کی بنیاد ہے، رہے عبادات اور معاملات کے احکام، تو ان کے صرف اصول اور اہماتِ مسائل بیان کر دیتے جائیں اور

تفصیلات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے۔

(۶) مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب روایات نہیں ہیں بلکہ نفسانیت، اور عصبیت جاہلیہ، اور فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت، اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو روایات کے اختلاف سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ روایات خواہ ضعیف ہوں یا قوی اور ان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو، بہر حال ان سب کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور ان مختلف روایتوں کو ماننے والے اس امر میں بہر طور متفق ہیں کہ وہ سب آنحضرت کو اپنا حاکم اور پیشوا مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں روایت کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے باقی رہے اصولِ دین تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ پس اگر مسلمان خلوص نیت کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کریں کہ وہ سب کتاب اللہ کے ماننے والے اور رسول اللہ کا اتباع کرنے والے ہیں، اور ان کے درمیان اصولِ دین مشترک ہیں، تو وہ جزئیات میں مختلف طریقوں پر قائم رہتے ہوئے بھی باہم متحد ہو سکتے ہیں لیکن اگر اس کا ادراک نہ ہو تو روایات کا سارا دفتر نذر آتش کر دینے سے بھی اختلاف دُور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے نفس میں وہ شیطان موجود ہے جو قرآن کو بھی جنگ و جدل کا آلہ بنانے سے نہیں چوکتا۔

(۷) "ایک آرڈر" آپ کس معنی میں چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ فروع میں کوئی اختلاف نہ ہو تو جب تک انسان کی فطرت نہ بدل جائے، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بشری فطرت کے ساتھ تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف دو ہی آدمیوں کا نقطۂ نظر بالکلیہ ایک ہو جائے۔ لہٰذا ایسا "ایک آرڈر" تو کبھی قائم نہیں ہو سکتا جس میں کسی نوع کا اختلافِ رائے اور اختلافِ عمل سرے سے موجود ہی نہ ہو۔

ہاں اگر آپ "ایک آرڈر" سے مراد ایسا آرڈر لیتے ہیں جو اصولوں کی وحدت پر مبنی ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول نے ایسا ہی آرڈر قائم کیا تھا اور وہ ہر وقت ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان اصول اور فروع کا فرق سمجھ لیں اور دونوں کے مراتب میں امتیاز کرنا سیکھ جائیں۔

(ترجمان القرآن شعبان ۵۳ھ۔ نومبر ۳۴ء)

ایک حدیث پر اعتراض

اور

اس کا جواب

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"میں نے تجرید البخاری مؤلفہ علامہ حسین بن مبارک متوفی ۸۹۳ھ کے اردو ترجمہ میں جو فیروزالدین صاحب نے لاہور سے شائع کیا ہے، صفحہ ۸۱ پر ایک حدیث کا مطالعہ کیا جو حسب ذیل ہے۔

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات دن میں دورہ کر لیتے تھے۔ اور وہ گیارہ تھیں (ایک روایت میں آیا ہے کہ نو تھیں) حضرت انس سے پوچھا گیا کہ آپ ان سب کی طاقت رکھتے تھے؟ وہ بولے ہم تو کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی ہے۔

جناب والا سے میں توقع رکھتا ہوں کہ براہِ کرم مذکورۃ بالا حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں۔ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی ساعت کے اندر اپنی جملہ ازواج مطہرات سے مقاربت کی ہے؟ اور اگر مقاربت کی ہے تو حضرت انس کو کس طرح اس کا علم ہو گیا؟ کیا حضورؐ نے حضرت انسؓ سے اس مقاربت کا ذکر فرمایا؟ یا

ازواج مطہرات میں سے کسی نے اس ازدواجی تعلق کا راز فاش کیا ؟ یا حضرت انسؓ کو آنحضرت کی خلوت کا ہر وقت علم ہوتا رہتا تھا ؟ یا حضرت انسؓ خود اس خلوت کا علم حاصل کرنے کی کھوج میں لگے رہتے تھے ؟ آخر حضور کو اس قدر عجلتِ مقاربت کی کیا ضرورت درپیش تھی جب آپ کی باریاں مقرر تھیں ؟ اور کیا بوقتِ واحد اس قدر کثرتِ مقاربت سے حضور کی صحت و توانائی پہ کچھ اثر نہ پڑتا تھا ؟"

یہ حدیث بخاری میں دو جگہ نقل کی گئی ہے۔ ایک کتاب الغسل میں باب إِذَا جَامَعَ ثُمَّ عَادَ وَمَنْ دَارَ عَلَىٰ نِسَائِهِ بِغُسْلٍ وَاحِدٍ کے تحت۔ دوسرے کتاب النکاح میں بَابُ مَنْ طَافَ عَلَىٰ نِسَائِهِ فِي غُسْلٍ وَاحِدٍ کے تحت پہلے باب کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدُورُ عَلَىٰ نِسَائِهِ فِي السَّاعَةِ الْوَاحِدَةِ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُنَّ إِحْدَىٰ عَشْرَةَ قَالَ قُلْتُ لِأَنَسٍ أَوَكَانَ يُطِيقُهُ ؟ قَالَ كُنَّا نَتَحَدَّثُ أَنَّهُ أُعْطِيَ قُوَّةَ ثَلَاثِينَ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات اور دن میں اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی وقت ہو آتے تھے اور وہ گیارہ بیویاں تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے انس سے کہا کیا آپ میں اتنی طاقت تھی ؟ انس نے جواب دیا ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ حضور کو ۳۰ مردوں کی قوت عطا کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سعید بن ابی عروبہ قتادہ کے حوالہ سے حضرت انسؓ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ :

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَطُوفُ عَلَىٰ نِسَائِهِ فِي اللَّيْلَةِ الْوَاحِدَةِ وَلَهُ يَوْمَئِذٍ تِسْعُ نِسْوَةٍ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی رات میں چکر لگا لیتے تھے اور اس زمانہ میں آپ کی نو بیویاں تھیں

دونوں حدیثوں سے مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد مرتبہ مباشرت کرے تو ہر بار غسل کرنا لازم نہیں ہے۔ بلکہ سب کے لیے ایک ہی غسل کافی ہو سکتا ہے۔ رہا ازواجِ مطہرات کا نو یا گیارہ ہونا اور حضورؐ کا ان سب کے پاس شب باش ہونے کی طاقت رکھنا تو اس کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ اسی لیے امام بخاریؒ نے دونوں جگہ ترجمۃ الباب میں غسل واحد لکھا ہے۔

نسائی نے بھی بَابُ اِتْیَانِ النِّسَاءِ قَبْلَ اِحْدَاثِ الْغُسْلِ میں حضرت انسؓ سے اسی مضمون کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک میں طَافَ عَلٰی نِسَائِہٖ فِیْ لَیْلَۃٍ بِغُسْلٍ وَّاحِدٍ ہے یعنی "ایک رات میں آپ نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور صرف ایک مرتبہ غسل فرمایا۔" دوسری حدیث میں ہے کَانَ یَطُوْفُ عَلٰی نِسَائِہٖ فِیْ غُسْلٍ وَّاحِدٍ یعنی آپ اپنی بیویوں کے پاس ہو آتے تھے اور پھر ایک بار غسل فرماتے تھے۔"

ابوداؤد نے ایک حدیث بَابٌ فِی الْجُنُبِ یَعُوْدُ میں نقل کی ہے جس میں طَافَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی نِسَائِہٖ فِیْ غُسْلٍ وَّاحِدٍ ہے یعنی ایک روز آپ نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور پھر ایک مرتبہ غسل کیا۔" اس کے بعد حضرت ابورافع سے یہ حدیث نقل کی ہے:-

طَافَ ذَاتَ یَوْمٍ عَلٰی نِسَائِہٖ یَغْتَسِلُ عِنْدَ ھٰذَا وَعِنْدَ ھٰذَا۔ قَالَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَا تَجْعَلُہٗ غُسْلًا وَّاحِدًا۔ قَالَ ھٰذَا اَزْکٰی وَ اَطْیَبُ وَاَطْھَرُ۔

ایک روز حضورؐ نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور ہر ایک کے ہاں الگ غسل کیا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ ایک ہی غسل کیوں نہیں فرماتے۔ حضورؐ نے فرمایا یہ زیادہ پاکیزہ اور صاف ستھرا طریقہ ہے۔

پھر ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ اَھْلَهٗ ثُمَّ یَدَا لَهٗ اَنْ یُّعَاوِدَ فَلْیَتَوَضَّأْ بَیْنَھُمَا وُضُوْءً۔

جو شخص تم میں سے اپنی بیوی کے پاس جائے پھر دوبارہ مقاربت کرنا چاہے تو دونوں مقاربتوں کے درمیان وضو کرے۔

یہی حدیث ترمذی نے بھی ابواب الطہارۃ میں نقل کی ہے۔ ان تینوں قسم کی حدیثوں کو جمع کرنے سے مسئلہ یہ نکلتا ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ مباشرت کرنے کی صورت میں زیادہ پاکیزہ طریقہ یہ ہے کہ ہر بار جداگانہ غسل کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم وضو کر لیا جائے۔ لیکن ایسا واجب نہیں ہے دو یا زاید مقاربتوں کے بعد صرف ایک مرتبہ غسل کر لینے سے بھی شرطِ طہارت پوری ہو جاتی ہے۔

اب شبہات کو دل میں جگہ دینے سے قبل حسبِ ذیل امور کو ذہن نشین کر لیجیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے ابتدائی درجہ میں تھی۔ آپ کے سپرد اللہ تعالیٰ نے صرف یہی کام نہیں کیا تھا کہ ان کے خیالات درست کریں بلکہ یہ خدمت بھی آپ کے سپرد تھی کہ ان کی زندگی بھی درست کریں، ان کو انسان بنائیں، انہیں شائستہ اخلاق، پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن، نیک معاملات اور عمدہ آداب (MANNERS) کی تعلیم دیں۔ یہ مقصد محض وعظ و تلقین اور قیل و قال سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ۲۳ سال کی مختصر مدتِ حیات میں ایک پوری قوم کو وحشت کے بہت نیچے مقام سے اٹھا کر تہذیب کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچا دینا اس طرح ممکن نہ تھا کہ محض چند گنے بندھے اوقات میں ان کو بلا کر کچھ زبانی ہدایات دے دی جائیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ آپ خود اپنی زندگی میں ان کے سامنے انسانیت کا ایک مکمل نمونہ پیش کرتے، اور ان کو پورا موقع دیتے کہ اس نمونہ کو دیکھیں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق بنائیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔

یہ آپ کا انتہائی ایثار تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم

کے لیے پبلک کر دیا۔ اپنی کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا حتیٰ کہ ان معاملات کو بھی نہ چھپایا جنہیں دنیا میں کوئی شخص پبلک کے لیے کھولنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے لوگوں کو اذنِ عام دے دیا کہ آؤ اور ہر وقت ہر حال میں میری زندگی کے ایک ایک پہلو کو دیکھو اور ہر معاملہ میں مجھ پر نظر رکھو کہ میں کس طرح عمل کرتا ہوں۔ ایک پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا شخص نہ تو اتنا بڑا ایثار کر سکتا تھا، اور نہ کوئی دوسرا شخص یہ جرأت ہی کر سکتا تھا کہ اپنی پوری زندگی کو یوں منظرِ عام پر لا کر رکھ دے۔ صرف یہی ایک بات اس جیرت انگیز انسان کی نبوت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے سوا اور کون آدمی دنیا میں ایسا گزرا ہے یا آج پایا جاتا ہے جو کامل ۲۳ برس تک ہر وقت، ہر حال میں منظرِ عام پر زندگی بسر کرے۔ سینکڑوں ہزاروں آدمی اس کی ایک ایک حرکت کے تجسس میں لگے ہوتے ہوں۔ اپنے گھر میں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوتے بھی اس کی جانچ پڑتال ہو رہی ہو، اور اتنی گہری تلاش کے بعد نہ صرف یہ کہ اس کے کیرکٹر پر ایک سیاہ چھینٹ تک نظر نہ آئے بلکہ یہ ثابت ہو کہ جو کچھ وہ دوسروں کو تعلیم دیتا تھا، خود اس کی اپنی زندگی اس تعلیم کا مکمل نمونہ تھی، بلکہ یہ ثابت ہو کہ اس طویل زندگی میں وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی عدل اور تقویٰ اور سچائی اور پاکیزگی کے معیاری مقام سے نہیں ہٹا، بلکہ یہ ثابت ہو کہ جن لوگوں نے سب سے زیادہ قریب سے اس کو دیکھا وہی سب سے زیادہ اس کے گرویدہ اور معتقد ہوئے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دراصل یہاں ذکر یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام کی تعلیم کے لیے اس امر کی عام اجازت دے رکھی تھی کہ رفتار میں، گفتار میں، نشست و برخاست میں، سونے اور جاگنے میں، خانگی معاشرت میں، عبادات اور معاملات میں، غرض ہر چیز میں لوگ آپ کے عمل کو دیکھیں، دیکھنے والوں سے سنیں، جاننے والوں سے پوچھیں، خود آپ سے دریافت کریں اور اپنی زندگی کو اس مثالی (IDEAL) زندگی کے نمونہ پر ڈھالنے کی کوشش کریں۔ آپ نے اپنی بیویوں کو بھی عام اجازت دے دی تھی کہ خلوت میں آپ کا جو طرزِ عمل دیکھیں

اس سے عورتوں اور مردوں سب کو آگاہ کر دیں، تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں، باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاست کے زیور سے آراستہ ہو جائے۔ اسی غرض کے لیے آپ کی بیویاں ؓ ———
آپ کی پرائیویٹ زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتانے میں دریغ نہ کرتی تھیں جن کو عام طور پر میاں اور بیوی کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور نہ کوئی گوارا کرتا ہے کہ لوگ اس کو جانیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کی خاطر آپ کی بیویوں کو تمام مسلمانوں کے لیے حقیقی ماؤں کی سی حیثیت دے دی تھی، اور ان کو افرادِ امت کے لیے حرام کر دیا تھا تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات چیت کر سکیں اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و سکنات میں سے ہر ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و پیروی کے لیے، حدودِ حلال و حرام کی واقفیت کے لیے، پاک اور ناپاک، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز کے لیے بیان کرتی رہیں۔ پھر باوجودیکہ حضور طبعاً انتہا درجہ کے شرمیلے اور حیادار تھے، آپ نے تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھا دیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے، خود ہدایات دیں۔ ان کو اجازت دی کہ جو کچھ چاہیں پوچھیں، اور ان کو موقع دیا کہ آپ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر معلوم کریں کہ ایک پاکیزہ اور مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے۔

اسی تعلیم کا ایک شعبہ طہارتِ جسم و لباس بھی تھا۔ اہلِ عرب تو خیر وحشی تھے؛ آج جن قوموں کو تہذیب و تمدن کے آسمان پر ہونے کا دعویٰ ہے، ان کا حال آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ کھانے کے بعد منہ کی صفائی سے ناواقف۔ رفع حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد۔ کھڑے کھڑے پیشاب کیا اور پتلون کے بٹن لگا لیے۔ کموڈ پر سے اٹھے اور ٹب میں اتر گئے۔ پھر تعلقاتِ مرد و زن میں تو ان کی ناشائستگی اور بے حیائی اور ناپاکی اس حد سے گزری ہوئی ہے کہ شرفا کی صحبت میں اس کا ذکر بھی کیا جا سکے۔ یہ حال جب ان ترقی یافتہ قوموں کا ہے تو اس قوم

کا کیا حال ہوگا جو تمدن کے بالکل ابتدائی درجہ میں تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے نہ صرف ان کے نفوس کا تزکیہ فرمایا، بلکہ ان کو طہارتِ جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے۔ ان میں پاکیزگی کا نفیس ذوق پیدا کیا۔ ان میں نجاست اور طہارت کی تمیز پیدا کی۔ زندگی بسر کرنے کے گندے، گھناؤنے ناشائستہ اور بیہودہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو صفائی، نفاست اور نظافت کے باقاعدہ آداب کا خوگر بنایا۔ اس کے لیے ناگزیر تھا کہ حضور خود اپنی پرائیویٹ زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پردہ کرتے، تاکہ جو کچھ نہ پوچھیں، یا نہ پوچھ سکیں، یا جو باتیں آپ کو زبان سے بتانے کا موقع نہ ملے، وہ لوگوں کو آپ کا طرزِ زندگی دیکھنے سے معلوم ہو جائیں۔ اس طرح آپ گویا ہمہ تن تعلیم بن گئے تھے۔ نہ صرف زبان سے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے بلکہ آپ کی ساری زندگی ہر حال میں اپنے گرد و پیش کی آبادی کے لیے تعلیم بنی ہوئی تھی۔

لوگ حدیث کی کتابوں میں جب آپ کی بیویوں اور دوسرے صحابہ و صحابیات کی زبان سے اور خود حضورؐ کی اپنی زبان سے اس قسم کے مسائل پڑھتے ہیں جن میں جنابت اور حیض و نفاس اور ایسے ہی دیگر امور کی نسبت انسان کے طرزِ عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو فوراً اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ یہ باتیں خلافِ حیا ہیں، لیکن وہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو کہ درحقیقت ایک بہت بڑا ایثار تھا جو حضورؐ نے محض اپنی امت کی خاطر گوارا فرمایا۔ جس ذاتِ پاک کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اس کی شریکِ زندگی تک کو کبھی اسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا، حتیٰ کہ جس نے کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا، اس نے محض اپنی امت کو صفائی اور شائستگی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی بیویوں کو اجازت دے دی کہ اس کی پرائیویٹ زندگی کے مخفی سے مخفی واقعات تک کو پبلک کر دیں، اور اپنے خدامِ خاص کو موقع دیا کہ جہاں تک اندرونی حالات سے واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں اور لوگوں تک ان حالات کو پہنچائیں۔ کیا یہ کوئی معمولی ایثار تھا؟ اور یہ اسی ایثار کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف اہلِ عرب بلکہ دنیا کے

کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی پرائیویٹ زندگی صفائی جسم اور طہارتِ لباس اور پاکیزگیٔ اطوار اور صنفی معاملات میں شائستگی و نظافت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ورنہ اگر ان معاملات کو محض شخصی ذوق اور تمیز پر چھوڑ دیا جاتا تو ہمارے اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے مخفی شعبوں میں جانوروں سے ملتا جلتا ہوتا کیونکہ ان شعبوں کے متعلق انسان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام آج بھی دنیا میں کہیں نہیں ہے۔

یہ تو ان شبہات کا جواب ہے جو لائق مستفسر نے حضورؐ کی پرائیویٹ زندگی کے اسرار سے حضرت انسؓ کی واقفیت پر ظاہر کیے ہیں۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصّہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

جو حدیثیں ہم نے ابتدا میں نقل کی ہیں ان میں کان یطوف، یا کان یدور، یا طاف کے الفاظ آتے ہیں۔ ان سب الفاظ کا لفظی ترجمہ "چکر لگانا" یا "پھرنا" ہے اور ان سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں اپنی تمام بیویوں کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ویسے آپ کا عام معمول تو یہ تھا کہ ایک ایک رات ایک ایک بیوی کے پاس بسر فرماتے، مگر احیاناً ایسا بھی ہو جایا کرتا تھا کہ ایک ہی رات میں سب کے ہاں ہو آتے تھے۔ راوی جس بات کا عینی شاہد ہے وہ صرف یہی ہے کہ آپ ہر ایک کے ہاں گئے۔ سب بیویوں کے ہاں جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ لامحالہ سب کے ساتھ ہم بستری بھی کی جائے۔ یہ راوی کا اپنا قیاس ہے کہ جب تشریف لے گئے تو ہر ایک کے ساتھ مباشرت بھی کی ہوگی۔ راوی حضرت انسؓ ہیں، اور ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے ان کا ایسا قیاس کرنا کچھ زیادہ قابلِ تعجب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ جب حضورؐ کی ملازمت میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی عمر صرف دس سال کی تھی اور آپ کی وفات کے وقت وہ بیس سال کے تھے۔ اتنے کم عمر نوجوان کا قیاس ایسے معاملات میں چنداں لائق اعتبار نہیں ہو سکتا۔ نوجوان لڑکے جب کبھی شوہر کو بیوی کے پاس جاتے دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن خواہ مخواہ مباشرت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ

ایک سن رسیدہ آدمی کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ محض مباشرت ہی کا تعلق نہیں ہوتا۔

پھر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حضورؐ کی ازواج مطہرات میں سے ایک یعنی زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۳ھ میں حضورؐ سے بیاہی گئیں اور صرف دو تین مہینہ زندہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔ دوسری حضرت سودہ ضعیف العمر تھیں اور اپنی باری عائشہ کو دے چکی تھیں۔ ان دو کو الگ کرنے کے بعد ۴ھ میں حضورؐ کی صرف تین بیویاں تھیں ۵ھ میں ایک کا اضافہ ہوا۔ ۶ھ میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ ۷ھ میں مزید تین ازواج حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ اس طرح آخر عمر میں حضورؐ کی صرف آٹھ بیویاں ایسی تھیں جن کے ساتھ آپ کے شب باش ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی اس قیاس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جو مجملاً ۹ یا ۱۱ ازواج کے ساتھ ہم بستر ہونے کے متعلق قائم کیا گیا ہے۔

بدرجۂ آخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں کسی وقت آٹھ بیویوں کے ساتھ ایک ہی رات شب باشی کی۔ اگر یہ واقعہ بھی ہو تو ایک ایسے تندرست اور صحیح القویٰ انسان کے لیے یہ امر کچھ بھی فوق العادۃ نہیں جس نے تمام عمر تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی ہو اور اپنے جسم کی قوتوں کو خیالات فاسدہ اور افعال قبیحہ میں کبھی ضائع نہ کیا ہو۔ یہ امر تعجب انگیز ہو سکتا ہے تو ان کے لیے جنہوں نے جوانی میں اپنی قوتیں ضائع کیں اور بڑھاپا آنے سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ حضورؐ ایک کامل انسان تھے تمام قوتیں آپ کے اندر غایت درجہ کے اعتدال پر تھیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتے۔

پھر اس طاقت کی حفاظت آپ نے ایسی کی کہ ساری جوانی صرف ایک بیوی کے ساتھ گزار دی، اور کبھی آپ کی پرہیزگاری میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ پچاس کے لگ بھگ عمر میں آپ اللہ کے حکم سے اپنے مخالفین کو چیلنج دیتے ہیں کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا ۔ میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کسی نے میرے کیرکٹر میں

کوئی خرابی دیکھی ہو تو بتاتے۔ مگر وہ جو حضورؐ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے ان میں سے بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ محمدؐ فلاں موقع پر تم سے فلاں کمزوری سرزد ہوئی تھی۔ پس ایک طرف کمال رجولیت کے ساتھ اس پرہیزگاری کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا آخر عمر میں اتنی عورتوں کے ساتھ شب باشی پر قادر ہونا کوئی فوق العادۃ بات نہیں ہے، اور دوسری طرف اس قدرت کے باوجود عہد شباب میں آپ کے کمالِ تقویٰ کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضورؐ کس قدر ضابط تھے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کتنی زبردست طاقت آپ نے پائی تھی۔

رہی وہ بات جو حضرت انسؓ نے فرمائی ہے کہ آپ کو تیس یا چالیس مردوں کی قوت عطا کی گئی تھی، تو وہ نہ حضورؐ کا قول ہے، نہ کوئی مستند بات۔ حضرت انسؓ خود فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں ایسا کہا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس وقت نوجوان تھے اور اپنے ہم عمر دوستوں ہی میں اس قسم کی گفتگو کرتے ہوں گے۔ عنفوانِ شباب میں عموماً لوگ رجولیت کی زیادتی کو خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر حضرت انسؓ تو اس زمانہ کی عربی سوسائٹی کے ایک نوجوان تھے جس میں رجولیت کی زیادتی انسانیت کا ایک قابلِ فخر جوہر سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے اگر اپنے محبوب آقا میں، جس کی غیر معمولی شخصیت سے وہ بیحد مرعوب بھی تھے، اس فخر کے قابل چیز کا ادعا کیا تو یہ بالکل ایک امر فطری ہے۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے کہ جو لوگ ان کی غیر معمولی شخصیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ ان کی ذات میں فوق البشری طاقتوں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسے معتقدات اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو حجت بنا کر ان پر استدلال کی عمارتیں کھڑی کی جائیں۔

حضرت انسؓ نے تو صرف اسی قدر کہا کہ حضورؐ کو ۳۰ یا ۴۰ مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر بعض دوسری روایتوں میں، جن کو ابونعیم اور احمد اور نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے، یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ چالیس مرد جن کی قوت حضورؐ کو عنایت کی گئی تھی دنیا کے نہیں بلکہ جنت کے مرد ہیں، اور جنت کے ہر مرد کو دنیا کے

سو مردوں کے برابر قوت حاصل ہوگی ۔ اس طرح چالیس کو سو سے ضرب دے کر حساب لگایا گیا کہ حضور میں چار ہزار مردوں کی قوت تھی ۔ یہ سب باتیں خوش عقیدگی پر مبنی ہیں ، اور ایسے لوگوں نے کہی ہیں جو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت سے کمال درجہ متاثر ہو کر آپ کے اندر ایسی تمام فوق البشری طاقتوں کا اعتقاد رکھتے تھے جن کو نیک نیتی کے ساتھ وہ فخر کے قابل سمجھتے تھے ۔ انہی باتوں کو ہمارے زمانہ کے ایک فاضل بزرگ نے ، جن کے علم و فضل اور تقویٰ کا پورا پورا احترام ہمارے دل میں ہے ، اپنے ایک مضمون میں نقل کر دیا ، اور استدلال کی عمارت اس طرح قائم کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ہزار مردوں کی طاقت رکھتے تھے ، اور اس طرح ۱۶ ہزار بیویاں رکھنے کے مستحق تھے ، مگر آپ نے صرف گیارہ بیویوں پر قناعت فرمائی ۔ یہ بات اگرچہ حسن عقیدت کے رنگ میں کہی گئی تھی ، لیکن ایسی بات خواہ کسی کے قلم سے اور کسی نیت سے نکلے ، بہر حال ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اللہ کے نبی کی قوتِ باہ کا حساب لگانا مذاقِ سلیم پر بھی بار ہے ، کجا کہ اس کو دشمنانِ اسلام اور مشککین اور مذبذبین کے مقابلہ میں حجت کے طور پر لایا جائے اور ان کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کنہیا جی اور ہندو دیوتاؤں کے رنگ میں پیش کر کے یہ امید کی جائے کہ اس قسم کی باتوں سے ان کے دلوں میں نورِ ایمان پیدا ہوگا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازواج پر مخالفین کے اعتراضات کی تردید بہت سے قوی دلائل سے ہو سکتی تھی ۔ ان سب کو چھوڑ کر یہ طرزِ استدلال یقیناً افسوس ناک ہے ، خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ علماء کے دشمن ذرا ذرا سی لغزشوں پر بات کا بتنگڑ بناتے ہیں اور علماء سے گذر کر خود علوم دینی پر حملے کرنے لگتے ہیں ۔

(ترجمان القرآن ۔ ذی القعدہ ۱۳۵۴ھ ۔ فروری ۱۹۳۶ء)